اے حمید

بارش میں جدائی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

(۱)

چونکہ ہماری اس کہانی کا تعلق لاہور شہر کی ایک خاص آبادی، اور ایک مخصوص طبقے سے ہے۔ لہذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے آپ کا تعارف اس شہر کی دوسری آبادیوں اور وہاں کے رہنے والوں سے کروا دیا جائے۔ اس طرح سے آپ کی جان پہچان ہی کا حلقہ وسیع نہیں ہو گا۔ بلکہ ہماری کہانی والی آبادی کی شخصیت کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد بھی ملے گی۔ ہم رسمی تعارف سے گریز کرتے ہوئے اس شہر کا تذکرہ اخبار والوں کے ساتھ روائتی انداز میں نہیں کریں گے۔ جو کہ عام طور پر ساتھ ہی ساتھ گلی محلوں سڑکوں اور تفریح گاہوں کی تصویریں بھی چھاپ دیا کرتے ہیں۔ بلکہ ہم تو ایک تجربہ کار عجائب گھر کے گائیڈ کی طرح آپ کو بہت کچھ دکھاتے ہوئے آپ سے بہت کچھ چھپا بھی جائیں گے۔ کیونکہ ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ ایک شئے کی ہلکی سی جھلک دکھا کر آپ کو تجسس اور جستجو کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ جیسے کوئی ریلوے گارڈ سیٹی اور ہری جھنڈی دینے کی بجائے کہیں چھپ جائے اور انجن ڈرائیور اسے پلیٹ فارم پر ڈھونڈھتا پھرے۔

ویسے تو یہ شہر اتنا پرانا ہے کہ ابھی تک اس کی کھدائی ہو رہی ہے لیکن ہمیں اس کے تاریخی پس منظر اور شجرۂ نسب سے فی الحال کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر پرانے قلعے والے ٹیلے کی دسویں یا گیارھویں تہہ سے قطب الدین ایبک کے وقتوں کا کوئی سکہ برآمد ہوتا ہے۔ تو ہزار بار ہوا کرے۔ ہمیں تو اس پرنالے سے زیادہ دلچسپی ہے جو قطب الدین ایبک کے مزار کے پہلو میں گرتا ہے اس شہر میں ایسے پرنالوں کی کمی نہیں جو گزرنے والوں کے سروں پر گرتے ہیں۔ یہ نکڑا دونوں قسم کے پرنالوں کی تصویر کے ساتھ کسی ہفتہ وار رسالے یا اخبار میں چھپ جائے تو خوب رہے تھوڑی دیر کے لئے اس پرنالے میں سے ہو کر اوپر غسل خانے میں جائیے تو سامنے ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ والا پانی گرم کرنے کا حمام پڑا ہے۔ جو پرانے صندوق کے ٹین سے بنا ہے طاق میں پرانی وضع کے نمازیوں کی موٹی سی سفید مسواک پڑی ہے۔ دیوار میں ٹھکی ہوئی کیل پر زنانہ پھولدار قمیض ٹنگی ہے۔

مسلسل پانی گرنے سے چوکھٹ کی لکڑی پھول گئی ہے اور دروازہ بند نہیں ہوتا۔

چنانچہ کنڈی کے ساتھ ستلی باندھ دی گئی ہے۔ جو نہانے سے پہلے پٹ بند کر کے چوکھٹ والے کیل کے گرد لپیٹ دی جاتی ہے۔ نل کی ٹونٹی سے لگی ہوئی کترن سیدھی حمام کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ کترن گہرے بادامی رنگ کی ہو کر بالکل گل چکی ہے ہاتھ لگانے سے گیلا آٹا معلوم ہوتی ہے۔ دیواروں کی چکنائی اور فرش کی سِل پر جمے ہوئے زنگ کی وجہ سے اندر چوبیس گھنٹے ایسی بو پھیلی رہتی ہے۔ جیسی عام طور پر جاڑوں میں حجاموں کے گرم حماموں سے آیا کرتی ہے۔ ہمارا خیال ہے ہمیں اس غسل خانے سے باہر نکل آنا چاہیے۔ مگر ابھی تو ہمیں فیصل شہر کے اندر والے لاہور چلنا ہے جہاں کے غسل خانوں میں پیشاب کی بدبو مستقل رہتی ہے۔ کہیں ہم زیادہ حقیقت پسندی سے تو کام نہیں لے رہے؟ لیکن صاحب کیا کیا جائے۔ آج کل زمانہ ہی حقیقت پسندی کا ہے۔ اس کا تو کچھ ایسا فیشن چل نکلا ہے کہ جب تک بال کی کھال نہ اتاری جائے کسی کے کچھ پلے ہی نہیں پڑتا۔ ایبک روڈ یا انار کلی والے مکانوں کے غسل خانوں میں تو خیر سورج پھر بھی دن میں گھڑی بھر کے لئے جھانک لیتا ہے۔ لیکن شہر کے اندر والوں میں سارا دن بیمار سے بجلی کے بلب زنگ آلود کالی کالی چکنی دیواروں پر گندی روشنی ڈالا کرتے ہیں۔ ان بتیوں کو اور ان کی پرانی طرز کی اندر سے کھوکھلی پیتل کی بریکٹوں کو مکھیوں نے بے حد غلیظ کر رکھا ہے۔ گلی در گلی کھمے پٹے، دیمک خوردہ، پرانے، جھکے ہوئے چھجوں اور سیل زدہ اندھیری کوٹھڑیوں والے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تو کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ کسی تنگ و تاریک گلی والے مکان کی ڈیوڑھی میں قدم رکھئے تو ویرانوں کی ہولناک اداسی پرانے مقبروں کی خاموشی اور بڑی کھوکھلی حسرتناک اور پراسرار سی افسردگی آپ پر طاری ہو جائے گی۔ ابھی آپ کو یوں محسوس ہو گا جیسے ابھی ابھی اس ڈیوڑھی میں کسی مردے کو غسل دیا گیا ہے۔ پھر اچانک یوں لگے گا۔ جیسے کونے میں چھپے ہوئے کسی مردے نے اس ٹھنڈے نم اندھیرے میں کسی عورت کا منہ چوم لیا ہو۔ ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پرانے مکانوں کے اندھیرے میں ہم پر شہوت اور دہشت کا حملہ بیک وقت ہوتا ہے۔ شاید یہ ہمارے مشینی دور کا نتیجہ ہے۔ جس نے ہمارے ہر جذبے کو اس کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا کر کے زندگی کو جوئے کا مال بنا دیا ہے جسے ہم دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔ ہر گلی میں مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پانی کے نل گٹھوں کی صورت میں بندھے چلے گئے ہیں۔ جس طرح دیہاتی لوگ گنے

باندھ کر انہیں یکّوں پر لاد کر شہر لایا کرتے ہیں۔ کسی مکان کی ڈیوڑھی کا پٹ کھلا ہو تو اندر سے بڑی ٹھنڈی اور عجیب و غریب بُو والی ہوا آ رہی ہو گی۔ اس بُو کی ایک اپنی الگ حیثیت ہے۔ جس طرح بہت سے رنگوں کو ملا دیا جائے تو ایک اپنی قسم کا انوکھا رنگ نمودار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بُو ہزاروں قسم کی بوؤں کے باہمی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ آپ کو یہ بُو شہر کے اندر والے گلی کوچوں، مکانوں اندھیری کوٹھڑیوں، وہاں کے رہنے والوں، ان کے کپڑوں، ان کی باتوں اور ان کے چلنے پھرنے کے انداز تک میں ملے گی۔ یہاں جو نئی قسم کے سیمنٹ سے بنے ہوئے اونچے لمبے خوش وضع مکان ہیں۔ اس حیرت انگیز بُو نے انہیں بھی نہیں چھوڑا۔ اگر شہر کے اس بوسیدہ، نم آلود، اور غلیظ علاقے میں خوشبودار پاؤڈر اور عطریات کا استعمال نہ ہو تو یہ بُو وبائی مرض کا بہروپ لے کر شہر کی دوسری آبادیوں پر بھی حملہ کر دے۔ یہاں گھروں کی گندگی عام طور پر نالیوں میں بہائی جاتی ہے۔ اور یہ نالیاں خاص طور پر گلیوں میں بہتی ہیں۔ جو گلیاں اونچی نیچی اور ڈھلوان ہیں۔ وہاں سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔ جہاں جہاں پرنالوں کے دہانوں پر پیپل یا بڑ کے درخت کی شاخیں نکل آئی ہیں وہاں دیوار میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ کہیں سیمنٹ کی پچی کاری کروالی گئی ہے۔ اور کہیں چڑیاں پر پھڑپھڑاتی اپنی چونچوں سے ان دراڑوں میں سے چونا کریدا کرتی ہیں۔ برسات میں جب چھاجوں پانی برستا ہے تو ان ڈھلانی گلیوں میں اگر پانی کھڑا نہیں ہوتا تو کوئی شریف آدمی بھی کھڑا نہیں ہو سکتا کیا خبر کب کسی مکان کی مٹی دھڑام سے آن گرے۔ بعض منزل در منزل کبوتروں کی کابکوں کی طرح بھنچے ہوئے ایک طرف کو جھکے ہوئے تنگ و تاریک مکانوں کی چھتوں کو لکڑی کے بڑے بڑے کھمبے دے کر سنبھالا دیا گیا ہے۔ ان مکانوں کی اندھیری کوٹھڑیوں میں جائیے تو لکڑی کے دیمک خوردہ شہتیروں سے بچنے کے لئے آپ کو اپنا سر جھکانا پڑے گا۔

بھنگنیں لوہے کی کڑاہیاں اٹھائے آپ کو سارا دن گلیوں میں ادھر سے ادھر جاتی ملیں گی۔ یوں گمان ہوتا ہے جیسے یہاں کے ہر مکان کی گندگی دوسرے مکان سے ہو کر گزرتی ہے۔ کارپوریشن کی ڈسپنسریاں گلی کوچوں کی دکانوں میں کھولی گئی ہیں جہاں مٹیالے زنگ کے ادھیڑ عمر منشی اور کمپوڈر میلے کچیلے کپڑے پہنے پتلی پتلی ٹانگوں والی بیمار بھنگنوں میں پسی ہوئی اسپرو کی پڑیاں تقسیم کیا کرتے ہیں یا بہت ہوا تو کسی کے پھولے ہوئے مسوڑے پر

ٹنکچر میں بھگوئی ہوئی روئی کا پھاہا لگا دیا۔ ان دکان نما دفتروں کے کھٹملوں سے بھرے ہوئے بنچوں پر بیٹھ کر سوکھے ساکھے ریٹائر ہو چکے صفائی کے داروغے ستایا کرتے ہیں۔ نئے داروغے بالوں میں تیل لگا کر کرسی باہر ڈلوا کر بیٹھ جاتے ہیں اور برابر کا پان گال میں دبا کر چھڑی سے اپنی ٹانگ بجاتے رہتے ہیں۔ اگر آپ میکلوڈ روڈ یا سمن آباد والی چوڑی چکلی نسبتاً ہموار سڑکوں پر چلنے کے عادی ہیں تو آپ ان بینگی ٹیڑھی، اونچی نیچی، اکھڑے ہوئے فرش والی اور جگہ جگہ سے مکانوں کی نالیوں سے کٹی پھٹی گلیوں میں چلتے ہوئے اپنی چال برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ آپ اس آرام اور بے تکلفی سے نہ گزر سکیں گے جس طرح ایک آدمی پالتو بکرے کی زنجیر تھامے یا کوئی گجری سر پر تانبے کا فٹ بھر لمبا گلاس رکھے آپ کے قریب سے گزر جائے گی۔ پھر یوں ہوگا کہ اچانک کسی کھڑکی کی چق اٹھا کر ایک پیلا سا نسوانی چہرہ بے تعلق سی افسردہ دلچسپی سے آپ کو دیکھے گا اور دور تک دیکھتا چلا جائے گا۔ جیسے چھ سات بچوں کا باپ اپنی دکان پر بیٹھا ایک پل کے لئے نظر اٹھا کر بازار میں گزرتی ہوئی بارات کو دیکھتا ہے۔ جس طرح دھوپ روشنی اور تازہ ہوا کے بغیر پھول کمھلا جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح شہر کے ان پُر پیچ محلوں میں رہنے والی لڑکیوں عورتوں اور بچوں کے رنگ اکثر زرد دکھائی دیں گے۔ ان کی ہڈیوں کے جوڑ نرم ہوں گے۔ اور بیماری اور وبا کا حملہ ان پر بڑی آسانی سے ہوگا۔ ان کی مثال ایک ایسے پھولدار گملے کی ہے جو پچھلی کوٹھڑی میں پرانے صندوقوں کے پاس پڑا صابن اور شوربے کی چکنائی ملے پانی پر پرورش پا رہا ہو۔ یہ ایک بڑی افسوسناک اور فکر طلب بات ہے کہ کئی زرخیز کھیت محض دھوپ، روشنی اور تازہ آب و ہوا کے نہ مل سکنے سے بنجر ہو رہے ہیں اس کی وجہ تو بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ دوسری وجہ غربت اور تیسری وجہ اپنے جدی مکانوں سے بڑے بوڑھوں کی دیوانوں ایسی محبت ہے۔ نئی پود کے پڑھے لکھے لڑکے جب اپنی نوبیاہتا بیویوں کو لے کر ان ڈربوں سے باہر کھلی ہواؤں میں نکلنے کے لئے پر تولتے ہیں تو ان کے بزرگ زخمی کبوتروں کی طرح در و دیوار سے ٹکریں مارتے واویلا مچانے لگتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی مٹی خراب ہو انہوں ان تڑخی ہوئی کالی کڑیوں والی چھتوں تلے ایک عمر گزاری ہے۔ وہ انہیں کیسے چھوڑ دیں؟ ان مکانوں کی بنیادوں میں ان کے اجداد کا خون ہے۔ وہ انہیں کیسے بیچ دیں؟ نوجوان دولہا اپنے باپ کی آہ بکا سے متاثر ہو جاتا ہے۔ وہ عہد کر لیتا ہے۔ کہ باپ کے جیتے جی اس گندگی کے پٹارے سے باہر

نہیں نکلے گا۔ رات کو نئی روشنی کی بیوی جس کی سمن آباد اور گلبرگ میں سہیلیاں ہیں روٹھ جاتی ہے اور خاوند جلدی سے جلیبیاں لینے بھاٹی، موچی یا چوک نواب صاحب کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ اور یوں معاملہ کئی سالوں کے لئے کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ جو نئے کنبے اپنے باہر والے نئے مکانوں میں کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے ہیں۔ ان کی ایک ٹانگ ابھی تک ان گلی محلوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ان گلی کوچوں کی تمام خصوصیات لیتے گئے ہیں۔ جس طرح مکڑی کے جال سے بچ کر نکلی ہوئی مکھی اپنے ساتھ تھوڑا بہت جالا ضرور لے جاتی ہے۔ اونچی نیچی، ٹیڑھی بینگی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے بعض سال خوردہ دروازوں کے پٹ کھلے ہوں گے اور اندر والے اندھیرے کمروں سے دیمک کی نمدار بُو آ رہی ہوگی۔ جن پرانے مکانوں کی بنیادیں سکھ عہد حکومت یا مغل سلطنت کے آخری اور زوال پذیر دور میں رکھی گئی تھیں ان کے قلعہ نما دروازوں پر پیتل کے چمکدار نمائشی کیل لگے ہیں اور چھوٹی اینٹ کی بھدی دیوار محرابی کھڑکیوں کو لئے آسمان تک چلی گئی ہے۔ لکڑی دار لمبوترے روشندان گرجائی طرز کے ہیں اور اُن میں مختلف قطع کے مربّع نما اور تکونی رنگدار شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ دن میں ایک بار جب تھوڑی دیر کے لئے ان پر دھوپ آتی ہے تو کمرہ کئی رنگوں کی روشنیوں سے بھر جاتا ہے اب تو اس وضع کے شیشے یہاں بالکل ناپید ہیں اور اس قسم کے جن مکانوں کے روشندانوں پر دھوپ نہیں آتی وہ رات کو اندر بتی جلنے سے گلی میں کھڑے ہو کر بڑے بھلے لگتے ہیں۔ یہ گلیاں گرمیوں میں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اور سردیوں میں صرف رات کو دوسرے علاقوں کے نسبت ذرا گرم ہوتی ہیں بس اتنی کہ آدمی یہاں آ کر اپنے دستانے اتار کر جیب میں ڈال سکتا ہے۔ یہاں مکانوں کی دوسری منزلیں سردیوں میں آرام دہ ہوتی ہیں اور پہلی منزلوں میں اس قدر سیلن ہوتی ہے کہ سردیوں میں آپ پر کپکپی طاری ہو جائے گی۔ بجلی کے تار مکانوں کی کھڑکیوں کے قریب سے ہو کر گزرتے ہیں اور ان تاروں پر آپ کو پتنگ اڑانے کی ڈور کے گچھے، گلے مڑے چیتھڑے اور کٹی ہوئی پتنگوں کے ڈھانچے ہر طرف دکھائی دیں گے۔ تقریباً ہر گھر غیر ضروری اور بوجھل سامان سے ٹھسا ٹھس بھرا پڑا ہے۔ باورچی خانوں میں گشت کرنے والے چوہے موٹے اور بڑے نڈر سے ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر بالکل نہیں چونکتے۔ تانبے کے پرانے مٹ، دونوں طرف سے بنی ہوئی صابن دانیوں والے بڑے بڑے حمام بیاہ شادیوں پر چھوہارے قتلے اور خرمے لے جانے والی

بڑی بڑی گول سینیاں، چھوٹے پاؤں اور اونچی کمر والی شیشہ لگی پرانی کرسیاں، دیواروں کے
ساتھ ساتھ لگی ہوئی پرانی لکڑی کی پرچھتیاں اور ان پر چمکتی ہوئی تانبے کی گلاسوں اور تھالیوں کی
قطاریں میلاد کی محفلوں میں درود پڑھنے والوں پر گلاب چھڑکنے والی گلاب دانیں ، عقبی
کوٹھڑیوں میں دادی اماں کے جہیز کا پرانا گرد بھرا سامان اور اس کے ایک طرف کو جھکے ہوئے
دروازے پر اوپر کی طرف پڑا ہوا چوڑی دار چابی والا پھولا ہوا دیسی تالا کسی نہ کسی طاق میں جلتا ہوا
مٹی کا دیا، کیونکہ وہاں اس کے مکان کا بزرگ رہتا ہے۔ یہاں ہر دوسرے مکان کی ڈیوڑھی ،
سیڑھیوں یا پچھلی کوٹھڑی میں ایک "بزرگ" ضرور رہتا ہے جہاں گھر کی بڑی بوڑھیاں رات
کو دیا جلانا اور جمعرات کو پھول چڑھانا کبھی نہیں بھولتیں۔ اگر اتفاق سے کسی مکان میں کوئی
اندھا کنواں ہے تو پھر اس "بزرگ" کا ٹھکانہ اس کنویں میں ہوگا۔ یہ "بزرگ" کبھی کبھی کسی
کنواری لڑکی یا بیوہ عورت کے سر پر بھی سوار ہو جاتا ہے۔ پھر منگلوار کو وہ عورت گھر میں
میراثنیں بلا کر چوکی دیتی ہے اور اگربتیوں کی بڑی تیز خوشبو اور ڈھول ڈھمکوں کے شور میں
بال کھول کر حال کھیلتی ہے۔ اور پاس پڑوس کی عورتوں کو ان کے معاشی مسائل، گھریلو
جھگڑوں اور بیماریوں کا حل بتاتی ہے۔ اس قسم کی محفلوں کو مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔ اور
ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ یہاں ایسے کئی ایک قصے مشہور ہیں کہ ایک نئی روشنی کے
آدمی نے حال کھیلنے والی عورت کا مذاق اڑایا اور دوسرے دن وہ مکان کی چھت سے گلی میں
آن گرا اچانک اس کی زبان بند ہو گئی اور اگلے روز وہ مر گیا۔

یہاں گھروں میں اپنے مرشدوں کو بلا کر ان کی خاطر داری کرنے کا بھی بڑا رواج ہے۔
پیر صاحب کے قدموں میں بیٹھی ہوئی ضعیف الاعتقاد عورتیں فرط عقیدت سے سر نہیں
اٹھاتیں۔ ان سے جوان لڑکیوں کو پردہ نہیں کرایا جاتا۔ ہم ایک ایسی جوان مگر بد صورت لڑکی
کو جانتے ہیں۔ جس کے ماں باپ نے پیر صاحب سے اس کی روحانی شادی کروا رکھی تھی۔
لڑکی دن رات پیر صاحب کے پہلو میں جانماز پر بیٹھ کر رات کو وظیفہ کرتی اور پر پھر وہیں پیر
صاحب کے زانو پر سر رکھ کر سو جاتی۔ اسے کئی ایک وظیفے اور نعتیں ازبر تھیں۔ فلمی گیت
سن کر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ اس کے سبزی مائل سیاہ چہرے، ہر وقت کے خشک
ہونٹوں اور ڈوبی ڈوبی سی آنکھوں میں بڑی اداس مظلومیت اور مکروہ قسم کی بے بسی سدا جھلکتی
رہتی۔ اس لڑکی کے لئے اس پھل کی تشبیہہ بڑی موزوں ہوگی جو پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر

لگے ہی بھوکے پرندوں کا شکار ہو جائے۔ تعویز گنڈوں اور جادو ٹونے کا بھی یہاں خوب بول بالا
ہے۔ ویسے بیماروں کو پانی عرق اور دودھ میں گھول کر تعویز پلائے جاتے ہیں۔ بچوں کے
گلے اور بازو پر تعویز بندھے ہوئے ضرور ملیں گے۔ رشتہ داروں میں لڑائی ہوتی ہے تو ایک
دوسرے کی سیڑھیوں میں تعویز دبوانے کے جتن کئے جاتے ہیں۔ یہ خدمت عام طور پر ایسی
بوڑھی عورتیں سرانجام دیتی ہیں۔ جو دونوں گھروں میں بڑی مقبول ہوتی ہیں۔ جرّاحوں کی
بھی شہر کی چار دیواری میں چاندی کٹتی ہے۔ بعض پڑھے لکھے آدمی بھی خطرناک پھوڑوں کے
علاج کے لئے جرّاحوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑ پہلوانوں سے بٹھائے
جاتے ہیں۔ جنسی عوارض کے لئے گندی مندی بوتلوں والے جاہل حکیموں کے دروازے
کھٹکھٹائے جاتے ہیں۔ کسی کنواری لڑکی کی چھاتی پر پھوڑا ہے تو اس کی ماں اسے ساتھ لے کر
جراح کی طرف چل پڑے گی۔ بڑے بوڑھوں میں روایتی مذہب پرستی اور رشتہ داریوں کے
رکھ رکھاؤ کا پنچائتی رجحان بہت زیادہ ہے۔ بیاہ شادیوں میں عام طور پر جی کھول کر روپیہ خرچ
کیا جاتا ہے اور خوب دعوتیں اڑتی ہیں۔ کسی بی بی کو اس کا خاوند گھر سے نکال باہر کرے تو
پوری برادری سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک دوسرے کی مخالفت میں بھی یہ لوگ اسی اخلاص
اور گہرے جذبے سے کام لیتے ہیں۔ شادی یا لڑکے کی پیدائش پر دی جانے والی منہ سلامی کی
رقم کا پورا حساب رکھا جاتا ہے۔ کھوٹا کھرا عین موقع پر سب کے سامنے پرکھ لیا جاتا ہے۔ اس
سخت گیر کاروباری ذہنیت کا اظہار ایسے موقعوں پر خوب ہوتا ہے۔ بھائی کی شادی پر اگر نند
کو جوڑا نہیں ملا تو سسرال میں دلہن کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ وہ روتی ہے پیٹتی ہے قرض لیتی
ہے۔ زیور رہن رکھتی ہے۔ مگر نند کے لئے جوڑا ضرور بنواتی ہے۔ سالہا سال کی ہمسائیگی نے
بڑی اپنائیت پیدا کر دی ہے۔ خوشی اور غمی دونوں موقعوں پر پڑوس کی بوڑھی عورتیں
پردھان بنی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گھر میں اندر ہی اندر حسد اور بغض کی چشمکیں
بھی جاری رہتی ہیں۔ اتنا پیسہ کہاں سے آ رہا ہے؟ چھوٹی لڑکی کی شادی کہاں ہو رہی ہے؟
بڑی شادی شدہ لڑکی گھر میں کیوں آن بیٹھی ہے؟ بڑے لڑکے کی بیوی اپنے میکے کیوں چلی
گئی ہے؟ چھوٹا لڑکا اپنی بیوی کو کیوں پیٹ رہا ہے؟ غبن کے مقدمے کا کیا بنا؟ غرضیکہ
انہیں ہر بات کی پوری پوری خبر رہتی ہے۔ عورتیں ہمدرد بن کر منہ اٹھا کر گھر میں داخل
ہوں گی اور (آپ لاکھ بچائیں) گھڑی بھر میں آپ کا سارا راز جھولی میں سمیٹ کر لے جائیں

گیں۔ پھر وہ جب تک دوسرے دس بیس گھروں میں آپ کی باتیں پہنچائیں گی نہیں انہیں چین نہیں آئے گا۔ جس طرح پان کے ساتھ ڈھیر سارا تمبا کو کھانے والا آدمی جب تک اچھی طرح تھوک نہ لے آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ خوش وضع لڑکے بالوں کی بناوٹ اور کپڑوں کی تراش میں مال میکلوڈ والے فیشن کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ باقاعدہ پروگرام بنا کر ٹولی کی شکل میں سینما دیکھنے اور شہر کی جدید ترین سڑکوں والے چائے خانوں میں کیک اڑانے جاتے ہیں اور فٹ پاتھ پر جانے والی ہر لڑکی پر ایک آدھ فقرہ ضرور کستے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک عام اوسط کا اندرون شہر رہنے والا خوش وضع لڑکا جب اکیلا مال پر چل رہا ہو گا تو کبرٹا جھینپو ہو گا۔ اس کی چال میں بڑی کاوش سے پیدا کیا گیا بے فکرا پن ہو گا، اور آپ اسے بُلائیں تو تھوڑا سا ضرور چونک پڑے گا۔ یہاں لیکلے آتے ہی ایک طرح کا احساس کمتری اس کے جسم میں حلول کر جائے گا۔ جس کا اظہار اس کے ہاتھ ملانے کے انداز سے لے کر باتیں کرنے اور آنکھیں چرانے کے انداز تک میں پایا جائے گا۔ جن نوجوانوں نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چھوٹی موٹی داڑھیاں رکھ لی ہیں وہ سوائے ضروری کام کے ان جدید علاقوں میں نہیں آتے۔ وہ انگریزی طرز کے بال نہیں ترشواتے۔ انہوں نے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے کپڑے کی گول ٹوپیاں اور گھر میں پہننے کے لئے لکڑی کی کھڑائیں بنوا رکھی ہیں۔ یہ لوگ گلی کی مسجد کی مرمت کروانے، معراج شریف کی مجلس کے لئے چندہ جمع کرنے، محلے کی لائبریری میں مذہبی رسالے منگوانے اور مذہب کے مختلف فرقوں پر بحث کرنے میں بڑے پیش پیش ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کے طبقاتی کردار پر بھی آپ اسی طرح روشنی ڈال سکتے ہیں۔ یہاں کی جو لڑکیاں شہر کے بڑے ماڈرن اور خوب صورت کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت مطالعے کے لئے ایک بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ عموماً وہ جس گھر میں رہتی ہیں وہاں کی فضا بڑی، کٹر مذہبی اور روائتی قسم کی ہوتی ہے۔ زیادہ تر انہیں کالج کی تعلیم اس لئے دلوائی جاتی ہے۔ کہ جدید خاوند بی اے سے کم بیوی قبول نہیں کرتا۔ دوسرے آج کل کے فیشن پرست نئی وضع کے خاوندوں میں طلاق کا مرض عام ہے وہ جو پرانے زمانے میں اپنے بزرگوں کے سامنے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر پھر عمر بھر ساتھ نبھانے والی بات ہوتی تھی۔ وہ قریباً ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہر پڑھا لکھا باپ اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے اس کو بی۔ اے کروانے کے بعد (اگر اس میں اتنی استطاعت ہو تو) بی ٹی

ضرور کرواتا ہے۔ جس طرح نام نہاد اونچے طبقے کے لوگوں میں اپنی لڑکیوں کو تھوڑا بہت گھریلو رقص سکھلانے مختلف قسم کے ہلکے پھلکے انگریزی کھانوں کی ترکیبیں ازبر کروانے اور حسب مقدور اسے سوشل بنانے کا رواج ہے۔ موسیقی اور علم وادب کا یہ بے مہر کاروباری استعمال بڑا احمقانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہوئی کہ راگ رنگ کی محفل میں ہر آدمی دیوانہ وار جھوم رہا ہے۔ لیکن سم پر کسی کا سر بھی نہیں ہل رہا۔ ادھر شہر والی لڑکیاں جب پر نالوں سے گندا پانی ٹپکاتی چھتی ہوئی گلیوں میں سے نکل کر تانگوں اور بسوں میں سوار ہو کر شہر سے باہر والے کھلے اور درختوں پھولوں سے بھرے ہوئے کالج میں آتی ہیں اور کاروں میں بیٹھ کر آنے والی خوش لباس صحت مند لڑکیوں کو دیکھتی ہیں۔ تو بڑے گھرے انتہائی پوشیدہ اور شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ دل ہی دل میں وہ ان امیر لڑکیوں سے نفرت کرنے لگتی ہیں۔ اس نفرت کا اظہار ضدی لڑکیاں ایک ہلکی سی بے اعتنائی سے کرتی ہیں اور کمزور طبع لڑکیاں ان سے گہری دوستی ڈال کر کرتی ہیں۔ بہر حال دونوں قسم کی لڑکیوں کی توجہ اپنے لباس کو جدید اور خوش وضع بنانے کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ گھر اور کالج کے درمیان ایک وسیع خلیج خائل ہو جاتی ہے۔ جسے وہ دن میں دو بار عبور کرتی ہیں۔ شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس طرح زندگی کے دونوں رخ سامنے رہتے ہیں۔ اور خیالات معتدل ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں اس طرح ذہن عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک توازن ترازو کے پلڑوں میں نہیں بلکہ ڈنڈی کے عین بیچ میں ہوتا ہے۔

ان گلیوں میں دن بھر تو پھیری والوں کا اچھا خاصا شور رہتا ہے لیکن رات پڑتے ہی مکانوں کے دروازے اندر سے بند کر دئے جاتے ہیں اور کچھ ایسی خاموشی طاری ہو جاتی ہے جیسے کوئی مریض درد میں افاقہ ہو جانے پر تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے چپ ہو جاتا ہے۔ پھر زندگی کے گندے بستر پر پڑی ہوئی یہ بیمار خاموشی صرف اس وقت کراہتی ہے۔ جب نصف شب کو سینما سے لوٹا ہوا کوئی آدمی دروازے پر دستک دیتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اس گنجان علاقے میں دو ایک نسبتاً کھلی سڑکوں نے بھی اپنے لئے جگہ بنالی ہے۔ جو مکان ان سڑکوں کے کنارے کنارے کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے والے کمروں میں نصف دن تک خوب روشنی اور دھوپ رہتی ہے قدرت ویرانے میں بھی کہیں نہ کہیں ایک آدھ پھول کھلا کر لوگوں کے دلوں میں احساس حُسن زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

(۲)

پرانے لاہور کی چار دیواری سے نکل کر جب ہم دریا والی آبادیوں کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں ایک اچھی خاصی چوڑی چکلی مصروف سڑک کی ڈھلان کے اختتام پر ایک پل کے نیچے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس پل کے اُوپر سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں۔ اس وقت اس کی دیواروں اور آس پاس کے مکانوں پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ بارش ہو تو یہ پل ان تمام جگہوں سے ٹپکنے لگتا ہے۔ جہاں لوہے کے پیچ لگے ہیں۔ یوں تو سردیوں گرمیوں پل پار والی اس آبادی کے بڑے بازار میں گرد و غبار اڑا کرتا ہے۔ مگر جب بھنگی جھاڑو پھیرتے ہیں تو ناک پر رومال رکھے بغیر یہاں سے گزرنا محال ہے پُل کے نیچے سے گزر کر بازار ذرا تنگ ہے۔ جس کے سبب یہاں ہر وقت ٹریفک کا بڑا جمگھٹا رہتا ہے۔ گھوڑا اڑ جائے تو کوچوان نیچے اُتر کر اس کی ٹانگوں میں چابک چلاتا ہے اور لگام کو منہ پر سے پکڑ کر اسے آگے کھینچنے لگتا ہے۔ لاہوری گھوڑے جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہوتے ہیں اور گردن جھکا کر چلتے ہیں جب ایک بار اڑ جائیں تو مشکل ہی سے قدم اٹھاتے ہیں۔ جو چھوٹی سی پکی سڑک چاہ میراں کی طرف پھٹتی ہے۔ اس پر چل پڑیے تو بائیں ہاتھ کو لکڑی کی باڑھ کے اندر احاطے میں کٹے ہوئے درختوں کے تنے ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوں گے۔ بڑ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے درخت کے نیچے لکڑیاں کاٹنے والی دو ایک مشینیں دھڑا دھڑ شہتیر چیر رہی ہوں گی۔ اس وقت لکڑی کا باریک برادہ فضا میں اڑتا رہتا ہے۔ اور راہ گیروں کی آنکھوں میں ضرور پڑ جاتا ہے۔ زیادہ بڑے درختوں کے تنے سڑک کنارے ہی ڈال دیئے جاتے ہیں جنھیں وہیں پڑے پڑے آرہ کش دن بھر آمنے سامنے بیٹھے چیرا کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں مشین پر چڑھانے میں آسانی ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے آپ کو تازہ کٹی ہوئی لکڑی کی گیلی گیلی خوشبو آئے گی (بشرطیکہ آپ کو زکام نہ ہوا ہو) اگر آپ کو کبھی جنگل میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تو آپ کو میکلوڈ روڈ والی کوئی فرنیچر کی دکان ضرور یاد آجائے گی۔ ذرا آگے چلئے تو سڑک سے ذرا ہٹ کر گوالوں نے اینٹ چونے کی لمبی لمبی کھرلیاں بنا رکھی ہیں۔ ایک پمپ لگا ہے جس کی رہٹ ٹوٹ گئی ہے اور وہاں ایک کیل ڈال کر آگے سے موڑ دیا گیا ہے۔ زمین گوبر اور کیچڑ سے دلدل

بنی ہے اور جاڑے میں بھینسیں منہ کھولے ڈکرا رہی ہیں۔ سامنے سڑک کے ساتھ ملی اندر تک گئی ہوئی دکانوں میں لوہار بھٹی سے دہکتا ہوا لوہا نکال کر کوٹ رہا ہے۔ یہاں گھوڑوں کے نعل اور تانگوں کے پائیدان بنتے ہیں۔ باہر اوپلوں کی آگ میں لوہے کا رنگ گرم کیا رہا ہے۔ جب وہ بالکل سرخ ہوجائے گا تو اسے تانگے کے پہیئے پر چڑھا دیا جائے گا۔ یہاں تازہ ہوا بھی ہے۔ (ایسی ہوا جو سیدھی دریا والے ذخیروں سے چلی آرہی ہے) گوبر کی بدُبو بھی ہے اور اُپلوں کا کڑوا دھواں بھی۔ مناسب یہی ہے کہ ہم یہاں سے واپس ہو کر مصری شاہ والی سڑک پر آجائیں۔ اس سڑک پر چارہ کاٹنے والی ایک بجلی کی مشین لگی ہے۔ جس دن سوکھا چارہ کٹ رہا ہوتا ہے۔ دکان میں سے گرد کے بادل نکل نکل کر راہ چلتوں اور آس پاس رہنے والوں کی خبر لیتے ہیں۔

پشم کو مشین سے خوب دبا کر گٹھے بنانے والے کارخانے کی ڈیوڑھی میں میلی کچیلی عورتیں اون کے ڈھیروں کے ارد گرد بیٹھی ہاتھ سے ریشے الگ الگ کرتی رہتی ہیں اور کھانستی رہتی ہیں۔ شادی بیاہ اور دعوتوں کا سامان کرایہ پر دینے والوں کی دکانیں ہیں جہاں دیواروں پر تانبے کے جگ لٹکے رہتے ہیں۔ جب کوئی گاڑی پل پر سے گزرتی ہے تو ہیبتناک انجن کی گڑگڑاہٹ سے

یہ جگ دیواروں سے بج اٹھتے ہیں۔ دو ایک ہوٹل نما تنور ہیں۔ جہاں چار پائیوں پر بیٹھ کر کوچوان اور گاڑیبان روٹی کھایا کرتے ہیں۔ ایک میلی چیکٹ ملیشئے کی قمیض والا لونڈا زنگ لگے مٹی کے بڑے مٹکے میں ہاتھ ڈال کر ٹین کا گلاس پانی سے بھرتا ہے اور گاہک کو پکڑا دیتا ہے۔ چوک میں تانگوں کا اڈہ ہے۔ جہاں کھڑے دو ایک طرحدار پشاوری تانگے والے آپ سے ایک روپے سے کم پر بات ہی نہیں کریں گے۔ اب گندے نالے کی طرف ہولیں تو سڑک کشادہ ہوجاتی ہے۔ یہاں پر دو ایک ڈاکٹروں کی دکانیں ہیں جہاں صبح و شام مریضوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اونچے لمبے آئینوں والی صاف ستھری پان سگریٹ کی دکانیں ہیں۔ جن پر ریڈیو پوری آواز کے ساتھ کھلے رہتے ہیں۔ چیچپی گندی میزوں والے چائے خانے ہیں جہاں فی کوپ یا کیتلی کے حساب سے بہت زیادہ میٹھے والی چائے بکتی ہے۔ گندا نالہ جس کے پل پر آزو بازو ریل کی پٹریاں لگی ہیں مغلپورہ ورکشاپ سے دریائے راوی کی طرف بہنے لگتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے لئے سیلاب کی یہ سب سے بڑی نشانی ہے۔ جونہی نالے کا پانی ذرا سُست ہو کر ورکشاپ کی طرف منہ پھیرتا ہے کنارے کنارے کھڑے اسے جھک کر دیکھتے

ہوئے لوگ "سلاب آ گیا" کا نعرہ بلند کر کے اپنے اپنے گھروں کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اور تانگوں یکوں اور ریڑھوں پر سامان لادنا شروع کر دیتے ہیں۔ نالے کی ڈھلوانی دیواریں اینٹوں سے چُنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں مشینوں کا تیل ملا گندہ سیاہ پانی بہتا ہے۔ ورکشاپ سے یہ صرف میلا کچیلا تیل ملا پانی لے کر نکلتا ہے۔ جونہی آبادیوں میں آتا ہے اس میں گھروں کی گندگی شامل ہونے لگتی ہے۔ یہاں بھی ہوشیار پور کے گوالوں نے باڑوں میں کالی بھینسوں کو باندھ رکھا ہے۔ ہر طرف گوبر کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں۔ گیلے گیلے اُوپلے مکانوں کی عقبی دیواروں پر اوپر تک چڑھ گئے ہیں۔ دائیں ہاتھ کو ایک ڈیڑھ مرد اونچی کچی دیوار ہے۔ جو اندر والے کھیتوں کو جانوروں اور آدمیوں سے بچاتی ہے۔ سیلاب کے دنوں میں یہ دیوار ٹوٹ جایا کرتی ہے۔

کوئی پچاس ایک سال ہوئے کہ لوگوں نے یہاں مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں یا بعض دیگر وجوہات کی بنا پر پنجاب کے دوسرے شہروں سے لاہور میں مستقل طور پر چلے آئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کے سبب انہیں آمدورفت کی بھی سہولت نظر آئی۔ زمین بھی انہیں سَستی مل گئی۔ کارپوریشن سے نقشہ پاس کروایا۔ اور چھ سات ہزار میں ایک منزلہ وسیع دلان اور ایک پمپ والا مکان کھڑا کر دیا۔ نالیاں ابھی نہیں بنی تھیں۔ چنانچہ ہر مکان کے باہر گندے پانی کے لئے ایک حوضی بنانا ضروری ہو گیا جسے دوسرے تیسرے کارپوریشن کا بھنگی صاف کر جایا کرتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب لاہور میں جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی تو دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی آبادی بڑھنے لگی شہر کے متمول لوگوں نے یہاں دھڑا دھڑ مکان بنوا کر کرائے پر اٹھوا دیئے۔ پاکستان بننے کے بعد تو یہ رجحان زیادہ شدید ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فاروق گنج کی آبادی بادامی باغ کے کارخانوں میں جا گھسی اور مصری شاہ وسن پورہ اور تاجپورہ کی آبادیاں چاہ میراں کی خبر لانے لگیں۔ شاد باغ کی سکیم منظور ہوئی، تو اس علاقے کے شمال میں رات کو خوب صورت پختہ کوٹھیوں میں بجلی کی روشنیاں جگمگانے لگیں۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر سڑکوں گلیوں اور نالیوں کی تعمیر کا پورا انتظام نہ ہو سکا۔ حوضیوں کا گندا پانی ہر گھر کے سامنے پھیل جاتا۔ بارش ہوتی تو مکان کے سامنے گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جاتا۔ بارش ایک روز ہوتی اور کیچڑ کئی کئی روز تک خشک نہ ہوتا۔ گرمیوں میں دن کو حبس اور رات کو مچھروں نے بُرا حال کر دیا۔ سڑک پر رات کو ایک بلب بھی روشن نہ ہوتا۔ لوگ آبادی میں

داخل ہوتے ہی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے۔ پھر بھی جب کوئی شخص حوضی میں گر جاتا تو اس کا باہر نکلنا محال ہو جاتا۔ کئی بچے حوضیوں میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ایک دفعہ وسن پورہ کے چوک میں رات کو برات آ رہی تھی۔ دلہن کی گلی میں داخل ہوتے ہی دولہا کی ایک جوان بہن جس نے بڑے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے۔ دھڑام سے حوضی میں جا گری۔ بڑی مشکل سے اسے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ لڑکی نے رُو رُو کر بُرا حال کر لیا۔

یہ دس پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ اب حالات کافی بدل گئے ہیں۔ ان آبادیوں میں گلیاں اگرچہ زیادہ تر پختہ نہیں ہوئیں لیکن مکانوں کے ساتھ ساتھ پختہ نالیاں ضرور بنادی گئی ہیں۔ جس طرح اٹلی میں ہر سڑک روم کی طرف جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں کی ہر گندی نالی گندے نالے کی طرف جاتی ہے۔ سڑکوں پر رات کو بتیاں جلتی ہیں۔ سرکاری بسیں شاد باغ تک چلتی ہیں۔ لڑکوں لڑکیوں کے بہت سے سکول کھل گئے ہیں۔ عام طور اس علاقے کو سیلابی علاقہ کہا جاتا ہے۔ مگر تین چار سالوں سے سیلاب نہ آنے کے باعث یہاں آبادی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ منہ اندھیرے یہاں گوالوں کے باڑوں میں لوگ دودھ لینے پہنچ جاتے ہیں۔ سنا ہے یہاں گوالے دودھ میں پانی نہیں ملاتے مگر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ملک میں کسی شہر کی بستی میں آبادی بڑھے اور چیزوں میں ملاوٹ شروع نہ ہو۔ یہاں کی چند ایک مسجدیں کشادہ اور خوب صورت ہیں اور ان کے ستونوں پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ علاقہ کھلا ہونے کی وجہ سے یہاں سردیوں میں بہت سردی ہوتی ہے۔ اور گرمیوں میں اتنی گرمی کہ آپ دوپہر کو چھتری کے بغیر وسن پورہ سے شاد باغ تک نہیں جا سکتے۔ دن بھر گرم لُو چلتی ہے۔ لوگوں کے رنگ عام طور پر اس موسم میں سانولے ہو جاتے ہیں۔ مصری شاہ کی گنجان آبادی تو اس سانولے پن سے بچ جاتی ہے۔ مگر وسن پورہ اور شاد باغ جہاں گلیاں کشادہ اور بازار کھلے کھلے ہیں۔ لُو کی زد سے بالکل نہیں بچتے۔ گرمیوں میں یہاں کے دیوان خانے آگ برسا رہے ہوتے ہیں۔ یہاں دن کی روشنی جلدی نمودار ہو جاتی ہے۔ اور شام دیر تک چھائی رہتی ہے۔ سردیوں کی صبحوں کو کھیتوں کی طرف سے آیا ہوا کُہرا گلیوں اور مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوتا ہے۔ شام کو ہر طرف دھواں پھیل جاتا ہے۔ آسمان سیاہ دکھائی دیتا ہے۔ اور کھیت کنارے کی کچی زمین بالکل کالی پڑ جاتی ہے۔ پھر ہر رات کو جب اُوس پڑنے لگتی ہے، تو آسمان صاف ہو جاتا ہے اور یہاں وہاں دور دور پکے سیمنٹ کے مکانوں میں جلتی ہوئی بتیاں بڑی بھلی لگتی ہیں۔

ویسے تو لاہور کی دوسری آبادیاں بھی ہیں۔ مثلاً گلبرگ------ جہاں اگر آپ کے پاس کار نہیں تو آپ بیکار ہیں۔ لیکن کار حاصل کرنے سے پہلے آپ کے پاس کوئی بڑا اہم عہدہ ہونا چاہیئے جس کی مدد سے آپ ہزاروں روپے کی رشوتیں لے سکیں۔ یا آپ ڈاکڑ ہوں اور یا سمگلروں سے آپ کی دوستی ہو تاکہ آپ کپڑے سے بھرا ہوا بیس ہزار کا ٹرک یہاں ساٹھ ہزار میں بیچ سکیں اگر یہ نہیں تو پھر کسی طرح لاکھ سوا لاکھ کا کوئی لائسنس حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ اسے فروخت کر کے آپ آرام سے یہاں ایک کوٹھی بنوا سکیں۔ یا پھر سیدھے سبھاؤ آپ کی شہر میں کوئی بہت بڑی دکان ہو جہاں آپ چھوٹی سے چھوٹی چیز مثلاً اپنے ضمیر سے لے کر بڑی سے بڑی شئے مثلاً موٹروں کے ٹائر تک کی بلیک کر سکیں۔ اور سب سے آخر میں آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے باپ کے فرزند ہوں جو ابھی لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کے مرا ہو۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ گلبرگ میں وہ سنجیدگی متانت اور ذہنی گہرائی نہیں جو لارنس روڈ، کالج روڈ یا فیروز پور روڈ کی بعض پُرانی کوٹھیوں میں ہے۔ گلبرگ والی کوٹھیوں پر تو ایک ایسے آدمی کا گمان ہوتا ہے جس کی اچانک لاٹری نکل آئی ہو اور سینما ہال کی سب سے اعلیٰ کلاس میں بیٹھا فلم دیکھتے ہوئے ایکڑسوں پر آوازیں کس رہا ہو۔ یا خواہی نخواہی ہر بات پر ہاتھ پھیلا پھیلا کر سونے کی قیمتی انگوٹھی دکھا رہا ہو۔ آپ جس کوٹھی کو دیکھے آپ کو پہلی ہی نظر میں محسوس ہوگا۔ کہ اندر والے کمروں کے لئے مخصوص زیبائش اور زینت باہر آگئی ہے۔ جیسے کوئی بیوقوف نَوَدولیتا اپنے حریفوں کو جلانے کے لئے قمیض کے اُوپر ریشمی بنیان پہن کر باہر نکل آئے۔ یہاں کے بیل بُوٹوں میں بھی یہی ٹھوس اور مشینی قسم کی ذہنیت کارفرما ہے۔ ان کی ہر جمعرات کو کانٹ تَراش ہوتی ہے۔ جس طرح دفتر جانے والے ہر مہینے حجامت کرانا نہیں بھولتے۔ کیا مجال جو کسی بیل کی ٹہنی کھڑکی پر جھک آئے۔ دیواروں پر ایسے چھچھورے اور بھڑکیلے رنگ پھیرے ہیں کہ آنکھیں دُکھنے لگیں۔ دُھوپ میں تپتے ہوئے پکّے فرش برآمدوں تک چلے گئے ہیں۔ ہر کوٹھی پر بے حسی، بے تعلقی، سرد مہری اور سنگدلی کا خول چڑھا ہے۔ ایسے میزبان کی طرح جو مہمان کو دور سے آتا دیکھ کر مکان کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔ ہم یہاں لاہور کی ماڈرن آبادی کے ان باسیوں کا ذکر نہیں کریں گے جو پُرانی خاندانی وضع داری اور نمائش پسندی سے اجتناب کے ساتھ ساتھ احساسِ جمال کے جذبے کو ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ایک سنہری مچھلی سارے پانی کو سنہری نہیں کر سکتی۔

سمن آباد کی طرف آئیے تو یہاں ایک طرح کا دفتری رکھ رکھاؤ چاروں طرف ملے گا۔ لوگوں میں بھی اور مکانوں میں بھی۔ کواٹر قطار در قطار چلے گئے ہیں۔ جیسے کسی بڑے دفتر کے باہر سائیکل ساتھ ساتھ رکھے ہوں۔ زیادہ تر مکانات ٹھیکے پر بنے ہیں۔ ٹھیکیداروں نے جی کھول کر گھٹیا سے گھٹیا مسالہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ بارش میں چھتیں ٹپکتی ہیں۔ اور روشندانوں سے پانی اندر آتا ہے۔ دیواریں چونا وغیرہ گرا کر ننگی ہو گئی ہیں۔ جنہوں نے کواٹر خرید لئے ہیں۔ انہوں نے مرمت کے بعد مکانوں کو سجا دیا ہے۔ اس کے باوجود دفتری وضعداری والی بات ہر جگہ موجود ہے۔ ایسے لگتا ہے۔ جیسے آپ کسی سے ملیں گے تو وہ ہنس کر آپ سے ہاتھ ملائے گا۔ آپ کی ہر بات پر مُسکرا مُسکرا اٹھے گا۔ آپ کو کچھ دیر اور بیٹھنے کے لئے کہے گا۔ اور جب آپ چلے جائیں گے تو کلمۂ شکر ادا کر کے بناوٹی مسکراہٹ کا نقاب اُتار کر میز کی دراز میں رکھ دے گا اور دفتری فائیل کی ورق گردانی میں مشغول ہو جائے گا۔ ______ ماڈل ٹاؤن ایک ایسے ویرانے کا نقش پیش کرتا ہے۔ جہاں کبھی میلہ لگا ہو۔ لیکن اب سوائے دکانوں کی ٹوٹی پھوٹی بھٹیوں، اوندھے پڑے شکستہ بنچوں مسلی ہوئی خالی ڈبیوں، پھٹے ہوئے غباروں اور بکھرے ہوئے باسی پھولوں کے اور کچھ نہ ہو، ایسے لگتا ہے جیسے یہاں ہر شخص باغ اجاڑنے، دیواریں گندی کرنے اور سڑکیں توڑنے کے کام میں لگا ہوا ہے۔ وہ چلتا ہے، تو سڑک کے پتھر باہر نکل آتے ہیں۔ بیٹھتا ہے تو گھاس سوکھ جاتی ہے۔ یہ لوگ ان کوٹھیوں کو اس طرح استعمال کر رہے ہیں جس طرح فلمی گانے سننے کے شوقین رات کی رات مانگے تانگے گراموفون ریکارڈوں کو استعمال کرتا ہے۔ یہاں ہم پھر ان ننھی مُنی سنہری مچھلیوں کو نظر انداز کر رہے ہیں جو ہر گندے تالاب میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی ہیں۔

______ ایک زمانہ تھا کہ مسلمان پُل اور چاہ بنایا کرتے تھے۔ آجکل وہ صرف کوٹھیاں اور مسجدیں بناتے ہیں۔ اس قوم کی آن بان بھی نرالی ہے۔ فلسطینیوں پر ظلم ٹوٹے تو یہ لوگ چندے جمع کرتے ہیں۔ ایران میں زلزلہ آئے تو انہیں کمبل روانہ کرتے ہیں لیکن میکلوڈ روڈ کے فٹ پاتھ پر کوئی ٹی بی کا مریض دم توڑ دے تو اپنی کار ایک پل کے لئے بھی کھڑی نہیں کرتے۔ مگر اس قوم نے وسن پورہ میں جو مکان کھڑے کئے ہیں۔ ان میں کوٹھیوں ایسی بات ہو نہ ہو مسجدوں ایسا سکون

ضرور ہے۔ ویسے تو گھر کا سکون وہاں کے رہنے والوں کے کردار اور فہم کے رّدِ عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات چہرے مہرے کے سکون و اطمینان کی بھی ہوتی ہے۔ جیسے سمندر کنارے کی پتھریلی دیوار۔ جس کی دوسری جانب شوریدہ سر موجیں ٹکرا رہی ہوتی ہیں اور اس طرف پتھر کی دراڑوں میں اُگے ہوئے گھاس پر ہرا ٹمڈا آرام سے بیٹھا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے اس آبادی کے مکانوں کی شخصیت میں بھی یکسانی اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ مکان کی کھڑکیاں کھیت میں کھلتی ہوں یا گلی میں ان میں لوہے کی سلاخیں لگا کر اوپر باریک جالی ضرور لگا دی جائے گی۔ سامنے کی طرف دو تین کمرے اور عقب میں ایک دالان ہوتا ہے جہاں عام طور پر نیم کا پیڑ اُگا ہوتا ہے۔ دالان میں ایک طرف غسلخانہ ہوگا اور دوسری طرف باورچی خانہ۔ بیچ والی دیوار جو دوسرے مکان کے صحن کو الگ کرتی ہے۔ کہیں کہیں بیل سے ڈھکی ہوئی ملے گی۔ سردیوں میں اس بیل کے پتے پیلے ہو کر جھڑ جاتے ہیں اور مُڑی تڑی خشک ڈنڈیاں رسیوں کے گچھے کی مانند دیوار سے لٹکی رہتی ہیں۔ صحن میں کہیں کہیں پھولدار گملے بھی دیکھنے میں آجائیں گے۔ دالانوں میں آرپار کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ یہاں وہ لاہور کے مخصوص دروازے نہیں ملیں گے جن کی بناوٹ اور زیبائش میں شہرِ پناہ کے پرانے دروازوں والی شان ہوتی ہے، ویسے مکانوں کے اندر دیوان خانوں میں شیشے دار الماریاں ضرور ہوتی ہیں۔ جن میں چینی کا چائے کا ساماں بند ہوتا ہے۔ سورج کی روشنی اور تازہ ہوا ہر گھر میں بلا کھٹکے داخل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرح کی -----------تازگی اور شگفتگی کا احساس ہر لمحہ رہتا ہے۔ عموماً دروازوں اور کھڑکیوں پر سبز روغن پھیرا جاتا ہے۔ جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ یہاں بہت کم ایسے گھر ہیں جہاں سیل ہو۔ اگر سیلاب آجائے تو یہ سیلن سال بھر تک نہیں جاتی پھر یہاں ایک انتہائی ناخوشگوار بدبُو چوبیس گھنٹے پھیلی رہتی ہے۔ یہ آبادی آہستہ آہستہ باہر والے کھیتوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہر کھیت میں ایک نہ ایک مکان کھڑا ہے۔ اس آدمی کی طرح جو دھوپ لینے کیلئے کرسی نکال کر گلی میں آن بیٹھے۔ نئے مکانوں کے اس بڑھتے ہوئے سلسلے پر اس بِلی کی مثال صادق آتی ہے جو پِٹھے سکیڑے اپنے شکار کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہی ہو۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جب اس فصیلِ شہر سے باہر کی آبادیوں کو دیکھتے ہیں تو میں لاہور کی پرانی چاردیواری میں سے مکانوں کی ٹولیاں سی نکل کر کھیتوں اور درختوں کے جھنڈوں کی سمت جاتی معلوم ہوتی ہیں۔ پھر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی

قیدی بندی خانے کی سلاخوں سے دونوں ہاتھ باہر نکالے درخت کی پھلدار شاخ کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نمزدہ سیلی کوٹھڑیوں سے نکل کر روشنی اور کُھلی ہوا میں جانے کی یہ تمنا انسان کی سرشت میں ہے۔ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ تو نانبائی بھی تنور کے پاس بیٹھا سکھ کا سانس لیتا ہے۔

یہاں نچلے متوسط طبقہ کے کاروباری اور نوکر پیشہ لوگ آباد ہیں ہیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس طبقہ کے لوگوں میں گھریلو ذمہ داری، کنبہ پروری اور رہن سہن کی آسائش کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں نوکر رکھنے کا رواج بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ سارا کام گھر میں رہنے والے اپنے آپ کرتے ہیں۔ مرد صبح صبح گوالوں سے جا کر دودھ لاتے ہیں۔ عورتیں گھروں کی صفائی کرتی ہیں اور کھڑکیوں کے پھولدار پردے اور پھندنے والی ڈوریاں بناتی ہیں۔ یہ لوگ نشست گاہوں کی زیبائش، لباس کی سفید پوشی اور گھریلو رکھ رکھاؤ پر تو جان دیتے ہیں۔ اگر بہن پتلون استری کر رہی ہے تو بھائی دھوتی پہن کر بیٹھا رہے گا۔ مگر پاجامہ پہن کر کالج نہیں جائے گا۔ باپ کو عدالت میں یا محکمہ بحالیات کے دفتر میں کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو وہ بیٹے کا انتظار کرے گا۔ تاکہ اس کا سوٹ پہن کر گھر سے نکل سکے۔ اس طبقے کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں اپنے لئے اوپر والے طبقے کی نقل ضرور اتارے گا۔ مثلاً اس آبادی میں کالج کے لونڈوں نے اب شب خوابی کے لباس اور بستر سے اٹھ کر پہننے والے گون بھی بنوائے ہیں۔ بعض جگہ نہار کلیجے پلنگ پر چائے کی پیالی منگوائی جاتی ہے۔ جب سے ان لوگوں میں دوسروں کی دیکھا دیکھی جہیز میں ڈائننگ ٹیبل دینے کا مرض پڑ گیا ہے۔ اکثر گھروں میں اب میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج بھی چل نکلا ہے۔ خواہ دال ہی کیوں نہ پکی ہو اسے باقاعدہ میز پر بیٹھ کر رکابیوں میں ڈال کر تقسیم کیا جائے گا۔ آٹھویں دسویں پاس لڑکیاں اپنے عزیزوں کے نومولود بچوں کو جو سوئیٹر اور اونی ٹوپیاں بُن کر دیتی ہیں وہ بالکل انگریزی وضع کی ہوتی ہیں اور انہیں دیکھ کر لندن سے شائع ہونے والے امور خانہ داری کے رسالے یاد آجاتے ہیں۔ نشست گاہوں کی انگیٹھیوں کو بڑی کاوش سے سجایا جاتا ہے۔ میز جلنے پر والی بتیوں کے گرد پوشوں پر ریشمی جھالر لگائی جاتی ہے۔ کونے میں میز رکھی ہے۔ جس پر گجرات کا پھولدان پڑا ہے۔ کچھ چیزیں اس طبقے میں ایسی پائی جاتی ہیں جو اوپر والے طبقے میں فیشن کے طور پر استعمال کی جاتی

ہیں۔ مثلاً روٹیاں رکھنے کی جو چنگیریں یہاں باورچی خانوں میں پڑی ہوں گی۔ وہ کوٹھیوں کے دیوان خانوں میں دیواروں پر سجی ہوں گی۔ جس سماوار میں یہاں دن رات چائے پکتی ہے۔ جب یہ سماوار گلبرگ پہنچتا ہے تو اسے منٹل پیس پر اس کلچر کا نشان بنا کر رکھ دیا جاتا ہے جس سے ان لوگوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور یوں جس کلچر کے صحیح حقیقی اور تابناک رنگ ہمیں اپنے پورے عروج پر نچلے متوسط طبقے میں ملتے ہیں اوپر والے طبقے میں اس کا صرف ایک ہلکا سا نشان ہی ملتا ہے جو محض نمائشی اور دکھاوے کا ہوتا ہے۔ جس طرح عجائب گھر کی الماریوں میں تاریخی نوادر رکھے ہوں جن کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بعض چیزیں ایسی ہیں۔ جو اوپر والے طبقے میں بالکل ہی ناپید ہیں۔ مثال کے طور پر کڑھائی کی چادریں اور میز پوش۔ آپ کسی کوٹھی میں چلے جائیے۔ آپ کو ایک ہی طرح کی ریشمی یا سوتی بستر کی چادریں ملیں گی۔ جن میں ایک ٹھنڈی اور روکھی پھیکی یکسانیت ہوگی۔ لیکن جس طبقے کی ہم کہانی بیان کرنے والے ہیں وہاں تو ہر گھر میں چادروں اور تکیے کے غلافوں کی کڑھائی میں وہاں کی خوش مذاق لڑکی کا ایک اپنا انفرادی رنگ اور اپنی شخصیت نمایاں ہوگی۔ ان لوگوں کو علم ہی نہیں کہ بے خبری میں ان کی انگلیاں وقت کے تکلے پر ایسا سات رنگا سوت بن رہی ہیں جس کا کپڑا کبھی عجائب گھر کی الماریوں میں رکھا جائے گا۔ اور جسے دیکھنے لوگ دور دور سے آیا کریں گے۔ کیا یہ مضحکہ خیز حقیقت نہیں کہ یہ لوگ اپنے انمول موتی دے کر اوپر والے طبقے کے کھوٹے سکے خرید رہے ہیں؟ جس طرح کشمیر کے دیہاتوں میں دیہاتی عورتیں مکار بنئے کو زعفران دے کر نمک لیتی ہیں۔

لڑکیاں اپنی بھاوجوں کے ساتھ مل کر صبح ہی صبح کمروں کی خوب جھاڑ پھونک کرتی ہیں۔ گلدان میں گملے سے دو چار پھول بھی توڑ کر سجا دیئے جاتے ہیں۔ ہر گھر کی طرح یہاں کے گھروں میں بھی ایک دوسرے سے بیزاری اور لڑائی جھگڑے کا لمحہ آجاتا ہے۔ لیکن اگر انسان کے کردار میں اس کے ماحول کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے تو یہاں کی فضا کا کھلا پن اور ہوائیں ان کے مزاجوں کو ٹھنڈا اور معتدل کرنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ جو لوگ بالکل ہی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی کسی سے پیچھے کیوں رہیں۔ ان پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے زیر ذکر طبقے کے لوگوں کی حسب المقدور نقالی کریں۔ چنانچہ کارخانے کے مستریوں اور دوسری چھوٹی موٹی مزدوری کرنیوالوں کے گھروں میں بھی انگیٹھیوں پر اخبار کے کاغذ بچھا کر اوپر تانبے کے

گلاس چن دیئے جاتے ہیں۔ کسی نہ کسی ایکٹریس کی فریم کی ہوئی تصویر بھی دیوار پر ٹنگی مل جائے گی۔ ان گھروں کی عورتیں متوسط طبقے کی لڑکیوں کو بہت جلد سہیلیاں بنا لیتی ہیں اور پھر ان کے سوئیٹروں اور قمیضوں کے نمونوں پر اپنے سوئیٹر بنتی اور قمیضیں بنواتی ہیں۔ اس علاقے میں زیادہ تر دکانیں منیاری والوں پنساریوں اور پان سگریٹ بیچنے والوں کی ہیں۔ ویسے لانڈری والے اور درزی بھی کم یاب نہیں۔ لیکن ان کے کام میں وہ سلیقہ اور جدت نہیں جو انار کلی والوں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں کی فیشن ایبل لڑکیاں تو اپنے کپڑے انار کلی والوں سے ہی بنواتی ہیں۔ اب تو جب سے شاد باغ میں کاروں والوں نے اپنی کوٹھیاں بنوالی ہیں ان لڑکیوں کی پہنچ مال روڈ کے فیشن ایبل درزیوں تک ہو گئی ہے۔ یہاں کے دکانداروں کے مال میں عمدگی اور سلیقہ عنقا ہے یہاں آپ کو وہ رسدار پان نہیں ملے گا۔ جو انار کلی میں عام ملتا ہے۔ یہاں کے حلوائی کا دہی ہر حالت میں کھٹا اور پتلا ہوگا۔ یہ لوگ عموماً اپنے پیشے بدلتے رہتے ہیں جو آدمی آج سائیکلوں کا کام کر رہا ہے اگلے سال اس نے منیاری کی دکان لگالی ہوگی۔ کام کی مسلسل لگن اور پیشے سے وابستگی ابھی ان کے نصیب میں نہیں جو تجربہ سالہا سال کی محنت زیر کی اور اپنے کام سے پوری طرح وفادار رہنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہاں کے دکاندار ابھی اس سے کوسوں دور ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے ابھی انہیں کئی سال لگیں گے۔ ہاں یہاں سبزی ضرور تازہ بتازہ مل جاتی ہے اور مولیوں پر تو کھیت کی مٹی بھی لگی ہوتی ہے۔

گندے مندے بگڑے دل کمزور ٹانگوں والے بدصورت بچوں کی یہاں بھی کمی نہیں جنہیں ان کی مائیں شام کو گلیوں میں شور مچانے اور دروازوں کھڑکیوں پر روڑے مارنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتی ہیں۔ کیا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی پانچ دس سال کے لئے ان پلوں کی پیدائش پر پابندی نہیں لگا سکتی جن کی طوعاً و کرہاً ہم بحیثیت انسان عزت کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں؟

رات کو ریلوے اسٹیشن کی طرف سے شنٹ کرتے انجنوں کی چھک چھک یہاں صاف سنائی دیتی ہے۔ جاڑے کی گہری خاموش راتوں میں یہ آواز بڑی صاف ہوجاتی ہے۔ ریلوے لائن کے آس پاس رہنے والے لوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ کراچی ایکسپریس کب آتی ہے اور تیز گام کب پہنچتی ہے۔ ایک اور بات ہے گرمیوں بلکہ شروع گرمیوں میں

جب پیڑ پودوں پر پھول آتے ہیں تو یہاں رات کے کسی لمحے ہوا کے ساتھ پھول پتوں کی مہک بھی چلی آئے گی اور برسات کے دنوں میں تو کوئل کی کوک بار بار سنائی دیتی ہے۔ سردیوں کی صبحوں کو ٹھٹھرے ہوئے نیلے ہونٹوں والی لڑکیوں سے بھری ہوئی بسیں اسکولوں کی طرف چل پڑتی ہیں۔ دور دور کی بستیوں کے مزدور روٹی کے ڈبے ہاتھ میں پکڑے کھیتوں کھیت بادامی باغ والے کارخانوں کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ کارخانے رات دن چلا کرتے ہیں۔ اس طرف سے دن بھر لوہا کوٹنے کی آوازیں آیا کرتی ہیں، اور چمنیاں بھونسلا گندھکی دھواں چھوڑتی رہتی ہیں۔ یہاں گلیوں میں راتوں کو بہت جلد خاموشی چھا جاتی ہے اور اگر جاڑے کی کسی رات کو مینہ کا چھینٹا پڑ جائے تو گلیوں میں سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔ پھر باہر گلی کی سردی میں کھڑے ہو کر ذرا ان گرم کمروں کو دیکھئے جن کے روشندانوں میں سے ٹھٹھرتی ہوئی روشنی باہر گلی کے گیلے فرش پر پڑ رہی ہوتی ہے اگر آپ چپ چاپ سر جھکا کر گزر جائیں گے تو اس پُر اسرار گھریلو روشنی کی زرد آنکھ بڑی حسرت ناک تاکید اور پُر ملال اذیت بھرے جذبے کے ساتھ آپ کو پیچھے سے دیکھتی رہے گی۔ ایسی ہی ایک گلی میں وہ گھر ہے۔ جس کی سیدھی سادی عام قسم کی چار دیواری میں ہمارے اس قصے کا المیہ کھیلا گیا۔

(۳)

یہ گھر جس گلی میں واقع ہے اس کا فرش کچا مگر ہموار ہے اور دونوں جانب پختہ نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ کافی کشادہ گلی ہے۔ دو ایک مکانوں کے باہر دھریک کے پھیلے ہوئے پیڑ کھڑے ہیں جن کی ٹہنیاں شرارتی بچوں نے نیچے نیچے سے نوچ کھسوٹ ڈالی ہیں۔ گلی میں کچھ مکانوں کی بنیادیں اٹھا کر انہیں بھلا دیا گیا ہے لوگ کہیں کہیں سے اینٹیں تک اکھاڑ لے گئے ہیں۔ ان تمام مکانوں کی زمین ایک حاجی صاحب کی ملکیت بتائی جاتی ہے جو افریقہ میں چاندی سونے کا کام کرتے ہیں اور عرصہ گیارہ بارہ سال سے لاہور آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان اجڑی ہوئی بنیادوں میں لوگ ادھر ادھر کے مکانوں سے کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں جسے دن بھر موٹی تازی مرغیاں پنجے مار مار کر کریدتی رہتی ہیں۔ ان خالی زمینوں کے عقب میں کھیت ہیں جہاں بھنگیں گندگی پھینکتی ہیں۔ ان کھیتوں سے آگے جا کر ایک چھوٹا سا نالہ بیچوں بیچ بہتا ہے۔ یہ نالہ مغلپورہ ورکشاپ سے آنے والے گندے نالے میں سے کارپوریشن نے نکالا ہے تاکہ مناسب اجرت لے کر شہر کے اس علاقے میں ترکاریوں کے کھیتوں کو گندا پانی سپلائی کیا جائے کیونکہ گندے پانی سے مولیاں، گوبھی، پالک اور دوسری سبزیاں بڑی جلدی اُگ آتی ہیں۔ شہر کی حد سے بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ان کھیتوں سے آگے ناشپاتی اور امرودوں کے باغوں کا سلسلہ ہے جس کے اختتام پر پھر کھیت شروع ہو جاتے ہیں جنہیں کنوئیں کا تازہ اور صاف پانی ملتا ہے۔ بہت آگے جا کر اینٹوں کا ایک بھٹہ ہے۔ رنجیت سنگھ کے ایک جرنیل کی ٹوٹی پھوٹی مڑھی ہے جو آم کے اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس کے بعد پھر ترکاریوں کے کھیت ہیں۔ گلقند بنانے والوں کے لئے گلاب کے سچے پھولوں کے کھیت ہیں اور پھر پتھر ایسی دیسی ناشپاتیوں کے باغ شروع ہو جاتے ہیں۔ جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مادھولال حسین کی خانقاہ اور پھر شالامار باغ تک چلے گئے ہیں۔ چاہ میراں کی اونچی ٹیلے والی آبادی سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹیڑھے میڑھے بد شکل درختوں اور جھاڑیوں والا ایک قبرستان ہے جسے دیکھ کر عبرت ناک ویرانوں کا خیال آجاتا ہے۔ سورج جب لال لال آنکھ اٹھا کر ان بستیوں پر نظر

ڈالتا ہے تو چاہ میراں کی ٹیلے والی اونچی مسجد کے سفید مینار اور گنبد کھرے کی چادر میں یوں چمکنے لگتے ہیں جیسے ان پر آگ لگے مکان کا عکس پڑ رہا ہو۔ بادامی باغ والے کارخانوں کے بھونپو چیخ اٹھتے ہیں اور خاک آلود مزدور گندے کپڑے پہنے خود کار مشینوں کی طرح اس آواز کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ سیر اور کسرت کے شوقین کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑیں لگاتے دکھائی دے جاتے ہیں اب ہم واپس اس گلی میں آتے ہیں جہاں ہمیں ایک مکان میں رہنے والوں کا آپ سے تعارف کروانا ہے۔ یہ مکان دو منزلہ ہے۔ اگلا رخ کھیتوں کی سیدھ ہے۔ اینٹوں پر سیمنٹ کا پلستر کیا گیا ہے۔ دوسری منزل کی بائیں جانب پر نالے کے ساتھ ایک دراڑ پڑ گئی ہے۔ جسے چونے سے بھر دیا گیا ہے۔ مکان کی تمام کھڑکیاں گلی کی طرف کھلتی ہیں۔ پہلی منزل کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگا کر جالی موڑ دی گئی ہے۔ دوسری منزل کی کھڑکیوں پر صرف سلاخیں لگی ہیں اور کتھئی رنگ کے میلے سے پردے گرے ہوئے ہیں۔ صدر دروازے میں داخل ہونے کے لئے تین سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ جن کی اینٹیں گھس گھسا گئی ہیں۔ دروازے پر دستک دینے والوں نے نشان ڈال دیا ہے۔ لیٹر بکس کے پیچھے ایک چڑیا نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔ کھڑکیوں دروازوں پر چار پانچ سال ہوئے سبز روغن پھیرا گیا تھا۔ جو دھوپ اور بارش کی مار کھا کر مٹیالا ہو گیا ہے۔ اور جگہ جگہ سے سوکھ کر جھڑنے لگا ہے۔ عقب میں ایک دالان ہے جس کے پکے فرش کی قریب قریب ساری ٹیپ اکھڑی پڑتی ہے۔ جو دیوار اس دالان کو ساتھ والے مکان کے صحن سے جدا کرتی ہے وہ دہری اینٹ کی ہے۔ اور اس کے اوپر سیمنٹ کا پلستر پھیر کر بوتلوں کے ٹکڑے چن دیئے گئے ہیں۔ ایک طرف غسلخانہ ہے۔ جس میں پمپ بھی لگا ہے اور کارپوریشن کے پانی کا نل بھی۔ دوسری طرف باورچی خانہ ہے جس پر بیری کا بڑا سا درخت جھکا ہوا ہے۔ مارچ میں جب بیری میں پھل آتا ہے تو دن بھر ہرے ہرے طوطے شور مچایا کرتے ہیں۔ مینہ برس چکتا ہے تو بیری کی ٹہنیاں دیر تک ٹپکا کرتی ہیں اور گیلا تنا پانی حذب کرنے سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ باورچی خانے کی دروازے کی جالیوں میں میل پھنسا ہوا ہے اور نیچے والی جالیاں تو کونوں پر سے پھٹ گئی ہیں۔ نچلی منزل میں چار کمرے ہیں۔ دو بڑے سامنے کے رخ پر اور ان کے پیچھے دو چھوٹے کمرے جن میں سے ایک کمرے میں گھر کا پرانا ٹوٹا پھوٹا سامان بھرا پڑا ہے۔ یہ سامان ایسا ہے جو گھس پٹ کر استعمال کے ناقابل ہو چکا ہے لیکن اس قابل ضرور ہے کہ

اسے کوٹھڑی میں بند کر کے تالا لگا دیا جائے۔ اوپر والی منزل میں گلی کے رخ پر صرف دو کمرے ہیں، ان کے عقب میں سیمنٹ والے میلے ستونوں کی ایک گیلری ہے جس کے جنگلے پر جھک کر آپ بیری والے آنگن میں سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں سے دوسرے گھر کے صحن میں بھی نظر پڑتی ہی۔ یہی وجہ ہے کہ گیلری میں عام طور پر عورتیں ہی چارپائی ڈال کر یا آرام کرسی بچھا کر بیٹھتی ہیں۔ مکان کے باہر پیشانی پر سیمنٹ کے ابھرے ہوئے عربی حروف میں "ماشاء اللہ" لکھا ہے جن کا رنگ اڑ چکا ہے اور نیچے سے سیمنٹ نکل کر بھوسلا ہو رہا ہے۔

شیخ فقیر دین نے آج سے ٹھیک بیس برس چھ ماہ پہلے اس دو منزلہ مکان کی بنیاد رکھی تھی۔ ان دنوں اگرچہ زمین بڑی سستی مل جایا کرتی تھی۔ لیکن پیسہ بہت مہنگا تھا اور جب آدمی بڑی سوچ بچار کے بعد پیسہ خرچ کرنے کا عادی ہو، تو کوڑی کی حیثیت اپنے آپ ہی ایک روپے تک جا پہنچتی ہے۔ یہاں نقل مکانی سے پہلے شیخ صاحب اکبری منڈی میں اپنا آبائی کام یعنی چھوٹی موٹی آڑھت کیا کرتے تھے۔ وہیں ایک بوسیدہ گلی میں جس کی نالی درمیان میں بہتی تھی۔ ان کا ایک پھنسا پھنسایا گندا سا اندھیرا اجدی مکان تھا۔ اس مکان کی کوٹھڑیوں سے خالی باردانے اور ہینگ کی ملی جلی بو آیا کرتی۔ مکھیوں کی غلاظت سے لتھڑی سیاہ کڑیوں میں رات کو جھینگر بولا کرتے اور دن کو چھپکلیاں رینگا کرتیں سب سے پچھلی کوٹھڑی میں ایک آہنی سیف زمین میں دفن تھی۔ جس کا ڈھکنا اوپر سے کھلتا تھا۔ شیخ فقیر دین کے والد حاجی احقرالدین نے یہ سیف اپنے ایک اعتباری لوہار سے خاص طور پر بنوائی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنی بیوی کے سونے کے موٹے بھدے پرانی وضع کے زیورات اور آڑھت سے کمائی ہوئی دولت اور سونے کے ایک سو ایک پونڈ رکھے ہوئے تھے۔ اس کوٹھڑی کے آگے والی کوٹھڑی میں حاجی صاحب رات کو سویا کرتے۔ زمین میں گڑھی ہوئی سیف کے پہلو والے طاقچے میں دن رات مٹی کا دیا جلا کرتا۔ کیونکہ حاجی صاحب نے سن رکھا تھا کہ زمین میں گڑھی ہوئی دولت کے سرہانے اگر دیا بتی نہ جلے تو وہ زمین کے اندر ہی اندر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ حج پر جاتے ہوئے اپنی بیوی کو ہزار بار تاکید کر گئے کہ کوٹھڑی والے دیئے کا تیل ختم نہ ہونے پائے۔ تم ہر روز صبح کو سیف کھول کر چیزوں کی تسلی کر لیا کرنا اور دیکھنا کوٹھڑی میں داخل ہونے کے فوراً بعد دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دیا کرنا۔ کوٹھڑی میں لگانے کے لئے

انہوں نے ایک ایسا بھاری بھر کم تالا خریدا جس کے اندر ایک پراسرار کمانی لگی تھی۔ تالا لگا کر اگر اس کمانی کو اندر کی طرف پھیر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ کمانی چھپ جاتی، بلکہ تالا بھی لاکھ چابی ڈالنے سے کبھی نہ کھلتا اس کی ایک چابی انہوں نے بیوی کو دی اور دوسری چابی اپنی صندوق میں محفوظ کر کے ساتھ ہی حج کو لیتے گئے۔ پھر بھی انہیں دوسری چابی کی طرف سے تشویش ہی رہی۔ کعبے کے گرد طواف کرتے ہوئے انہیں کئی بار اس کوٹھڑی کا خیال آیا جس کے اندر ان کی دولت دفن تھی۔ حجرا اسود کو بوسہ دے رہے تھے کہ اپنے زنگ کھائے سیف کا کالا ڈھکنا یاد آگیا۔ بوجھل دل کے ساتھ حجراسود کو بوسہ دیا اور اسی دن بیوی کو خط لکھ کر سیف کی خیریت دریافت کی۔

شیخ فقیر دین ان دنوں نوجوان تھے اور دکان پر اپنے والد کا ہاتھ بٹایا کرتے دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں سب سے بڑا بھائی کویت میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے وہاں دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ باپ کو وہ کچھ نہیں بھیجتا تھا۔ دو تین سالوں کے بعد کبھی کبھار وہ اپنی والدہ سے ملنے چلا آتا اور مہینہ بھر رہ کر پھر واپس چلا جاتا۔ ایک تو حاجی صاحب بڑے بیٹے سے بول کلام نہ کرتے تھے۔ دوسرے اس صاحبزادے کو بھی نئی ہوا لگ چکی تھی اور اکبری منڈی کی گلیوں کی سیلی اندھیری کوٹھڑیوں میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ حاجی صاحب کو اپنی اولاد اور بیوی سے اتنا پیار نہ تھا۔ جتنی محبت انہیں اپنے کام اور سیف میں رکھے ہوئے زیورات، پونڈوں اور چاندی کے روپوں سے بھری ہوئی تھیلیوں سے تھی۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے شیخ فقیر دین کی شادی برادری اور محلے کے چار آدمی بلوا کر نپٹا دی اور یوں ان تمام روپوں کو بچا لیا جو ان کے خیال میں فضول اور دکھاوے کی رسموں پر خرچ ہوتے۔ بلکہ انہوں نے تو بہو کو زیور بھی اپنی بیوی کا ڈالا، جو شادی کے بعد پھر دوبارہ سیف میں محفوظ کر لیا گیا۔ انہیں بیوی بڑی بے زبان ملی تھی۔ وہ ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتی۔ ویسے بھی شیر کا لقمہ وہی بھیڑ بنتی ہے جو گلے میں سب سے کمزور ہو۔ حاجی صاحب آخری عمر کو پہنچے تو ان کے ہاتھوں میں رعشہ طاری ہو گیا اور سر آہستہ آہستہ ہلنے لگ پڑا۔ انہوں نے دکان پر جانا چھوڑ دیا اور تسبیح لے کر سیف والی کوٹھڑی کے باہر چار پائی پر آسن جما لیا۔ اس حالت میں بھی وہ ہر روز رات کو لیمپ کی روشنی میں اپنے بیٹے شیخ فقیر دین سے دن کا پورا پورا حساب لیتے۔ کانپتی ہوئی انگلیاں رقموں کے

ہندسوں پر ٹھہر ٹھہر کر رکھتے اور ساتھ ساتھ منہ سے بول کر انہیں جوڑتے جاتے۔ بیوی کا انتقال ہوا تو حاجی صاحب اس کے زیور نکال کر بیٹھ گئے، اور انہیں سینے سے لگا کر بہت روئے۔

بیوی کی وفات کے ٹھیک سوا تین سال بعد حاجی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گے۔ اب انہوں نے اپنی چار پائی سیف والی کوٹھڑی میں ڈلوالی تھی اور بہت اونچا سننے لگے تھے بصارت بھی قریب قریب جواب دے گئی تھی۔ ایک دن چھوٹا پوتا اکبر دادا کو دلیے کا پیالہ دینے اندر گیا تو ڈر کر باہر بھاگ آیا۔ حاجی صاحب کی ایک ٹانگ چار پائی کی پائنتی میں پھنسی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ سیف کے اوپر یوں پھیلے پڑے تھے گویا اسے آغوش میں لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ سکڑا ہوا سر زمین سے لگا تھا۔ پوپلا منہ کھلا تھا۔ اور کچھ ایسے تکلیف دہ زاویے سے اوندھے گر کر مرے پڑے تھے جیسے کسی نے اوپر سے لات مار کر کمر کی ہڈی توڑ دی ہو۔ کاروبار میں معاملہ فہمی، موقع شناسی، اجناس کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کی دور اندیشی، تجارتی رموز کی راز داری، مال کو سونگھ کر اس کی حیثیت کا صحیح اندازہ کر لینے کی بھر پور صلاحیت، سودے بازی میں ٹھنڈے دل کے ساتھ صبر و استقلال کی بے پناہ قوت، اور روپے کی قدر و منزلت یہ ایسی خوبیاں تھیں جو شیخ فقیر دین کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملی تھیں۔ وہ سودا بازی میں کبھی جلدی نہ کرتا۔ ایک بار سودا کر لیا تو فائدہ ہو یا نقصان اپنے فیصلے پر کبھی نہ پچھتاتا۔ اس کے کردار کی تمام مکاری، چالاکی اور عیاری صرف سودا طے کر لینے تک ہی بروئے کار آتی۔

اس کے بعد وہ مال کھپت ذخیرہ اندوزی اور مناسب بلکہ ڈیڑھ گنے فائدے پر اسے ٹھکانے لگانے کے متعلق سوچنے لگتا۔ کاروبار میں اسے بہت کم نقصان ہوا تھا۔ کیونکہ وہ تو ہر سودے میں نفع نقصان کی بُو پہلے ہی سونگھ لیتا تھا۔ جس طرح جنگل میں ریچھ کی بو پا کر ہرن کان کھڑے کر لیتا ہے۔ دوسرے ہر سودے میں بے دریغ روپیہ لگا دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ پھر بھی جب کبھی اسے ہزار دو ہزار کا گھاٹا پڑ جاتا تو وہ منڈی میں دوسرے تاجروں کے سامنے پھولے ہوئے ناک والا سبز اور سنگین چہرہ لئے چپ بیٹھا رہتا۔ بکری کی کھال کی ٹوپی (جس کے کناروں پر استر نکل آیا تھا) اتار کر خشخشی سر پر ہاتھ پھیرتا۔ ٹوپی دوبارہ سر پر جماتا۔ دونوں ہاتھ کھلے گھیرے والے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی جھولا نما جیبوں میں دے کر گودام کے اندر جاتا، اور کالی مرچ کی بوریوں کے پاس ناک لے جا کر نتھنے پھلانے اور سکیڑنے لگتا۔ یہ عادت اس کی شخصیت میں اس طرح گھر کر چکی تھی کہ وہ ہر نئے ملنے والے کو اس کی بُو

سے پہچاننے کی کوشش کرتا، نقصان کا خیال اس کے دل کی تہہ میں اس طرح بیٹھ جاتا جس طرح نمک کی ڈلی گدلے پانی کے برتن میں اس کے پیندے سے جا کر لگ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ گھلتی رہتی ہے وہ خسارے کی رقم کو یوں پورا کرتا کہ اپنی چھوٹی سی دکان پر خوردہ فروشی میں ہر شئے کا نرخ ایک دھیلہ کے حساب سے بڑھا دیتا۔ گھر پر گھی صابن، کپڑے، بجلی اور ایندھن کے اخراجات میں کمی کر دی جاتی۔ تین ماہ کے لئے بیگمی چاول کی جگہ موٹے چاول کی بوریاں آجاتیں۔ پھر جب تک نقصان کی رقم پوری نہ ہو جاتی وہ دوسرا سودا ہرگز نہ کرتا۔

شیخ فقیر دین وسن پورے والا مکان بالکل نہ بنواتا۔ اگر اس کا بڑا لڑکا اصغر ایک اچھے گھرانے میں شادی کرنے کے بعد اکبری منڈی والے بوسیدہ اور تاریک مکان میں رہنے سے انکار نہ کر دیتا۔ یہ آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ اصغر پہلے تو اپنے باپ کے ساتھ ہی آڑھت کا کام کرتا تھا۔ لیکن جب اس کی شادی انشورنس کے ایک باحیثیت افسر کی بیٹی سے ہو گئی تو سمجھدار سسر نے داماد کو ڈھائی سو روپے ماہوار پر اپنی کمپنی کے دفتر میں خزانچی لگوا لیا۔ اصغر نے جب اپنی نئی روشنی کی بیوی کے کہنے سننے پر اکبری منڈی والے مکان سے نکل کر اپنے سسر کے گھر چلے جانے کی دھمکی دی تو شیخ فقیر دین کی روح کانپ اٹھی۔ کیونکہ اصغر ہر ماہ اپنی ماں کو ڈیڑھ سو روپے مشترکہ خرچ کے حساب میں دیا کرتا تھا۔ وہ اپنے بڑے لڑکے کی جدائی برداشت کر سکتا تھا لیکن سالہا سال کی تجارتی زندگی نے یہ بات اس کے خون میں داخل کر دی تھی۔ کہ روپے کا نقصان کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے سوچا باہر کہیں کرائے پر مکان لے لیا جائے۔ لیکن اس طرح ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم ضائع ہوتی رہے گی۔ تو پھر کیوں نہ وسن پورے کی بستی میں (جو ان دنوں ویران ویران سی ہوا کرتی تھی اور جہاں زمین بھی بہت سستی تھی) ایک اپنا مکان بنوا کر اکبری منڈی والا مکان کرائے پر چڑھا دیا جائے۔؟ اس طرح اپنے مکان پر اٹھی ہوئی رقم ایک دن اکبری منڈی والے مکان کے کرایوں میں ہی پوری ہو جائے گی۔ اس پر مستزاد ایک اور مکان بھی ہاتھ آجائے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اتنی ساری رقم یک مشت کیونکر اور کہاں سے لے کر خرچ کی جائے؟ شیخ فقیر دین پچھلی کوٹھڑی والے سیف کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے مرحوم باپ کی امانت یعنی پونڈوں کی تھیلی اور بیوی کے زیورات کا گول چوبی ڈبہ پڑا تھا۔ وہ رات بھر اس مسئلے پر سوچ بچار کرتا رہا۔ جو ایک انتہائی اہم اور دور رس نتائج پیدا کرنے والا مسئلہ تھا۔ صبح اگرچہ

آنکھوں کے اوپر ماتھے پر تھکن اور شب بیداری کے اثرات تھے۔ لیکن اس کی بے جان پھیکے رنگ والی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے مسئلے کا حل دریافت کر لیا تھا۔ اپنے بیٹے اصغر کو اپنی کوٹھڑی میں بلا کر وہ اس سے ڈیڑھ گھنٹے تک گفتگو کرتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کو منوا لیا کہ وہ نئے مکان میں آدھا پیسہ اپنے سسر سے لگوائے۔

"بیٹا تم سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں۔ کاروبار کا بے حد مندا ہے۔ پھر تجارت کرنے والوں کا پیسہ تو ہمیشہ کاروبار میں لگا رہتا ہے ہم سے زیادہ غریب کون ہو گا کہ اپنا پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رہتا۔ جو تھوڑی بہت ساکھ بنا رکھی ہے۔ اس کے بل پر صرف تمہاری خاطر بینک والوں سے تھوڑا بہت قرض لے لوں گا۔ اور جو رقم قریشی صاحب (اصغر کے سسر) لگائیں گے۔ اسے ہم قسطوں میں ادا کریں گے"۔

چنانچہ یہی ہوا۔ قریشی صاحب کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال تھا۔ انہوں نے کمپنی سے قرض لے کر شیخ فقیر دین کے حوالے کر دیا۔ سن 1939ء کا تھا کہ وسن پورہ میں شیخ فقیر دین کے مکان کی پہلی منزل تیار ہو گئی اور یہ کنبہ اکبری منڈی سے یہاں چلا آیا۔ چار پانچ ماہ بعد جب شیخ صاحب کے ہاں فرخندہ پیدا ہوئی تو مکان کی دوسری منزل بھی تیار ہو چکی تھی۔ جب مکان بالکل مکمل ہو گیا تو ایک رات اچانک اصغر پر اپنڈیکس کے درد کا حملہ ہوا۔ حملہ اس قدر شدید تھا کہ بڑھی ہوئی انتڑی ہسپتال کے راستے میں ہی پھٹ گئی۔ اصغر کی موت نے ادھیڑ عمر کے آڑھتی کی کمر توڑ دی لیکن وسن پورے والے مکان کو دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا کہ بیٹے کی ایک نشانی تو اس کے پاس رہ گئی------

فرخندہ سے بڑی لڑکی بلقیس کی عمر اس وقت بمشکل تین برس تھی اور اصغر سے چھوٹے یعنی اکبر کی عمر 9 برس کی تھی جسے رنگ محل والے سکول سے اٹھوا کر یکی دروازے والے سکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ یہاں اُٹھ آنے کے ٹھیک تین برس بعد خدا نے شیخ فقیر دین کو ایک اور لڑکا عطا کیا۔ جس کا نام انہوں نے اسلم رکھا۔ ان دنوں جبکہ ہماری کہانی شروع ہو رہی ہے۔ اسلم دیال سنگھ کالج میں ایف اے کے دوسرے سال میں ہے۔ بڑے لڑکے اکبر نے بی۔ اے کرنے کے بعد بی کام کیا۔ سٹیٹ بینک کی وساطت سے حساب دانی کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اس کا امتحان پاس کیا' اور ایک بینک میں تین سوا تین سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ دو برس ہوئے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ شادی امرتسر کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی ہے۔ بیوی عذرا خوش شکل اور تندرست ہے۔ جیسی کہ عام طور پر کشمیری لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ چھ ماہ کا چاند سا لڑکا گود میں ہے۔ پانچ سال ہوئے شیخ فقیر دین نے اپنی بڑی لڑکی بلقیس کی شادی اپنی ہی برادری کے ایک آڑھتی کے بیٹے سے کی تھی۔ لیکن لڑکا بدچلن ثابت

ہوا۔ اس نے چھپے چوری ایک طوائف سے بھی شادی رچالی اور راتوں کو وہیں اس کے ہاں رہنے لگا بیوی نے اعتراض کیا تو جیسا کہ ہم لوگوں کی عام عادت ہے خاوند نے بیوی کو زودکوب کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ ہر روز کا جھنجھٹ شادی کے دوسرے ہی سال شروع ہو گیا۔ کبھی لڑکی ادھر آجاتی کبھی وہ لوگ صلح صفائی کے بعد اسے لے جاتے۔ یہ سلسلہ بھی ایک سال تک چلتا رہا۔ اسی بک بک جھک جھک میں بلقیس کے ایک لڑکی پیدا ہو گئی۔ اب بلقیس کی سماجی حیثیت اپنی ساس کی آنکھوں سے بھی گر گئی۔ ادھر خاوند کی رنگ رلیوں میں اضافہ ہو گیا۔ شیخ فقیر دین جھنجھلا اٹھا۔ آخر یہ لوگ اسے اطمینان سے کاروبار کیوں نہیں کرنے دیتے؟ اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ لڑکے والوں نے کہا۔ ہم صرف اس شرط پر طلاق دیں گے کہ ایک رسید پر یہ لکھ دیا جائے کہ حق مہر کی پوری کی پوری رقم وصول کی۔ بڈھے آڑھتی کے نتھنے پھیلے اور پھر سکڑ گئے۔ اس کا سبز چہرہ ایک دم سنگین ہو گیا۔ اس نے بلقیس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی! اگر تجھے میری عزت کا پاس ہے تو یہاں چپکے سے بیٹھی رہ۔ بلقیس نے اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا اور دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔ رات کو بلقیس کی ماں بھی اپنی بد نصیب بیٹی کو ساتھ لگا کر دیر تک روتی رہی۔

بلقیس کی ماں یعنی شیخ فقیر دین کی بیوی بڑی حوصلہ مند اور وضعدار عورت تھی۔ عمر پچاس سے ایک آدھ برس تجاوز کر چکی تھی۔ بڑے لڑکے کی جواں مرگی نے بال بالکل سفید کر دیئے تھے۔ گندمی رنگت کے ڈھلے ہوئے گول چہرے پر ایک غرور آمیز سکوں اور پرانی نواب زادیوں ایسا وقار تھا۔ لیکن مزاج کی نرم اور طبیعت کی بڑی حساس تھی۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں صبر و شکر کر کے بیٹھ رہتی اور کبھی گلہ شکوہ زبان پر نہ لاتی۔ رشتہ داریوں کے تمام لوازمات اور رسموں کو خاوند سے چھپ کر پوری طرح نبھاتی۔ اپنی بہو عذرا یعنی بڑے لڑکے اکبر کی بیوی سے اپنی بچیوں ایسا سلوک کرتی۔ بلقیس کے گھر کے اجڑنے کا اسے اندر ہی اندر گھرا غم تھا۔ مگر وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ خندہ پیشانی سے اذیت کشی کا یہ مذہبی سا میلان اسے اپنی گھریلو تربیت سے ملا تھا۔ (یہ میلان گھر میں آن پڑنے کے بعد بلقیس میں بھی ایک بار پھر ابھرنے لگا تھا) اس عورت نے ایک بڑے ہی کٹر قسم کے دنیادار مصلحت بین اور سخت گیر خاوند کے ساتھ جوانی کے منہ زور اور جذبات انگیز دن گزارے تھے۔ اس طویل اور کٹھن تجربے نے اس کے اندر تقدیر پرستی کا شدید احساس اور کڑے سے وقت میں

بھی ہمت نہ ہارنے کے دم خم پیدا کر دیئے تھے۔ اس پر اس کی طبیعت کی نرمی، رحمدلی اور ایثار کیشی نے آبداری کا کام کیا تھا۔ جس سے لوہا لوہار رہتے ہوئے بھی ایک طرف کو جھک جاتا ہے اور ٹوٹتا نہیں۔ اس کے مزاج میں نفاست پسندی کو بھی بڑا دخل تھا۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے پاکیزہ کپڑے پہنے ہوتی، اور کمروں کی صفائی کا بھی بڑا خیال رکھتی۔ اس نے اپنی اولاد کو ایک لطیف سی بے اعتنائی اور شدید دلبستگی کے ساتھ پالا تھا۔ وہ اپنی اولاد پر جان فدا کرتی تھی لیکن آتے جاتے ان کی بلائیں لینا نہیں جانتی تھی۔ اس کی مثال ایک ایسے پودے سے ملتی جلتی تھی جو اپنی جڑوں میں پانی کو چپکے سے اندر ہی اندر جذب کرتا رہتا ہے۔

شیخ فقیر دین کی عمر اس وقت انسٹھ کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے۔ پھولی ہوئی ناک کے آس پاس جھریوں کی لکیریں جبڑے کی ہڈیوں کی طرف کھنچی چلی گئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی، بے مروت آنکھوں میں ایک حریصانہ چمک سدا جھلکتی ہے۔ میلے میلے ہونٹ حسد کرنے والوں کی طرح بھنچے بھنچے رہتے ہیں۔ چلتے ہوئے نرم ہڈیوں کے لجلجے پسیجے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ ڈھیلے کوٹ کی جیبوں میں رہتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ ہاتھ باہر رہتے ہیں۔ چلنے میں اپنے بازوؤں کے ساتھ بے جان سے ہو کر لٹکے رہتے ہیں۔ جسم بھدا ہو کر کمزور ہو گیا اور ایک طرف کو جھکا جھکا ہوا سا ہے۔ چہرے کا رنگ عام طور پر بھوسلا رہتا ہے۔ شدید سوچ یا گہرے فکر کے لمحوں میں سبزی مائل ہو جاتا ہے۔ جس طرح ناخالص گھی کا سالن ٹھنڈا ہونے کے بعد سبز رنگت اختیار کر جاتا ہے۔ دل کا سخت مگر زبان کا بڑا نرم ہے۔ اس گولی کی طرح جس کے اندر کڑوی دوا بھر کر اوپر میٹھا لگا دیا جاتا ہے۔ لباس میں سادگی پسند ہے مگر اس سادگی میں پیسے کی بچت کا احساس کارفرما ہے۔ خدوخال میں ایک طرح کی سنگدلانہ بے مہری، تاجرانہ بے لطفی اور بے فیضی کا سراغ ملتا ہے۔ وسن پورے سے اکبری منڈی ہمیشہ سواریوں کے تانگے یا بس میں جاتا ہے۔ ہر آدمی سے اس کی مالی اور سماجی حیثیت کے مطابق بات کرنے کا عادی ہے۔ دکان کے ملازموں سے بات کرتے ہوئے اس کی گردن تنی ہو گی۔ لیکن انکم ٹیکس والوں یا مال خریدنے والوں کے آگے تو بالکل بچھ جائے گا۔ فرخندہ کو صرف دو روپے مہینہ جیب خرچ دیتا ہے۔ (ویسے فرخندہ اپنی ماں سے بہت کچھ لے لیتی ہے) مہینے کا سارا سامان گھر میں ڈلوا دیتا ہے۔ اگر کوئی چیز تیس تاریخ سے پہلے ہی ختم ہو جائے تو اتنی میخ نکالتا ہے کہ اس کی بیوی اور لڑکیاں عاجز آ جاتی ہیں۔ عام طور پر اگر کوئی چیز وقت سے پہلے ختم ہو

جائے تو عورتیں اسے پلے سے لے کر ڈال دیتی ہیں۔ اس نے ایک گھر کے خرچ کی خفیہ نوٹ بک بنوا رکھی ہے۔ جس پر وہ پکے سکے کی پنسل سے پائی پائی کا حساب رکھتا ہے۔ گھر میں اگر کسی بچی کو قیمتی لباس میں دیکھ لے تو اسے پیار سے پاس بلا کر سمجھائے گا۔

"بیٹی آدمی کو کفایت شعاری اور سادگی سے کام لینا چاہیئے۔ ایسے بھڑکیلے کپڑوں سے آدمی دوسروں کی نظروں میں آجاتا ہے۔"

گھر میں صرف ایک اخبار منگواتا ہے جسے اپنے ساتھ ہی دکان پر لے جاتا ہے اور وقفے وقفے کے بعد سر جھکائے آنکھیں سکیڑے بڑے انہماک سے اس کا ایک ایک لفظ پڑھتا رہتا ہے۔ نعمت خانے میں رکھا ہوا دودھ اگر بلی پی جائے تو اگلے دن گوالے سے ایک پاؤ دودھ کم منگوایا جاتا ہے۔ رات کو کبھی اکیلا دکان سے روپوں کی تھیلی لے کے نہیں آتا۔ آزاد کشمیر کا ایک لمتڑنگ ملازم ساتھ ہوتا ہے۔ ہر رات گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد صدری کی اندرونی جیب میں ٹھسائی ہوئی تھیلی کو دبا کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ محلے کے بنک میں روپیہ جمع کروانے وہ خود جاتا ہے۔ کیونکہ نوکروں پر اسے بھروسہ نہیں۔ کریانہ رات کو گھر لے آتا جسے ہر ساتویں آٹھویں دن برطی ترازو میں   بیروں کی طرح تول کر سیف میں ڈھیر کر کے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ سیف شیخ فقیر دین کے اپنے کمرے میں ہے۔ جو مکان کی پہلی منزل پر سٹور کے ساتھ لگتا ہے۔ سیف دیوار میں گڑا ہوا ہے جس کا تالہ نمبر ملا کر کھولا جاتا ہے۔ یہ نمبر سوائے شیخ صاحب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ شیخ صاحب کا پلنگ سیف والی دیوار کے ساتھ بچھا ہے۔ یہاں دیواروں پر جگہ جگہ خدا کے مختلف ناموں کے شیشوں میں جڑے ہوئے قطعے اور کیلنڈر لگے ہیں۔ انگیٹھی پر میلے سے سبز جزدان میں لپٹا ہوا پنجسورہ پڑا ہے جسے شیخ صاحب کبھی کبھی رات کو جب انہیں اپنے کاروباری رجسٹروں کے حساب کتاب سے فرصت ملتی ہے تو پڑھ لیا کرتے ہیں۔ وہ صرف صبح کی نماز ادا کرتے ہیں۔ اور وہ بھی مسجد میں جا کر۔ وہاں ہر ایک نمازی سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کا حال احوال پوچھتے ہیں کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مسجد میں جمع ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کی خبر گیری کی جائے۔ لیکن جب کبھی کوئی شخص اپنی بپتا سنا کر ان سے کچھ قرض مانگ بیٹھتا ہے تو شیخ صاحب گہری سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ بڈھا آڑھتی دو ایک بار نتھنے پھلا کر سکیڑتا ہے اور پھر آنکھیں سکڑ کر اس غرض مند شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے۔

"تمہارا علاج پیسہ نہیں بلکہ کام ہے۔ پیسہ مانگنے سے انسان کی آبرو جاتی رہتی ہے۔ تم کسی دوسرے شہر جا کر کوئی کام دھندا تلاش کیوں نہیں کر لیتے؟"

اگر کبھی آپ وسن پورے میں اس میلے میلے خالص دنیادار اور زر پرست آڑھتی کو سواریوں کے تانگے میں جاتے یا پیدل ہی گندے نالے کا پل عبور کرتے دیکھ لیں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ اس شخص کا مختلف بنکوں میں پچاس ہزار کے قریب جمع ہے۔ سیف میں پونڈوں کی تھیلی اور کریانوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ اور شاد باغ میں تین مکان اسی اسی روپے ماہوار کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی کبھی نہیں ہوتا کہ یہ شخص زندگی میں کبھی جوان بھی رہا ہو گا۔ ایسے لگتا ہے گویا یہ شروع دن سے ہی ایسا بے ڈول، ادھڑا ادھڑا سا، لجلجا، بوڑھا، اور بے رنگ سا ہے۔ ہم یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ شیخ فقیر دین اگر کہیں روپیہ خرچ کرتا ہے تو صرف مکان بنوانے پر۔ شاد باغ میں وہ تین مکان بنوا چکا ہے۔ اور چوتھے مکان کے لئے اس نے نقشہ پاس کروانے ٹرسٹ کے دفتر میں بھجوا دیا ہے۔ وسن پورے والے اپنے مکان کی اس نے اپنے مرحوم لڑکے کے سسر کو ساری قسطیں ادا کر دی ہیں۔ قسطوں کی رقوم میں سے مکان کی وقتاً فوقتاً مرمت پر اٹھنے والے اخراجات کا نصف وضع کر لیا جاتا تھا۔ شیخ فقیر دین کا عام لباس گاڑھے کی قمیض، میلی سی شلوار، تڑے مڑے چمڑے کا بغیر تسموں والا جوتا۔ چار سال پہلے اس نے ایک کشمیری لوئی کٹوا کر اپنے لئے ایک ڈھیلا ڈھالا لمبی جیبوں والا کوٹ بنوایا تھا۔ یہ کوٹ ابھی تک جوں کا توں چلا آ رہا تھا۔ اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کئی برس تک اور چلے گا۔ جب سردی زیادہ پڑنے لگتی ہے تو بھورے رنگ کا ایک فوجی کمبل اوپر لے لیتا ہے۔ ایسے حلئے وہ بالکل ایک بوری لگتا ہے جس میں ہینگ بھری ہو۔ اس کے کمرے سے جو بو آیا کرتی ہے اس میں ہینگ، کالی مرچ، ہلدی اور پرانی باسمتی کی بوئیں ملی ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ شیخ صاحب محلے کی مسجد اور محلہ کمیٹی کو ہر ماہ پانچ روپے چندہ دیتے لیکن فقیر کو کبھی ایک پائی بھی نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ رشتہ داروں کے ہاں بھی کبھی نہیں گئے کیونکہ اس طرح رشتہ دار ٹولیاں بنا کر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور ان کی خاطر مدارت پر فضول پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن بیوی برادری والوں کے میل ملاپ میں پوری وضعداری اور روایت پرستی سے کام لیتی ہے۔ اس طرح جو پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں اپنے خاوند سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی بلکہ اپنی جیب سے ادا کرتی ہے۔

۴

نشست گاہ میں جو صوفے رکھے تھے ان پر نیلی چھینٹ کا پھولدار کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ سلاخوں والی جالی دار کھڑکیوں پر اسی کپڑے کے پردے پھندنوں والی رنگدار ڈوری میں پرو کر لگا دیئے گئے تھے۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے چوکور مربعوں والی دری بچھی تھی جس کے وسط میں قالین کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ جو اس قدر گھس چکا تھا کہ اب اس کے رنگ بھی ٹھیک سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ یہ قالین شیخ فقیر دین کے والد حاجی احقر الدین کو اس کے بڑے بیٹے نے کسی زمانے میں کویت سے بھیجا تھا۔ کھونٹیوں پر کچھ مردانہ کپڑے ٹنگے رہتے تھے۔ آتشدان کا کارنس بھی صوفے ہی کے رنگ کے کپڑے سے ڈھکا تھا۔ جہاں ایک جانب تو شیشے کا نیلے رنگ کا لمبوترا گلدان تھا اور دوسرے کنارے پر منقش بہاول پوری گلاس دار صراحی رکھی تھی۔ اس کے پاس ہی لکڑی کے فریم میں مڑھی ہوئی چوڑے حاشئے والی نسواری رنگ کی ایک فوٹو رکھی تھی۔ جس میں شیخ صاحب شلوار کوٹ پہنے پرانی وضع کی اونچی کمر والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ شیشہ دار روغن پھری الماریوں میں کتابوں کے علاوہ ایک پرانا سپرنگ ٹوٹا گراموفون، گجرات کے دو ٹی سیٹ، سبز سبز پتیوں والی چینی کی پرانی رکابیاں اور ڈھلواں کناروں والے چائے کے پیالے بند پڑے تھے۔ انگیٹھی کے اوپر دیوار پر ایک فریم کی ہوئی چوڑی رنگدار خیالی تصویر لگی تھی جس میں ترکوں کو ہلالی پھریرا اڑاتے یونانیوں پر حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ صوفوں کے درمیان دیوار کے ساتھ پتلی ٹانگوں والا ایک گول میز بچھا تھا۔ جو کڑھائی کے سرخ پھولوں والے میز پوش سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس میز پر ایک قدیم وضع کا مٹیالا بادامی ریڈیو رکھا تھا جس کی سوئی جب ریڈیو سیلون پر جاتی تو بڑی کھڑکھڑ کرنے لگتا۔ بازو والے کمرے میں دن بھر فرخندہ کے بھائی اسلم کا قبضہ رہتا۔ رات کو وہاں اسلم کے علاوہ بلقیس اور والدہ بھی سوتیں۔ اسلم چوڑی ہڈی والا لم ترنگ کھلنڈرا نوجوان تھا۔ جسے سینما دیکھنے، دوستوں کے ساتھ کالج کے خالی گھنٹوں میں کافی ہاؤس میں بیٹھ کر خوش گپیاں اڑانے اور نئی نئی پتلونیں سلوانے کا شوق تھا۔ وہ اپنا جیب خرچ والدہ سے لیتا اور بہنوں سے بھی کچھ نہ کچھ لے مرتا۔

اکبر اپنی بیوی عذرا اور بچے کے ساتھ اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں رہتا۔ عذرا

بنائی کا کام بڑا اچھا کرتی تھی۔ چنانچہ جاڑا شروع ہوتا تو اسے سوئیٹر بننے سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اسلم تو اپنی جرسیوں کے لئے ایسے ایسے پیچیدہ بنتی والے نمونے لا کر اسے دیتا کہ بے چاری عذرا کے لئے خانوں کا حساب رکھنا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ ایک الگ کاپی پر خانوں کا الٹ پھیر لکھ لیتی۔ اس نے اپنے بچے کے لئے جو سوئیٹر اور ٹوپیاں بن رکھی تھیں ان پر کہیں تو بڑا سا پھول لگا تھا اور کہیں ریشمی پھندنے سج رہے تھے۔ اکبر موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔ جس میں سے اس کی سکڑی ہوئی سفید آنکھیں اور چھوٹی دکھائی دیتیں۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ لیکن وہ اپنی عمر سے کافی بڑا معلوم ہوتا تھا۔ دبلا پتلا سا وہمی آدمی تھا۔ جو کھانا کھانے کے بعد دیر تک پیلے ہاتھ صابن سے دھوتا رہتا۔ سیدھے بال کنپٹیوں پر سفید ہونے لگے تھے۔ جہاں نیلی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ کسی بات کو غور سے سن رہا ہوتا یا دفتر میں انہماک سے کام کر رہا ہوتا تو نچلا ہونٹ لٹک سا جاتا اور منہ میں پانی بھر آتا۔ اوپر والی قطار میں سامنے کا ایک دانت بناوٹی تھا جس کی پلیٹ کو برش سے دیر تک رگڑا کرتا اور رات کو پانی بھرے گلاس میں ڈبو کر سوتا۔ چہرہ خشک بے حس اور پھیکا تھا۔ جس پر صرف اس وقت زندگی کے آثار پیدا ہوتے جب لمبی لمبی رقموں کو جمع کرنے کے بعد کل رقم اصل رقم سے مل جاتی۔ چھوٹے چھوٹے انسانی جذبوں سے اس کا رویہ ایک حساب دان ایسا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خشک حسابئے کی سی شک آمیز بے تعلقی آہستہ آہستہ حلول کر گئی تھی۔ غیر شعوری طور پر ہر آدمی کو ہندسوں کی سطح پر دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ جن کی حیثیت بڑی بڑی رقموں میں تو انتہائی اہم ہو جاتی۔ مگر حساب کے رجسٹر سے باہر وہ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر اپنے چھوٹے بھائی اسلم کو بازار میں دیکھ لیتا تو یوں رسمی سی سلام علیک کے بعد گزر جاتا جیسے وہ کوئی واقف کار ہو۔ لیکن گھر پر جب وہ کنبے کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر کھانا کھا رہا ہوتا تو اکبر اس کے ساتھ گھری التفات برتتا۔ مہینے میں ایک بار وہ اپنی بیوی کو سینما دکھانے لے جاتا۔ چالو فلم کا وہ عام طور پر آخری دن ہوتا اور اکبر کو بڑی آسانی سے دوسرے درجے کے دام دے کر پہلے درجے میں بیٹھنے کی رعائت مل جاتی۔ کشمیرن بیوی کا ہاتھ کھلا تھا۔ لیکن اکبر اسے صرف دس روپے مہینہ جیب خرچ دیتا۔ جس میں سے پانچ روپوں کی عذرا نے کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ وہ اپنا الگ کھانا نہیں پکاتے تھے۔ چنانچہ اکبر اس کے لئے والدہ کو ہر ماہ پچاس روپے دیا کرتا۔ کبھی کبھی وہ کاپی

پنسل لے کر یہ حساب لگانے بیٹھ جاتا کہ کہیں ہم گھر والوں کو زیادہ پیسے تو نہیں دے رہے۔
شیخ فقیر دین آڑھتی نے گھر میں لوہے کے پلڑوں والا ایک ترازو بنوا رکھا تھا۔ صبح و شام
ہنڈیا میں گھی تول کر ڈالا جاتا۔ چینی سے بھرا ہوا کنستر بوڑھے کی کوٹھڑی میں پلنگ کے نیچے
رہا کرتا۔ وہ روز کے روز چینی اپنے ہاتھ سے گڈوے میں ڈال کر دیتا۔ اکبر نے اپنے دوراندیش
باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کوئی ڈیڑھ ہزار روپے کے پندرہ فیصد منافع والے سیونگ
سرٹیفکیٹ خرید رکھے تھے۔ ہر کولیس کی ایک اگلے وقتوں کی سائیکل ابھی تک گھس رہی
تھی جس پر وہ رات کو مٹی کے تیل والا لیمپ جلاتا۔

اگرچہ اس گھر میں بلقیس سے ہر ایک کو پیار تھا لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی کوئی
سماجی حیثیت نہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں یہ ایک حقیقت ہے کہ جس عورت کو اس کا
خاوند چھوڑ دے اسے سوائے دوسرے خاوند کے اور کوئی منہ نہیں لگاتا۔ خواہ وہ ماں باپ کی کتنی
ہی لاڈلی بیٹی کیوں نہ ہو۔ اس کا معاملہ تو بالکل ایسے آدمی کی طرح ہوتا ہے جو میلے میں الا بلا کھا
کر گھر میں آ کر قے کرنی شروع کر دے۔ ہمارے ہاں عورتوں میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے۔
کہ وہ بدچلن خاوند کی بھی ہمیشہ حمایت ہی کرتی ہیں۔ ٹھوکریں کھانے پر بھی وہ خاوند کے
پاؤں میں گرتی ہے۔ (بیسویں صدی کے نچلے متوسط طبقے کے گدھے خاوند کتنے خوش قسمت
ہیں) اور جو بیوی گھر میں بٹھلا دی جائے۔ اس کے ذہن سے اوباش اور ظالم خاوند کے تلخ
نقوش بہت جلد دھل جاتے ہیں۔ ایک تو دور ہو جانے پر انسان کو ایک دوسرے کی زیادہ تر
اچھائیاں ہی یاد آتی ہیں۔ دوسرے میکے میں خاوند سے جھگڑ کر آئی ہوئی بیوی کو وہ مقام کبھی
میسر نہیں آتا جو اسے اپنے گھر میں حاصل تھا۔ چنانچہ بلقیس کا وجود بھی اس گھر میں جہاں اس
نے بہن اور بیٹی بن کر جوانی کے بے فکرے دن گزارے تھے ایک ایسے بوجھ کی مانند تھا جو
زبردستی لاد دیا گیا ہو۔ یا اگر ہم تشبیہ دینے میں زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیں تو ہم کہہ سکتے
ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ نسل کی پالتو بلی تھی جس کے خارش پڑ گئی تھی۔ روتی ہوئی بچی کو بچکارتی،
گود میں جھولا جھلاتی وہ اکتائی ہوئی سی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتی رہتی۔ اسے
اپنا خاوند یاد بھی آتا تو کسی کے سامنے اس کا نام لب پر نہ لاتی۔ ایک بار جب اس نے
اپنے خاوند کی ایک اچھی عادت کا ذکر کیا تو شیخ فقیر دین اپنی بیٹی پر برس پڑا۔

"سور کا بیٹا سور ہی ہوتا ہے اب اس کا نام لینا چھوڑ دو، اب تو دو ٹوک ہی فیصلہ ہو گا۔"

بلقیس کا دل کانپ گیا تھا۔ وہ کسی صورت بھی دو ٹوک فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔
اس نے تو دل ہی دل میں کب سے اپنے خاوند کو معاف کر دیا تھا۔ بلکہ دو ایک بار تو اس کے
خواب میں بھی آیا تھا۔ ایک بار تو بلقیس کو پیٹ رہا تھا۔ اور ایک بار اس کے لئے بھنا ہوا
مرغ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ بلقیس کا بس چلتا تو وہ بچی کو ساتھ لے کر اپنے گھر چلی جاتی۔ لیکن
اب تو اس کی تمام خواہشات خاندان والوں کے جھوٹے وقار اور عزت داری کی الگنی پر لٹکی
ہوئی تھیں جنہیں وہ ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ دل میں ایک بوجھ اور خشک ہونٹوں پر ایک
بے نام سی پیاس کی جلن لئے وہ گھر کے کام کاج میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی۔ برتن مانجھتی،
کپڑے دھوتی، کمروں میں فرخندہ کے ساتھ مل کر جھاڑو دیتی، صوفوں اور میزوں کی جھاڑ پونچھ
کرتی۔ اپنی بچی کی دیکھ بھال کرتی۔ پھر فارغ ہو کر نشست گاہ میں قالین تاگوں کی گچھیاں لے
کر کڑھائی کا کام کرنے لگتی۔ ان تمام ظاہری مصروفیتوں اور گھڑی پل کی اجنبی اجنبی سی ہنسی
خوشی کے پیچھے تھکے تھکے مضمحل جسم کی ناآسودگی اور بھرپور تشنگی ایک کانٹے کی طرح کھٹکتی
رہتی۔ جس طرح آدھی رات کو اچانک آنکھ کھل جائے، اور پھر ہزار جتن سے نیند نہ آئے۔
اس اعتبار سے بلقیس کی حالت اس درخت سے بالکل ملتی جلتی تھی جس کے تنے کی چھال
بارش کے بعد دیر تک رستی رہا کرتی ہے۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتی تھی اور اسے اس
بات کا شدید دکھ تھا کہ اس کی وجہ سے انہیں ذہنی صدمہ پہنچا ہے اور وہ برادری والوں سے
ملنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ خوف بلقیس کو ان بڑی بوڑھی رشتہ
دار عورتوں سے آتا جو کبھی کبھار گھر میں آ کر اس کی ماں سے اس کی بدقسمتی پر افسوس کا
اظہار کرتیں۔ اسے یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ عذرا بھابی ایک ایک منٹ کی خبر اپنے میکے
والوں کو دے آتی ہے۔ لیکن وہ ہر ایک سے ہنس کر ملنے پر مجبور تھی۔ کئی بار وہ اپنی بچی کو
چھوڑ کر عذرا بھابی کے بیٹے کو گود میں اٹھا لیتی اور دیر تک اس کا جی رجھایا کرتی کیونکہ اسے
ہمیشہ خیال رہتا کہ کہیں بھابی صرف اس بات پر ہی ناراض نہ ہو جائے۔ کہ وہ اس کے بیٹے کو
بلاتی تک نہیں، اور بھابی کی ناراضگی کا مطلب میکے میں بلقیس کی زبردست بدخوئی اور اس کے
ماں باپ کی زبوں حالی پر زبردست ٹھٹھے بازی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

فرخندہ اپنی بڑی بہن کے ازدواجی المیے سے ذہنی طور پر اتنی متاثر نہ ہوئی تھی۔ لیکن
اس کے دل میں اپنی بہن کے لئے بڑی ہمدردی اور محبت تھی۔ صرف اس حقیقت نے ہی

اسے اپنی بہن کے بہت قریب کردیا تھا کہ اس کے خاوند نے بلقیس کو گھر میں بٹھلا رکھا تھا۔ جب بلقیس گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوتی تو فرخندہ اس کی کمسن بچی کو گود میں اٹھا کر بہلایا کرتی۔ فرخندہ عمر میں بلقیس سے تین چار سال ہی چھوٹی تھی۔ یہی کوئی انیس بیس کا سن ہو گا۔ وسن پورے والے مکان میں آنے کے چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ سنہری مائل بھورے سے بال بڑے باریک اور ریشمی تھے۔ جنہیں ربن سے باندھ کر یونہی پیچھے ڈالے رکھتی، رنگ گندمی تھا جو خوب صابن سے نہانے کے بعد گورا ہو جاتا۔ داہنے گال پر ہونٹوں کے خم کے پاس کوئی انچ بھر لمبا پتلا سا زخم کا نشان تھا۔ ناک آگے سے ذرا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ جس نے نسواری رنگ کی چمکیلی آنکھوں والے گول گول چہرے پر قدیم یونانی دوشیزاؤں والا وقار پیدا کر دیا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں کے کناروں پر ہلکا ہلکا سنہری رواں تھا جو گرم گرم چائے کی بھاپ سے کانپنے لگتا۔ پلکیں تھوڑی تھوڑی بھوری تھیں۔ جب وہ آنکھیں اٹھا کر دیکھتی تو زندگی سے بھرپور چہرے پر بڑی ملائمت، شرمیلا پن اور عزم جھلکنے لگتا۔ ناخن بادام کی شکل کے تھے۔ جن پر وہ گلابی رنگ کا پالش لگایا کرتی تھی۔ اس قسم کے گھرانوں کی معمولی پڑھی لکھی کنواری لڑکیوں کی طرح فرخندہ شرمیلی بھی تھی اور بے باک بھی۔ دوسروں کے سامنے منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی رہتی لیکن اپنی سہیلیوں میں جی کھول کر باتیں کرتی، اور اگلے پچھلے سارے قصے بیان کر ڈالتی۔ گول خمدار جسم کے بھرے بھرے خطوط میں پُرشکم بلی ایسی خوابیدہ توانائی تھی جو وقت آنے پر سارے پٹھے سکیڑ کر پنجے پھیلا لیتی ہے۔ اور حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ عشقیہ ناولیں وہ رات کو پیٹ کے بل لیٹ کر پڑھتی اور دل پسند جملوں کے نیچے پنسل سے لکیر کھینچ دیا کرتی۔ گھر میں شیخ فقیر دین مہینے بھر کے لئے سنلائٹ صابن کی دو ٹکیاں بھجوا دیا کرتا۔ مگر فرخندہ اپنے لئے لکس یا رکسونا کی ٹکیا الگ منگوا کر، اپنے کمرے کی الماری میں رکھ چھوڑتی۔ صابن کے علاوہ آرائش کی دیگر معمولی ضرورتوں کی خاطر اسے اپنی پیاری امی سے تھوڑے بہت پیسے مل جایا کرتے تھے۔ جب وہ نہا دھو کر غسل خانے سے نکل کر دوسری منزل میں اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلتی تو فضا میں تازہ نہائے ہوئے جسم دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں اور پاؤڈر کریم کی خوشبو پھیل جاتی۔ دوستی میں وہ پورے تسلط اور مکمل غلبے کی قائل تھی۔ کسی تیسرے کی شرکت اسے ہرگز گوارہ نہ تھی۔ ساتھ والی گلی میں اپنی بچپن کی سہیلی انجم سے وہ ایک بار

صرف اس لئے ناراض ہو گئی کہ اس نے انجم کو کسی دوسری لڑکی سے گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ یہ عادت اس نے اپنے باپ شیخ فقیر دین سے لی تھی جو اپنے کاروباری رموز میں بڑی رازداری سے کام لیتا اور کسی دوسرے کو اس پر رائے زنی کا کبھی اختیار نہ دیتا۔ طبیعت کے اس رجحان نے فرخندہ میں ایک قسم کی خود پسندی اور خود غرضی پیدا کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے اکثر سہیلیاں اس سے ذہنی طور پر دور رہتیں انجم اس لئے قریب آ گئی تھی کہ وہ جذباتی اعتبار سے فرخندہ سے دبتی تھی اور اس نے اپنی کمزوریٔ طبع کی بناء پر فرخندہ کی خود پسندی اور حکم چلانے کی عادت کو قبول کر لیا تھا۔ انجم دبلے جسم کی لمبی سی لڑکی تھی جو عینک لگاتی اور گھر والوں کے ساتھ سینما یا رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہوئے تھوڑی سی لپ سٹک بھی لگا لیا کرتی۔ نویں میں فیل ہونے کے بعد گھر والوں نے اسے سلائی والے سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ جہاں وہ پاؤں سے چلنے والی سنگر مشین پر بیٹھی میز پوشوں اور چادروں پر بڑے بڑے پھول اور بیلیں کاڑھنا سیکھا کرتی۔ فرخندہ کو پڑھنے پڑھانے کا برائے نام ہی شوق تھا۔

میٹرک تک وہ نصاب کو رٹ کر پاس ہوتی چلی گئی۔ ایف اے میں یہ رٹائی پوری طرح کام نہ آئی اور وہ فیل ہو گئی۔ شیخ فقیر دین کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ ایک تو بیٹی کی پڑھائی پر لگی لگائی ساری رقم مٹی میں مل گئی تھی اور دوسرے اسے وہ اعزاز بھی نہ مل سکا تھا جس کے بل بوتے پر وہ فرخندہ کی شادی کسی اونچے گھرانے میں کروا کر اپنی سماجی حیثیت کو مزید بلند کر سکتے تھے۔ اپنے بڑے لڑکے اکبر سے مشورہ کرنے کے بعد شیخ صاحب نے فرخندہ کو اورینٹل کالج میں داخل کروا دیا۔ تاکہ یہاں ادیب فاضل کرنے کے بعد وہ صرف ایک مضمون کی تیاری کر کے ایف اے پاس کر سکے اور پھر اسی مضمون میں بی اے کا امتحان دے کر وہ اعزاز حاصل کر سکے جو شیخ صاحب کے نزدیک فرخندہ کے مستقبل اور ان کی سماجی برتری کیلئے کلید کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرخندہ اورینٹل کالج میں داخل ہو گئی لیکن اس کا پڑھائی میں ذرا جی نہ لگا۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ ہاں میں ہاں ملانے والی سہیلیوں کے جمگھٹ میں بیٹھی باتیں کرتی رہے۔ نئے نئے کپڑے پہن کر رشتہ داروں کے ہاں گھوم پھر کر اپنے ذوق کی داد لیتی رہے اور یا پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ کر ایسے گرم گرم رومانی ناول پڑھتی رہے۔ جو محبت کی گرم جوشیوں، چاندنی راتوں میں سہمی ہوئی ملاقاتوں، ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں اور بہتے آنسوؤں میں طویل ہم

آغوشیوں سے لبریز ہوں۔ اس طرح اس نے ڈھیروں ناول انجم کی وساطت سے منگوا کر پڑھ ڈالے تھے۔ اور کئی ایک تو اس کی الماری کے نچلے خانے میں بند پڑے تھے۔ ان کتابوں کا مطالعہ آخر رنگ لایا اور فرخندہ محبت کی خیالی دنیا میں رہنے لگی۔ اس کے باپ کی تربیت نے اسے ایک گھری اور بڑی کھری حقیقت پسندی دی تھی۔ ماں نے اسے صبر و تحمل سے صیح وقت کے انتظار کی اہلیت دی تھی۔ جس میں تقدیر پرستی کا ہلکا سا آمیزہ بھی تھا اور گھٹیا قسم کے رومانی ناولوں نے اس کے جذبات میں ایسا ہیجان برپا کر دیا جس نے حقیقت پسندی اور تقدیر پرستی کی دیواروں میں بڑے بڑے شگاف پیدا کر دئیے۔ ویسے تو ہر غیر شادی شدہ لڑکی کے دل میں محبت کرنے کی خواہش سوئی ہوتی ہے۔ اور عین وقت پر انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے۔ مگر جب اسے وقت سے پہلے جگا دیا جاتا ہے تو وہ کئی ایک کی نیندیں حرام کر دیتی ہے۔ فرخندہ جب کالج میں داخل ہوئی تو ادیب کا امتحان پاس کرنے کے علاوہ دل میں کسی کی محبوبہ بننے کا چھپا ہوا خیال بھی لے کر آئی تھی۔ رومانی ناولوں کے بھرپور مطالعے نے اسکے احساسات میں اس قدر تناؤ پیدا کر رکھا تھا کہ وہ ذرا سی آہٹ پر جھنجھنا اٹھنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس کھیت کی مانند جو اپنی مٹی میں بیج چھپائے بارش کے پہلے چھینٹے کا منتظر ہو۔ کالج میں ہر اس لڑکے سے محبت کرنے اور عشقیہ خط و کتابت شروع پر تیار تھی جو سب سے پہلے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔ چنانچہ یہ پہل مسعود کے حصے میں آئی۔ مخلوط تعلیم ہونے کی وجہ سے یہاں لڑکوں کی اچھی خاصی رونق رہا کرتی تھی۔ کئی لڑکوں نے محض اس لئے ادیب فاضل یا منشی فاضل کی کلاسوں میں داخلہ لے رکھا تھا کہ یہاں لڑکیوں سے عشق لڑایا جا سکتا تھا۔ کالج میں اگرچہ بڑی پابندیاں تھیں اور جماعت میں لڑکیاں پردے میں بیٹھا کرتی تھیں۔ اور انہیں ایک دوسرے سے میل جول کی بھی اجازت نہ تھی لیکن مردوں کے لئے ایک ماحول میں عورت کا ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی تمام مراحل وہ اپنی مکاری اور لومڑ ایسی موقع شناسی کی بدولت اپنے آپ ہی طے کر لیتا ہے۔

ویسے تو فرخندہ کو کالج کے برآمدوں میں سے گزرتے اور سیڑھیوں میں آتے جاتے ہر لڑکا گھور کر دیکھتا۔ لیکن مسعود نے تو ذرا سی تنہائی دیکھ کر فرخندہ کو سلام بھی کر ڈالا۔ فرخندہ کا منہ لال ہو گیا اور برقعے کے اندر جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اسے مسعود کی اس دیدہ دلیری پر غصہ بھی آیا اور خوشی بھی ہوئی۔ غصہ اس لئے آیا تھا کہ مسعود کی اس جرأت آمیز

حرکت نے فرخندہ کی خود داری کو ٹھیس پہنچائی تھی اور خوشی اس لئے ہوئی کہ اس کی خود پسندی کو تقویت ملی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے رومانی ناولوں کا محبوب مل گیا تھا۔ اگر فرخندہ میں ہنگامی جذبات کی خود سپردگی کے بجائے تھوڑی سی بردباری تحمل اور معاملہ فہمی ہوتی تو شاید اسے مسعود سے بہتر محبوب مل جاتا۔ مگر ہماری نوجوان پَود سے اب تحمل اور معاملہ فہمی کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ دَور ہی ہنگامہ خیزی اور ہیجان پسندی کا ہے۔ اور نوجوان ہر دور کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کا سب سے پہلے شکار بنتے ہیں۔ مسعود میں اس دور کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ وہ دوستوں سے ایثار بھی کرتا تھا اور بعض حالات میں ان کے ساتھ خود غرضی سے بھی پیش آتا تھا۔ گھر میں وہ گندے منہ کپڑے پہن کر پڑا رہتا لیکن جب کالج آتا تو ایسا بن سنور کر گویا کسی جاگیر دار کا بیٹا ہو۔ پتلون کی تہہ خراب ہو جاتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ سگریٹ والے کا قرض اتارتا تو درزی کا قرض چڑھ جاتا۔ درزی سے چھٹکارہ ملتا تو ہوٹل والا کاپی نکال کر بیٹھ جاتا۔ سگریٹ ہمیشہ پرانے رئیسوں کی طرح سگریٹ ہولڈر میں پھنسا کر پیتا۔ جدید طرز کی تنگ موری والی اونچی امریکی پتلون اور نائلون کی دو رنگی ٹائیوں کے ساتھ سگریٹ ہولڈر کی موجودگی قدامت پرستی کا نشان تھی۔ اور سینٹرل کالج میں جہاں عام طور پر اقتصادی پریشانیوں کے سد باب کے لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور اکثر طالب علم گردش ایام کا شکار ہو کر وہاں آتے ہیں۔ مسعود ایسے سمارٹ کھلنڈرے خوش پوش اور خوش وضع فیشن ایبل لڑکے کو الف لیلوی شہزادے کی حیثیت حاصل تھی، ادیب فاضل یا منشی فاضل کرنے کے بعد چھوٹی موٹی نوکریوں کی آرزو لے کر آئی ہوئی سرطی بسی لڑکیاں مسعود کو کالج کے برآمدوں میں اپھرے ہوئے کبوتر کی طرح ایڑیاں اٹھا اٹھا کر چلتے دیکھتیں تو دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے شرم سے دہری ہو کر وہاں سے گذر جاتیں، جو لڑکیاں ذرا فیشن ایبل تھیں اور محض تفریح یا خاوند کی تلاش میں وہاں آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی مسعود کی بے باک نظروں کے سامنے سر نہ اٹھا سکتیں۔ اور منہ لال کئے جلد جلد سیڑھیاں اتر جاتیں۔ مسعود نے کئی ایک لڑکیوں سے معاشقے کئے تھے، اور ان سبھوں کو باری باری چھوڑ دیا تھا۔ وہ دنیا کی ہر خوبصورت لڑکی سے عشق کرنے کا آرزو مند تھا لیکن شادی صرف ایسی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔ جس نے کبھی کسی لڑکے سے محبت نہ کی ہو۔ وہ صبح دیر تک بستر پر پڑا سگریٹیں پیتا رہتا۔ پھر اٹھتا اور دانت صاف کرنے میں آدھ گھنٹہ لگا دیتا۔

اس کے کپڑے ڈھیروں کے ڈھیر ادھر ادھر صوفوں کی پائنتی اور کرسیوں پر پڑے رہتے تھے۔ وہ لباس پر بہت زیادہ خرچ کرتا اور لباس نےاسے بڑی بڑی محفلوں میں راہداری کا پروانہ لے کر دے رکھا تھا۔ چرب زبانی میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہ ہر بحث کو صرف اس لئے جیت جاتا کہ خود بولتا چلا جاتا اور دوسرے کو بولنے کا موقع ہی نہ دیتا۔ اسے رائج الوقت قسم کے تمام لطیفے، امریکی مذاق اور کارٹون بنانے والوں کے نام یاد تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لبنان سے کون کون سا ہوائی جہاز پیرس کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اور ان ہوائی جہازوں میں کس قسم کی شرابیں اور کھانے ملتے ہیں۔ پیرس اور لندن کی شبینہ کلبوں کی پوری تفصیل اسے زبانی یاد تھی۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ ہوائی ڈاک پر کتنے ٹکٹ چسپاں ہوتے ہیں؟ ہالی وڈ کے مشہور ڈائریکٹر کون کون سے ہیں؟ دنیا کا مشہور ہوا باز کون ہے؟ پہلی آبدوز کشتی کب بنی؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان معلومات کے سہارے اس کی ہر سوسائٹی میں رسائی تھی اور جس عورت کے ساتھ وہ دس منٹ بات کرتا۔ اسے اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ اس نے دنیا کی بہترین کتابوں سے عشقیہ مکالمے زبانی یاد کر رکھے تھے۔ جن کو عورتوں کے سامنے ادا کرتے ہوئے وہ پرانے عاشقوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔

وہ ایم اے اردو کے پہلے سال میں تھا اور کالج بڑی باقاعدگی سے آتا تھا بس ذرا دیر سے آتا۔ وہ ان لڑکیوں سے ذرا انتظار کی زحمت اٹھوانا چاہتا جو اس کے خیال میں اس کی آمد کے لئے چشم براہ ہوا کرتیں۔ کالج کے خالی گھنٹوں میں وہ چاندی کا سگریٹ ہولڈر منہ میں دبائے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے۔ دوسری منزل والے برآمدے میں سیڑھیوں کے پاس جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا رہتا۔ کتابیں اس کی بغل میں ہوتی تھیں۔ دور سے کسی پروفیسر یا لیکچرار کو آتے دیکھتا، تو آگے بڑھ کر اسے سلام کرتا اور یوں کسی نصابی موضوع پر بات شروع کر دیتا۔ جیسے اسے امتحان کا بہت فکر ہو۔ پرنسپل کے علاوہ پروفیسر صاحبان بھی مسعود کی عشق بازیوں سے باخبر تھے۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ مسعود نے انہیں کبھی کوئی ثبوت مہیا نہ ہونے دیا تھا۔ پیشہ ور پتے بازوں کی طرح وہ جس پتے پر نگاہ رکھتا اسے دوسرے پتوں میں اسی طرح گڈمڈ کر دیتا کہ دوسرا اس کی نشان دہی نہ کر سکتا تھا۔ وہ جس لڑکی کو اپنے لئے منتخب کرتا عام طور پر کالج میں اس سے کبھی کوئی بات نہ کرتا۔ وہ ان باتوں میں بڑا محتاط تھا۔ یہی وہ گُر تھے جن پر بڑی ہوشیاری سے عمل کرتے ہوئے وہ بالکل ایک پیشہ ور عاشق بن گیا تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر اپنے ہونے والی معشوقہ کا انتخاب کرتا۔ مسلسل تانک جھانک

اور کسی نہ کسی بہانے لڑکی سے بات چیت کر کے وہ ہلکی پوری تصدیق کر لیتا کہ لڑکی دبلی پتلی تو نہیں۔ اس کے دانت ٹیڑھے میڑھے تو نہیں؟ ہونٹوں پر جو رواں ہے اس پر مونچھوں کا گمان تو نہیں ہوتا۔ گرمیوں میں پاس کھڑے ہونے سے پسینے کی بو تو نہیں آتی؟ چلتے میں جان بوجھ کر کولہوں کو تو نہیں مٹکاتی؟ جب ان تمام امور کی تحقیق ہو چکتی تو مسعود جال پھینک دیتا۔ اور خود الگ ہٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ جب شکار پوری طرح پھنس جاتا تو وہ آہستہ آہستہ ڈوری اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتا۔

فرخندہ کو اس نے پہلے ہی روز کالج کی لائبریری سے نقاب اٹھائے باہر نکلتے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گیا۔ اسے فرخندہ کی نسواری چمکیلی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹوں کے پاس والا زخم کا نشان بہت پسند آیا تھا۔ زخم کے اس نشان میں اسے ایک بے رحم سی جنسی تسکین ملتی تھی۔ وہ فرخندہ کے سارے بدن پر اس قسم کے نشان دیکھنا چاہتا تھا۔ فرخندہ کی پہلی جھلک نے ہی اس پر کچھ ایسا جادو سا کر دیا کہ مسعود نے مزید تفتیش کے اصول کو بالائے طاق رکھ کر ایک روز سیدھے سبھاؤ اسے سر جھکا کر سلام کر دیا۔ فرخندہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور مسعود سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ فرخندہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے روز پھر ایسا ہوا فرخندہ خاموش رہی۔ جب تیسری بار یہ عمل دہرایا گیا تو فرخندہ ذرا سا مسکرائی اور مسعود نے جال کی ڈوری کھینچنا شروع کر دی اور شکار لحہ بہ لحہ اس کے قریب ہوتا گیا۔ مسعود کی شخصیت میں اتنی دلکشی تھی کہ فرخندہ ایسی صاف ستھرے مذاق اور بڑی پُر غرور خود پسند طبیعت رکھنے والی مائل بہ عشق لڑکی اس کی گرویدہ ہو گئی، اور قریب قریب ہر روز اسے کالج سے باہر ملنا شروع کر دیا۔ فرخندہ تو گویا اشارے کی منتظر تھی۔ جس طرح سگنل ملتے ہی گاڑی چل پڑتی ہے۔ فرخندہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس میں اتنی دور اندیشی ضرور تھی، کہ اس نے اپنی اس کمزوری کو مسعود پر کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ الٹا اپنے رویے سے یہ ثابت کرنے لگی کہ اسے اس طرح کی عشق بازیوں سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ معشوقہ کی اس بے اعتنائی اور عشقیہ جذبات کی طرف سے روکھے پن نے مسعود کی غلبہ پسند طبیعت کو ایڑ لگا دی۔ اس نے فرخندہ سے اپنی محبت اور شخصیت کا لوہا منوانے کے لئے اس پر چاروں طرف سے حملے شروع کر دیئے۔ وہ چوبیس گھنٹے اسی کے گن گانے لگا۔ اسے عطر میں بسے ہوئے محبت نامے لکھنے لگا (وہ کام جو اس نے کبھی نہیں کیا تھا) ہر دوسرے تیسرے فرخندہ کے لئے

خوبصورت ریشمی رومال یا کانوں کے بندے خرید کر لاتا۔ اسے فرانسیسی اور اطالوی خوشبوؤں سے بھری ہوئی شیشیاں بطور تحفہ دیتا۔ مسعود کی اس گرم جوشی اور پر جوش عاشقوں ایسی گرویدگی نے فرخندہ کی تمام پیش بندیوں اور دور اندیشی کے نظریات کا ملمع اتار دیا۔ اتنے بڑے سیلاب میں اس کے تمام اصول تنکوں کی طرح بہہ گئے اور وہ دیوانہ وار مسعود سے لپٹ گئی۔

یہ مسعود کی پہلی فتح تھی۔ اسے کبھی عشق بازی کی جنگ میں اتنا سخت مقابلہ نہ کرنا پڑا تھا۔ کچھ دیر پہلی فتح کا جشن منانے کے بعد ہمارا پیشہ ور جنگجو عاشق محبت کے دوسرے اور سب سے اہم محاذ کو فتح کرنے کے لئے چل پڑا۔ فرخندہ سے اس کی ملاقات کالج میں روز ہی ہوتی لیکن مسعود نے اب کالج میں اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ ان کی اصل ملاقاتیں تو اب کالج کے باہر شہر کے غیر معروف ہوٹلوں میں یا سینما گھروں میں ہوا کرتیں۔ ان چوری چھپے کی ملاقاتوں میں فرخندہ کو بڑی صحت مند قسم کی دلربا لذت ملتی۔ اسے ایسے لگتا کہ وہ اپنی الماری میں بند رومانی ناولوں کے صفحوں پر چل پھر رہی ہے۔ مسعود کو وہ خیال ہی خیال میں ایسا جرنیل سمجھنے لگی جو پہاڑ پار کی سلطنت سے دشمن کے خیموں میں سے ہوتا ہوا اسے ملنے آتا ہے۔ ہوٹل کے کیبن یا سینما کی گیلری میں وہ اس کے پہلو میں مگن سی ہو کر بیٹھی رہتی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایسے آنکھیں بند کر لیتی جیسے بلی کا بچہ دودھ پینے کے بعد کر لیا کرتا ہے۔ اپنی سہیلی انجم کو اس نے ہمراز بنا لیا اور ہر ملاقات کا حال روز اسے بتا دیا کرتی تھی۔ اس طرح اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور اس کی خود پسندی کو تسکین بھی ملتی۔ پہلی بار جب مسعود نے فرخندہ کا زور زور سے منہ چوما تو اس کے ہونٹ درد کرتے رہے۔ پھر اس کا سینہ دکھتا رہا اور رات بھر بے چین رہی۔ مسعود کے محبت ناموں کو اس نے ولائتی ٹافیوں کے ایک رنگین تصویر والے ڈبے میں بند کر کے اپنی الماری میں سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ رات کو جب گھر میں سب سو جاتے تو وہ اپنے کمرے میں آ کر اندر سے دروازہ بند کر لیتی۔ الماری کھول کر مسعود کے خط نکالتی۔ انہیں ایک ایک کر کے پڑھتی۔ پڑھنے کے بعد انہیں پھر ڈبے میں بند کر کے الماری میں رکھ دیتی۔ چھوٹے سائز کا سبز پیڈ اور قلم لے کر پلنگ پر بیٹھ جاتی اور مسعود کو خط لکھتی، ان خطوں میں خواہ مخواہ کے پیدا کئے ہوئے گلے شکوے اور بے بنیاد شبہات ہوتے، بھرپور محبت کا اظہار ہوتا۔ کالج میں کسی روز آنکھ چرا کر نکل جانے کی شکایت ہوتی۔

بڑے روائتی انداز میں چاندنی راتوں اور پھولوں کا ذکر ہوتا مثلاً ہمارے آنگن میں بیری کا بور جھڑ گیا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے کچے بیر لگ گئے ہیں۔ رات کو میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا رہ گیا تھا۔ جس میں سے چاندنی میرے کمرے کی دری اور میز پر رکھی ہوئی کتابوں پر پڑ رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھی اور تمہارے خط نکال کر پڑھنے لگی۔ مجھے تم اس وقت بہت یاد آئے۔ مسعود! کیا ہم زندگی میں اسی طرح ساتھ ساتھ رہیں گے؟ یقین نہیں آتا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی کروں گی تو صرف تم سے۔ نہیں تو ساری عمر کنواری بیٹھی رہونگی۔ تمہارے چومنے سے میری گردن پر جو نشان پڑ گیا تھا۔ کل شریر انجم اسے دیکھ دیکھ کر مجھے چھیڑتی رہی۔ میں نے کہا رات کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ بولی میں اس کیڑے کو جانتی ہوں۔ بڑی پیاری ہے۔ ہم دونوں کی بڑی ہی ہمدرد ہے۔ مسعود! کل جب میں نے تم سے شادی کا ذکر کیا تو تم خاموش کیوں ہو گئے تھے؟ تمہاری خاموشی نے مجھے اداس کر دیا تھا۔ مگر میں تو صرف تمہیں دیکھنے سے ہی خوش ہو جاتی ہوں۔ میں تمہارے پاس بیٹھ کر کبھی غمگین نہیں ہو سکتی اور دیکھو بھئی تم میری گردن پر مت چوما کرو۔ پھر گھر میں سبھی نشان دیکھ کر پوچھنے لگ جاتے ہیں۔ اب میں روز روز تو بہانے نہیں بنا سکتی نا-----
تم میرے ------ چوم لیا کرو، اچھا اس خط کا جواب ضرور دینا۔ کالج چار دن بعد کھل رہا ہے۔ اتنے دن تمہارے بغیر کیسے گذاروں گی؟ تم تو اپنے دوستوں میں خوب گپیں لڑا رہے ہو گے۔ میں جانتی ہوں تم میرے بغیر اپنے دوستوں میں بہت خوش رہتے ہو اور خوب قہقہے لگاتے ہو۔ دیکھو مسعود میرے بعد دوستوں میں تم قہقہے مت لگایا کرو۔ تم صرف میرے سامنے ہنسا کرو۔ جب میں نہ ہوں تو اداس اداس رہا کرو۔ تم کہا کرتے ہو فرخندہ! مجھے تمہارے گال پر یہ چوٹ کا نشان بہت پسند ہے۔ تمہیں تو خبر ہی نہیں کہ مجھے اس چوٹ نے کتنی تکلیف دی تھی۔ سچ میں نے کئی روز تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ اچھا اب مجھے نیند آنے لگی ہے۔
صبح سویرے اٹھ کر آگ جلانی ہے۔ برتن مانجھنے ہیں۔ چائے بنانی ہے۔ سب کے لئے آٹا گوندھنا ہے۔ تم تو مزے سے پڑے سوتے ہو گے۔ مردوں کو بھی کتنا آرام ہوتا ہے۔ ذرا میری جگہ آؤ تو ایک ہی دن میں نانی یاد آ جائے۔ بھائی جان ننھے بلو کے لئے بازار سے ایک طوطا خرید لائے ہیں۔ ہم اسے بہت کھلاتے پلاتے ہیں۔ ابھی بچہ ہی ہے۔ پنجرے میں بند پڑا رہتا ہے اور لال بڑی سی چونچ کھول کر امرود اور گاجریں کترتا ہے۔ ننھی پوپی اور بلو اس سے

خوب کھیلتے ہیں۔ کل میں اس کا پنجرہ اٹھا کر اوپر اپنے کمرے میں لے آئی اور طوطے کو تمہارا نام بولنا سکھانے لگی۔ پھر ڈر گئی۔ اگر اس نے سب کے سامنے تمہارا نام لے دیا تو کیا ہو گا۔ لیکن میاں مٹھو تو ابھی بولتا ہی نہیں۔ بس چیں چیں کرتا رہتا ہے، لو------ مجھے پھر جمائی آ گئی۔ اچھا بھئی اب خدا حافظ-----"

۵

فرخندہ ادیب فاضل کے امتحان میں فیل ہوئی تو اسے کالج سے اٹھا لیا گیا۔ شیخ فقیر دین نے اپنی بیوی اور بڑے لڑکے کے مشورے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ لڑکی کو گھر پر کوئی ماسٹر رکھ کر محنت کروائی جائے۔

"کالجوں میں تو آجکل برائے نام ہی پڑھائی ہوتی ہے۔ وہاں تو خواہ مخواہ میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ سال میں چھ ماہ تو چھٹیوں کے نکل جاتے ہیں پھر فائدہ کیا ہوا؟"

اکبر نے عینک کے شیشے اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ شیخ صاحب پلنگ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے ادھڑے ہوئے استر والی کالی ٹوپی اتار کر خشخشی سر پر ہاتھ پھیرا۔ ٹوپی پھر سے جمائی اور گھٹنوں پر رکھا ہوا حساب کتاب کا کھاتہ بند کر کے سرہانے رکھ دیا۔

"اب سوال یہ ہے کہ گھر پر اسے کون پڑھائے گا۔ تمہیں دفتر کے کام سے فرصت نہیں۔ غیر آدمی کو گھر میں بلایا نہیں جا سکتا۔ مگر میں کہتا ہوں اگر اس کمبخت نے گھر پر بھی محنت نہ کی تو فضول روپیہ برباد کرنے سے فائدہ؟ پیسہ یونہی تو نہیں کمایا جاتا۔ پہلے اس سے پوچھ لو کہ اس کی مرضی پڑھنے کی ہے یا نہیں؟"

فرخندہ کی امی اپنے پوتے کو گود میں لئے پیڑھی پر بیٹھی اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کیونکہ بچہ دودھ پینے اور خوب رو چکنے کے بعد اب آنکھیں بند کرنے لگا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"آخر پڑھے گی نہیں تو کرے گی کیا؟ بھلا آج کل لڑکیوں کو ان پڑھ رکھنے کا کوئی زمانہ ہے۔ ہماری بلقیس اگر چار لفظ پڑھی ہوتی تو ہمیں کسی بات کی کمی تھی۔ اپنا مزے سے نوکری کر لیتی۔"

"لیکن اماں نوکری کہاں کھٹ سے مل جاتی ہے۔ اول تو ہر طرف بے روزگاری ہے۔ پھر نوکری دلوانے والے دفتروں کے چکر ہیں۔ اگر نوکری مل بھی جائے تو مہنگائی الاؤنس وغیرہ ڈال کر کل سو سوا بنتے ہیں۔ ان میں سے بھی-----"

شیخ صاحب اب سرہانے کے نیچے سے اردو کا میلا سا اخبار نکال کر پڑھنے لگے تھے۔

ان کے بھوسلے چہرے کی کھال آنکھوں کے پاس سکڑ گئی تھی اور پھیکے پھیکے بے حس ہونٹوں پر اکتاہٹ کا احساس جھلکنے لگا تھا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی بات کاٹ کر کہا۔

"سوال یہ ہے کہ ابھی جو پیسہ اس کند ذہن لڑکی پر خرچ ہو رہا ہے وہ کس حساب میں جائے گا؟"

ٹھنڈی طبیعت اور ہر بات کی تہہ تک پہنچ جانے والی بیوی کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا کنجوس خاوند اپنی گفتگو کا رخ بتدریج اس نقطے کی طرف لا رہا ہے جہاں پہنچ کر وہ دوسروں کے منہ سے یہ کہلوا دے گا کہ فرخندہ کی پڑھائی بالکل ہی بند کر دی جائے۔ یہ اس کے کاروباری استدلال کا طریقہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنی باتوں سے اس طرح رام کرتا کہ وہ بالآخر اس کی بات اپنے منہ سے کہہ دینے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ اس نے جلدی سے کہا۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں فرخندہ کی پڑھائی کا میں ذمہ لیتی ہوں۔ آپ اس کے لئے کسی ماسٹر کا بندوبست کریں — اگر تین ماہ بعد کے امتحان میں وہ کامیاب نہ ہو سکی تو بے شک اسے چھٹی دے دیں۔"

معاملہ فہم بیوی کا تیر نشانے پر لگا۔ شیخ صاحب نے اخبار کے پیچھے سے اپنی اندر ہی اندر کی سدا مخالف بیوی کو گھور کر دیکھا اور پھر اخبار تہہ کر کے سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ اکبر نے کہا۔

"ویسے امی ہمیں فرخندہ سے کوئی بیر نہیں ہے۔ اگر وہ جی لگا کر محنت کرے میں تو خود اسے بی اے کروانے کے حق میں ہوں۔ اب اگر آپ اس کا ذمہ لیتی ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ کیوں میاں جی؟"

شیخ صاحب نے ٹوپی اٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ ٹوپی سر پر جمائی اور اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم لڑکی کے لئے کسی ادھیڑ عمر کے ماسٹر کا انتظام کرو۔ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ مجھے کاروبار کے دھندوں سے بالکل فرصت نہیں۔"

فرخندہ نے یہ خبر بجھے ہوئے دل اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سنی۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر لکھنے کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں پاؤں اٹھا کر پلنگ پر رکھ لئے۔ سر تھوڑا سا جھکا تھا اور وہ سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دور نظر آنے والے کھیتوں کی

جانب دیکھنے لگی۔ سردیوں کی دوپہر کی چمکیلی دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ کھیت کنارے گوبر کے ڈھیر پڑے تھے اور ایک لڑکا کچے راستے پر پتلی سی چھڑی سے گائے ہنکائے لئے جا رہا تھا۔ فرخندہ صرف لڑکے کو گائے کی پچھلی ٹانگوں پر چھڑی مارتے دیکھتی۔ اسے چھڑی کی آواز بالکل سنائی نہ دیتی۔ عذرا بھابی گیلری میں بیٹھی پرانا سویٹر ادھیڑ رہی تھی۔ اس کا بچہ اس کے پاس پلنگڑی میں لیٹا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ بلقیس اپنی بچی کو سلا کر غسل خانے میں کپڑوں کا ڈھیر سامنے رکھے انہیں دھو رہی تھی۔ نلکے کا پانی بالٹی میں گر رہا تھا۔ امی باورچی خانے میں ترکاری بنا رہی تھی۔ فرخندہ ابھی ابھی آٹا گوندھ کر آئی تھی۔ گیلا آٹا اس کے ناخنوں میں کہیں کہیں رہ گیا تھا۔ اسکے ہاتھ ٹھنڈے پانی سے لال ہو رہے تھے۔ کھڑکی پر ایک طرف کو چُنا ہوا کتھئی رنگ کا پردہ باہر کھیتوں اور کھلے میدانوں سے آتی ہوئی ہوا میں کسی وقت جھولنے لگتا تھا۔ میز پر اس کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ آتشدان والے گلدان میں پرسوں کے رکھے ہوئے گلاب کے پھول مرجھا گئے تھے۔ اور ان کی لال لال پنکھڑیاں قرمزی ہو کر اندر کو سکڑ گئی تھیں۔ فرخندہ کو اس خیال سے رونا آ رہا تھا کہ اب وہ کالج نہیں جائے گی اور مسعود سے نہیں مل سکے گی۔ اسے اپنے آپ پر پنجرے میں بند پڑی بلبل کا گمان ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پنجرہ توڑ کر اڑ جائے اپنے کمرے سے باہر نکل کر گلی میں آ جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسعود کے پاس چلی جائے۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے محکوم ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس کے احساس غرور کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ گھر والوں کے فیصلوں کی پابند تھی۔ ان کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتی تھی۔ وہ لوگ اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ اسے اپنی امی پر بھی غصہ آنے لگا۔ جنہوں نے یونہی گھر پر پڑھانے والی بات مان لی وہ اگر چاہتیں تو میاں جی کو مجبور کر کے انہیں اس بات پر راضی کر سکتی تھیں کہ فرخندہ کو کالج میں مزید ایک سال کی مہلت دی جائے مگر اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا فرخندہ کو کالج سے اٹھا لیا گیا تھا اور بہت جلد کوئی نہ کوئی ماسٹر صاحب اسے پڑھانے کے لئے گھر تشریف لانے والے تھے۔ فرخندہ نے نفرت سے سر جھٹک دیا۔ میز پر سے ایک کاغذ اڑ کر اس کی جھولی میں آن گرا۔ فرخندہ نے اسے غصے میں پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔

فرخندہ نے مسعود کو تین خط لکھے مگر جواب ایک کا بھی وصول نہ کر سکی۔ آخر وہ کس کی

معرفت خط منگواتی؟ وہ ہر خط میں مسعود کو جدائی کی پُردرد حکایت بیان کرنے کے بعد لکھتی کہ اگلے خط میں اپنا پتہ ضرور دوں گی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انجم کے پتے پر خط منگوا لیا کرے گی۔ لیکن انجم بڑی ڈرپوک قسم کی لڑکی تھی جیسی کہ ہماری دبلی پتلی عینک لگانے والی لڑکیاں عام طور پر ہوا کرتی ہیں۔ بزدل اور بات کی کھال نکالنے والی۔۔۔۔۔ وہ ڈرتی تھی کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن فرخندہ ایسی پُراثر شخصیت والی لڑکی کے سامنے انجم ایسی کمزور طبع لڑکی زیادہ دیر تک انکار نہ کر سکی۔ ویسے بھی انجم کو جذباتی طور پر اپنی سہیلی سے ہمدردی تھی اور اس کا بڑا خیال تھا۔ اس کا دل فرخندہ کے لئے کسی نہ کسی طرح آلۂ کار بننے کا بھی خواہش مند تھا طے یہ پایا کہ لڑکی بن کر انجم کے پتہ پر فرخندہ کو خط لکھے۔ مسعود نے اشارہ پاتے ہی خطوں کا تانا باندھ دیا۔ کیونکہ ہمارے جنگجو عاشق کو ابھی محبت کے آخری محاذ پر فتح نصیب نہیں ہوئی تھی۔

انجم دوڑی دوڑی فرخندہ کے پاس آئی۔

"خدا کے لئے اسے لکھو، ایسا غضب نہ کرے اس طرح خوامخواہ ہر ایک کو شک ہوگا۔ بس ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرے۔"

چنانچہ مسعود ہر ہفتے دوبار خط لکھتا اور ہر خط میں جلد از جلد ملاقات کی ضرورت پر زور دیتا مگر فرخندہ کا روز روز گھر سے باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ہفتے میں کم از کم ایک بار انجم کے ساتھ مسعود سے ملنے ضرور جاتی۔ کبھی انار کلی درزی کے ہاں جانے کا بہانہ بنا کر اور کبھی سمن آباد والی خالہ کو ملنے کا بہانہ بنا کر۔ اس روز وہ سمن آباد والی خالہ کے ہاں بھی جاتی۔ مگر ذرا کی ذرا کے لئے۔ باقی سارا وقت وہ دونوں مسعود کے ساتھ کسی غیر معروف ہوٹل کے کیبن میں بیٹھی رہتیں یا چڑیا گھر کی سیر کیا کرتیں۔

سمن آباد میں جو فرخندہ کی خالہ رہتی تھی اس کا ایک لڑکا تھا جو بڑا سنکی سا تھا اور پنجاب یونیورسٹی میں ادبیات میں ایم اے کر رہا تھا۔ شیخ فقیر دین کی مصلحت بین کاروباری ذہنیت چونکہ اپنے رشتہ داروں سے زیادہ میل ملاپ رکھنے میں مانع تھی اس لئے ان لوگوں کا آپس میں آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف شادی بیاہ یا سوگ کے موقع پر ہی ملاقات ہوتی اور وہ بھی کبھی کبھی۔۔۔۔۔ اب جو فرخندہ نے اپنی مصلحت کی خاطر خالہ کے ہاں آمدورفت شروع کردی تھی تو شیخ صاحب کو فوراً اس کا پتہ چل گیا اور انہوں نے فرخندہ کو سمن آباد والے گھر

میں جانے سے منع کر دیا۔ شیخ کی بیوی سے اپنی بہن کی یہ توہین برداشت نہ ہو سکی۔

"آخر ملنے ملانے میں حرج ہی کیا ہے؟ ان لوگوں نے ہم سے کوئی دشمنی تو نہیں کی جو ہم انہیں پاس بھی نہ پھٹکنے دیں؟"

شیخ صاحب کا پتھر جیسا چہرہ منجمد ہو کر ایک طرف کو کھچ گیا اور پھولی ہوئی ناک سبز ہو کر غصے میں تھر تھرانے لگی مگر فوراً ہی غصیلے لومڑ نے بلی جیسی نرمی اختیار کر لی اور پنجے کھال کے اندر سکیڑ لئے اور بولے۔

"ٹھیک ہے ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے تم بے شک ان سے ملو میں تمہیں ملنے سے کب منع کرتا ہوں لیکن کل کلاں جب ان کی ٹولیاں کی ٹولیاں یہاں آنا شروع ہو گئیں تو یہ سارا خرچ کون اٹھائے گا۔ تم یا میں؟ اور اگر تم بھی اٹھاؤ گی تو اس کا بوجھ آخر کو مجھ پر ہی پڑے گا۔ پھر جوان لڑکیوں کا اس طرح منہ اٹھائے آتے جاتے رہنا مجھے بالکل پسند نہیں۔"

نرم مزاج اور وسیع القلب بیوی خاموش ہو رہی۔ وہ نہ تو فرخندہ کی طرف داری کر رہی تھی نہ اپنے خاوند کی مخالفت کرنا چاہتی تھی وہ تو صرف اپنی بہن کی صفائی پیش کرنا چاہتی تھی۔ سو اس نے کر دی اور چپکی ہو رہی ویسے فرخندہ نے احتیاطاً خالہ کے ہاں جانا بالکل چھوڑ دیا۔ لیکن خالہ کے سنکی لڑکے خالد نے فرخندہ کو دیکھ لیا تھا اور وہ کچھ حیران ہوا تھا اور خوش بھی۔ اس نے فرخندہ کو بڑی دیر بعد دیکھا تھا اور اسے بالکل احساس نہیں رہا تھا کہ فرخندہ اتنی جوان بھی ہو سکتی ہے۔ پہلے تو بڑی دبلی پتلی اور چھوٹی سی ہوا کرتی تھی اور آنگن میں جھاڑو دیا کرتی تھی لیکن اب وہ پوری طرح جوان ہو گئی تھی۔ اس کے بازو گوشت سے بھر کر گول ہو گئے تھے۔ سینہ ابھر آیا تھا اور کولہوں کے خم چلتے وقت بڑی نزاکت سے تھر تھراتے تھے۔

--------------- ادبیات کے طالبعلم کو فرخندہ میں موپساں کی کہانیوں اور ٹالسٹائی کے ناولوں کی چلبلی نٹ کھٹ ہیروئنیں نظر آنے لگیں۔ عقلمند ٹھگ محلے کے لوگوں کو اپنی ٹھگی کا کبھی نشانہ نہیں بناتا مگر ہمارے دور کی آسان چیزوں پر اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند نوجوان سب سے پہلے اپنی رشتہ دار لڑکیوں پر ڈورے ڈالتے ہیں یہاں انھیں ہر چیز پہلے ہی بنی بنائی اور تیار ملتی ہے۔ بس میک اپ کر کے سٹیج پر آنے کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ ادبیات کا طالب علم فرخندہ کو دیکھتے ہوئے اس پر لٹو ہو گیا اور اس نے اپنے دل

ہی دل میں اسے اپنی محبوبہ بنا کر وسن پورے کے مکان میں بٹھلا دیا جہاں وہ جب اور جس وقت چاہے جا سکتا تھا۔ ادبیات کے طالب علم کا اب ہر تیسرے چوتھے وسن پورے والی خالہ کے ہاں پھیرا رہنے لگا۔ اس شخص کی عمر تیس سال کے قریب تھی مگر سوکھا ساکھا چمرخ سا ہونے کی وجہ سے کم عمر لگتا تھا چہرے پر چھائیوں کے داغ تھے اور آنکھیں چوہیوں جیسی چھوٹی چھوٹی اور بے رنگ تھیں جو قریب سے دیکھنے پر اور چھوٹی ہو جاتیں۔ بی اے میں تین بار فیل ہوا تھا اور ایک سال تک یونہی دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔ باپ پی ڈبلیو کا سی کلاس کا ٹھیکیدار تھا جو پانچ ہزار کی رشوت دے کر سال میں دس ہزار کماتا۔ بیٹا ایم اے، ادبیات کر رہا تھا۔ مگر طبعیت میں اقتصادی ماہروں جیسی خشکی پھیکا پن اور ان وضعدار لوگوں جیسی احتیاط پائی جاتی تھی جو ایک بار مالی مشکلات کا شکار ہو جائیں تو ساری عمر پائی پائی کا حساب رکھتے گذار دیں۔ مزاج میں پہریداروں جیسا چوکنا پن اور کھٹکے پر چونکے ہوئے چوروں جیسی ہوشیاری تھی دانت اتنے مانجھ کر رکھتا کہ بناوٹی لگتے۔ بالکل سفید اور کانچ جیسے تھے۔ طوطے جیسی نوکیلی ناک آگے سے مڑ گئی تھی جو مفاہمت پرستی اور موقع محل کے مطابق سمجھوتے بازی کی علامت تھی۔ ہر بات کی منطقی توضیح کرتا ہر مسئلے کو منطق کے ٹھیٹھ اصولوں کی رو سے حل کرنے کی کوشش کرتا۔ کپڑے بالکل میلے ہو جاتے تو اتارتا۔ ٹائی کی گرہ بڑی کس کر باندھتا جس پر میل چمکا کرتا ہر کسی کی حیثیت کا تعین اس کے لباس سے کرتا اسکے نزدیک دھوتی پوش آدمی لفنگا تھا اور شلوار والا احمق۔ کسی پر بہت کم اعتبار کرتا۔ ہر آدمی کی رائے پر شک کا اظہار کرتا۔ جس سے حسد کرتا اس کی خوشامد شروع کر دیتا مگر دل میں اس کی بنی بنائی عزت کو ملیامیٹ کر دینے کے خواب دیکھتا رہتا۔ ہر صحت مند اور بے فکرے آدمی کے لئے دل میں ایک ناقابل فہم بغض اور خود ساختہ کینہ بٹھلا لیتا اور پھر اس کے ساتھ بڑی پُرفریب شائستگی سے پیش آتا۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کا حال مزے لے لے کر بیان کرتا اور اپنی خوش وقتی کو جھوٹ موٹ کی ہمدردی میں چھپانے کی کوشش کرتا۔

ہمارے عاشق مزاج خوش لباس مسعود کی خود غرضی میں ایک فطری اور صحت مند رجحان تھا مگر ادبیات کے اس منطقی طالب علم کی خود غرضی اور کمینگی میں بد خصلتی اور گمراہی کا ہاتھ تھا۔ یہ منطقی میلانات تھے جن کی نشوونما میں خالد کے ماحول اور تربیت سے زیادہ اس کی اپنی طنیت اور جبلت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مسعود کی آوارگی میں ایک تندرست اور مثبت

ذہانت تھی، جیسے مکان کی سب سے اوپر والی کھڑکی جو ہوا کے رخ ہمیشہ کھلی رہے لیکن خالد کی ذہنیت میں ایک منافقانہ جھجک اور اس کی شرافت میں ایک بزدلانہ بناوٹ اور ظاہر داری کا رکھ رکھاؤ تھا۔

وسن پورے والی خالہ کے ہاں جا کر وہ کتنی کتنی دیر بیٹھا رہتا۔ پہلے تو وہ خالہ کے پاس ہی ڈٹا رہتا اور یوں ظاہر کرتا گویا سوائے خالہ کے اسے گھر میں اور کسی سے دلچسپی ہی نہیں ہے پھر اٹھ کر یونہی گھر میں اوپر نیچے چکر لگانے لگتا۔ فرخندہ کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اور اس کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس سے باتیں شروع کر دیتا۔ وہ گرائمر کی کتاب اٹھا کر مشکل مقامات پر نشان لگانے شروع کر دیتا۔ فرخندہ کی پڑھائی کا اسے ایک بڑا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ جتنی دیر تک چاہے فرخندہ سے بات چیت کر سکتا تھا اور کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں شک کرنے والی کوئی بات نہ تھی پھر بھی ہمارے ادبیات کے طالب علم کے دل کا چور اسے ہر قدم پر احساس جرم دلا رہا تھا پھر اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ فرخندہ سے اپنے عشق کا کھلم کھلا اظہار کر دے۔ وہ تو بس ادھر ادھر کی بے معنی باتوں میں ہی وقت گزار کر اپنا جی خوش کر لیتا اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا کہ یہ تو گھر کی مرغی ہے۔ وقت آنے پر کلمہ پڑھ دیں گے آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ حرف مدعا زبان پر لاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ فرخندہ انکار کر دے گی بلکہ اس لئے کہ کہیں اس کی ظاہر داری کی شرافت میں فرق نہ آجائے اور فرخندہ کے سامنے اسکا ضمیر ننگا نہ ہو جائے کیونکہ اس کا ضمیر ایک ایسے خوش پوش آدمی کی طرح تھا جس نے اپنے ہاتھ کے کوڑھ کے داغوں کو خوبصورت دستانوں میں چھپا رکھا ہو۔ فرخندہ کے سامنے وہ بڑا مؤدب اور شائستہ بن کر بیٹھتا۔ بڑی تہذیب کے ساتھ لہجہ نرم اور شیریں بنا کر بات کرتا لیکن اس کے بھرے بھرے جسم کے مدور خطوط کا برابر جائزہ لئے جاتا۔ کمر پر پھنسی ہوئی قمیض کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا۔ سانس کے ساتھ سینے کے ابھار کو اوپر نیچے ہوتے دیکھ کر بار بار خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ربن سے بندھے ہوئے ریشم جیسے بھورے بال دیکھ دیکھ کر گہرے گہرے سانس لیتا۔ کبھی مکھی بن کر فرخندہ کے نرم نرم گال پر جا بیٹھتا۔ اور دونوں ہاتھ ملنے لگتا۔ کبھی بٹن بن کر اس کی پھولدار کرتی کے گریبان سے جا لگتا اور کبھی یہ سوچ کر کہ وہ اس کا خاوند ہے خیال ہی خیال میں اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر

اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیتا۔ خالد کا تصور اس سے وہ سب کچھ کروا دیتا جسے حقیقت میں کرنے کی حسرت اس شخص کے نمائشی خول کے اندر پڑی پڑی سڑ بُس رہی تھی۔

فرخندہ آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ اپنی نظریں جھکا لیتا اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ وہ پہلے سے زیادہ عیار بن کر فرخندہ کے جسم کو ٹٹولنے لگتا۔ گھر میں اس کی آمدورفت پر کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بس ایک شیخ صاحب ضرور چوکنے سے ہوگئے تھے۔ انہیں یہ وہم بھی نہیں تھا کہ خالد ان کی بیٹی سے درپردہ محبت کی پینگیں بڑھانے کی فکر میں ہے۔ انہیں تو صرف اس بات کا فکر لگ گیا تھا کہیں ان کی بیوی اپنے بھانجے کی خاطر داری پر فضول خرچی تو نہیں کر رہی۔ ایک دن جب انہوں نے بلقیس کو چائے کے ساتھ نان خطائیوں کی بھری ہوئی رکابی اوپر لیجاتے دیکھا تو اسے روک لیا۔

"کیوں بیٹی! یہ سب کچھ کس کے لئے ہو رہا ہے؟"

بلقیس اپنے باپ کی فطرت سے پوری طرح واقف تھی جیسے کہ ہر اولاد ہوا کرتی ہے لیکن اس بار وہ صاف پکڑی گئی تھی۔ چارو ناچار اسے یہی کہنا پڑا۔

"اوپر خالد بھائی جان آئے ہوئے ہیں۔ امی نے کہا تھا۔۔۔۔۔"

"تم لوگ ایک نہ ایک دن میرا دیوالہ نکال کر رہو گے"

اتنا کہہ کر شیخ صاحب خود بھی اوپر تشریف لے گئے اور فرخندہ کے کمرے میں خالد، بلقیس، فرخندہ اپنی بہو عذرا اور اسلم کے ساتھ مل کر چائے پی۔ چائے کا تو صرف انہوں نے زیادہ دودھ ڈال کر ایک ہی پیالہ پیا۔ ہاں نان خطائیاں ضرور کوئی آدھی درجن ہضم کر گئے۔ خالد سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اس نے کچھ آڑے وقت کے لئے بچا کر بھی رکھا ہے یا نہیں؟

"بیٹا وقت پر نہ اولاد کام آتی ہے نہ ماں باپ۔ اگر کوئی شے کام آتی ہے تو اپنا پیسہ۔۔۔۔ میری مانو کل ہی اپنے علاقے والے ڈاک گھر جا کر کچھ سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لو۔ ذرا غور کرو پچاس روپوں کے سرٹیفکیٹوں پر شرح سود پندرہ ملے گی اور پھر جوں جوں رقم بڑھے گی سود کی شرح میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہ تو سرکار کے گھر میں اپنا بیٹا پالنے والی بات ہے۔ دودھ پیتا بچہ انہیں دے دو اور پڑھا لکھا کماؤ بیٹا وصول کر لو اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے خالو جان۔ میں کل ہی ڈاک خانے جا کر کم از کم پچاس روپوں

کے سرٹیفکیٹ خریدے لیتا ہوں۔"

"شاباش! بڑے ہونہار ہو۔ ایسے بچے ہی زندگی میں کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے اسلم کو بھی کچھ سمجھاؤ۔ اسے تو سوائے سوٹ بوٹ پہننے کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ کیوں؟ آج تم نے کالج کا کام کیا ہے۔؟"

اسلم جی ہاں "ہمہ کر وہاں سے کھسکنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا خالد نے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور ہاں میں ہاں ملائے جانے سے منٹوں میں ہی شیخ فقیر دین کا اعتماد حاصل کر لیا۔ عذرا اور بلقیس آپس میں نظریں ملا کر خالد کی سادہ لوحی پر مسکرا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ خالد آج پھنس گیا ہے۔ اور جیسا کہ بزرگوں کے سامنے ہوا کرتا ہے وہ جھوٹ موٹ کی ہوں ہاں سے وقت ٹال رہا ہے۔ انھیں اس بات کی خبر نہ تھی کہ خالد ان سب کو بیوقوف بنا رہا تھا اور وہ اپنی نام نہاد سادہ لوحی میں اس قدر مکار اور ہوشیار تھا کہ شیخ صاحب کی ایک ایک بات پر دل سے عمل کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ فرخندہ چائے بنا رہی تھی اس نے ایک پیالی خالد کو دی تو اس نے بڑی تہذیب کے ساتھ کرسی پر سے اٹھ کر پیالی کو لیا۔ اسلم اس دوران میں اٹھ کر باہر جا چکا تھا۔ بلقیس اپنی اور امی کی پیالی لے کر نیچے چلی گئی۔ عذرا کا بچہ باہر گیلری میں رونے لگا۔ وہ اس کے لئے دودھ بنانے چل دی شیخ صاحب نے بڑے زور سے ڈکار لی۔ ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلمہ پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور دکان پر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں اس بات سے بڑی تسلی ہو گئی تھی کہ ان کی محنت کی کمائی سے خریدی ہوئی نان خطائیوں کا زیادہ حصہ ان ہی کے پیٹ میں گیا ہے۔

اب خالد اور فرخندہ کمرے میں تنہا رہ گئے۔ خالد اپنی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں اب جی لگا کر پڑھنا چاہیے فرخندہ۔۔۔۔۔۔ خالو جان کو تمہاری پڑھائی کا بڑا فکر ہے۔

دراصل وہ اس وقت یہ کہنا چاہتا تھا۔ فرخندہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہاری جوانی کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔ لیکن ہر ریاکار آدمی کی طرح دل سے اٹھے ہوئے الفاظ زبان تک تو ویسے ہی آئے مگر ہونٹوں پر آ کر بدل گئے۔ فرخندہ نے سر جھکا لیا۔

"میں نے تو بڑی محنت کی تھی بھائی جان! بس گرائمر میں آ کر رہ گئی۔"

خالد نے کہنا چاہا۔ مجھے بھی اپنے پاس رکھ لو فرخندہ! میں تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔"

لیکن اس کے ہونٹوں نے کہا۔

"گرائمر کا کیا ہے؟ وہ تمہیں میں آ کر پڑھا دیا کروں گا۔ تم اس کا فکر نہ کرو۔"

"شکریہ ---- اب تو ایک ماسٹر صاحب کا انتظام ہو گیا ہے۔ اکبر بھائی جان اسے کل شام اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔"

"کون ہے وہ؟"

خالد نے ہونٹوں کو سکیڑ کر پوچھا۔

"یہیں کہیں کسی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ کافی عمر کے ہیں۔"

خالد مطمئن سا ہو گیا۔ اس خیال سے اس کا دل بیٹھ گیا تھا کہ کہیں فرخندہ کو دن میں دو تین گھنٹے پڑھانے والا ماسٹر اس سے زیادہ خوب صورت اور صحت مند نہ ہو۔ اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور چائے کا گرم گرم گھونٹ پی کر فرخندہ کے بھرے بھرے ہونٹوں کو حریص نگاہوں سے دیکھنے لگا جو چائے پینے کے بعد بڑے چمکیلے اور رس بھرے ہو رہے تھے اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ اٹھ کر انہیں چوم لے۔ وہ اٹھا اور اتنا کہہ کر چل دیا۔

"کافی دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیے۔"

اگلے روز اکبر دفتر سے لوٹتے ہوئے ماسٹر صاحب کو ساتھ ہی لیتا آیا۔

اخیر سردیوں کی گلابی سی سہ پہر تھی اور وسن پورے کے گلی کوچوں میں ہلکی ہلکی گرد اڑ رہی تھی۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی آنگن والی بیری میں طوطے شور مچا رہے تھے۔ فرخندہ اپنے کمرے کی چٹخنی لگا کر کاغذ قلم نکال کر پلنگ پر مسعود کو خط لکھنے بیٹھی ہی تھی کہ بلقیس نے دروازے پر دستک دی فرخندہ نے جلدی سے کاغذ قلم میز کی دراز میں چھپا دیا۔

"کون ہے؟"

"اری تو اندر کیا کر رہی ہے؟"

"کپڑے بدل رہی ہوں باجی۔"

"کپڑے بدل کر نیچے آ جانا۔ ماسٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

فرخندہ اندر ہی اندر جل گئی۔ ماسٹر صاحب اس کے محبوب کی جدائی کی بڑی نمایاں علامت تھی اب یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ کالج پھر کبھی نہ جا سکے گی اور مسعود سے آزادانہ ملاقات نہ کر سکے گی۔ اسے پہلے ہی روز اپنے ماسٹر صاحب سے نفرت ہو گئی اور اس نے دل

میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کا یاد کروایا ہوا سبق کبھی یاد نہ رکھے گی۔ اور یوں انہیں اس حد تک تنگ کرے گی کہ وہ ایک دن اپنے آپ ہی ٹیوشن چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ محض بات رکھنے کے لئے فرخندہ نے قمیض بدلی اوپر پوری آستینوں والا اسبز سوئیٹر پہنا اور ماسٹر صاحب سے ملنے نیچے دیوان خانے میں آ گئی۔

سامنے کی طرف کھڑکی والے صوفے پر فرخندہ کا باپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا ساتھ ہی اس کی امی دوپٹے کی دوہری بکل سے سر ڈھانپے بیٹھی تھیں۔ اکبر انگیٹھی کے نیچے والے صوفے پر بیٹھا رومال سے عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ اس کے پاس ہی تپائی والے صوفے پر ماسٹر صاحب تشریف فرما تھے۔ فرخندہ نے ماسٹر صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سلام کر کے بڑی سگھڑ بیبیوں کی طرح امی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ فرخندہ کے باپ شیخ صاحب نے بڑی انکساری سے کہا۔

"میری بچی فرخندہ۔"

ماسٹر صاحب صوفے پر بیٹھے ہی بیٹھے تعظیماً تھوڑے سے آگے کو جھکے اور اپنے دونوں ہاتھ پرانے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے ایک جیب میں خاکی رنگ کا پھٹا ہوا رومال تھا اور دوسری جیب میں ایک ماچس اور تین آنے والی سگریٹ کی ڈبیا۔ جیب کے اندر ہی اندر انہوں نے رومال مٹھی میں لیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ماچس پر پھیرنے لگے۔ فرخندہ نے کنکھیوں سے ماسٹر صاحب کو دیکھا میلی سی کمانی دار عینک کے پیچھے گھٹی گھٹی افسردہ آنکھیں، سر کے بال خشک اور اڑے اڑے سے، کچھ سفید، کچھ کالے، دبلا جسم ذرا آگے کو جھکا ہوا۔ مٹیالی گرم قمیض کے بٹن گردن تک بند کئے ہوئے۔ ادھڑا ہوا گلوبند یونہی گردن میں پڑا ہوا ------ ادھیڑ عمر کا ایک پھیکا پھیکا سر، چپ چاپ سا بے رنگ سا آدمی۔ فرخندہ کو ماسٹر صاحب پر ایک ایسے سائن بورڈ کا گمان ہونے لگا جس کی تحریر بارش اور دھوپ کی وجہ سے مٹ گئی ہو۔ اکبر نے چمچ سے چینی ملاتے ہوئے چائے کی پیالی ماسٹر صاحب کو دی اور کہنے لگا۔

"دیکھئے نا۔ ویسے تو یہ سارے مضمونوں میں ہوشیار ہے بس ایک گرائمر کی کسر ہے آپ ذرا گرائمر کا زیادہ خیال رکھیں۔"

ون اردو ڈاٹ کام

ماسٹر صاحب نے ایک بسکٹ اٹھا کر چائے میں ڈبویا اور بولے۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔ میں پہلے گرائمر ہی پڑھاؤں گا۔"

اس کے بعد ماسٹر صاحب بالکل بچوں کی طرح چائے میں بسکٹ بھگو بھگو کر کھانے لگے۔ شیخ فقیر دین نے بھی بسکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ انہیں اس بات کی بڑی تسلی ہو گئی تھی کہ چالیس روپے ماہوار پر ایک غریب ٹیوٹر مل گیا ہے۔ جو فرخندہ کو ایک سال میں تیار کر کے اسے امتحان پاس کروا دے گا۔ شیخ صاحب کو اگر اپنی دھن دولت کا خیال رہتا تھا تو انہیں اپنی بچی کے مستقبل کا بھی بڑا فکر تھا۔ خاص طور پر بلقیس کی ازدواجی زندگی کے المیے نے انہیں دوسری اولاد کے بارے میں چوکنا کر دیا تھا۔ وہ فرخندہ کو اتنی تعلیم ضرور دلوانا چاہتے تھے جس کی مدد سے وہ وقت پڑنے پر کہیں ملازمت کر کے خود کفیل ہوسکے۔ انہیں نہ تو یہ بات پسند تھی کہ ان کی بچیاں مصیبت میں بے سہارا رہ جائیں اور نہ ہی گوارا تھا کہ وہ شیخ صاحب پر اپنا سارا بوجھ ڈال دیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح کی سودے بازی ہی تھی جس پر اولاد کی محبت کی چھاپ لگی تھی۔

طے یہ پایا کہ ماسٹر صاحب ہر روز تیسرے پہر آ کر فرخندہ کو دو گھنٹے کے لئے پڑھا جایا کریں گے۔ اکبر ماسٹر صاحب کو رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ فرخندہ اپنے کمرے میں جا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ گلی میں جو ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی وہ درختوں کے گرے پڑے خشک پتوں کو ادھر ادھر اڑا رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی لالی سامنے والے مکانوں پر پڑ رہی تھی۔ جس کی چمک سے گلی میں گلابی روشنی کا غبار چھا گیا تھا۔ ماسٹر صاحب پرانے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے پتوں کی ٹہنیوں والے درختوں کے نیچے سے گذر کر بائیں طرف کو مڑ گئے۔ میل خوری فلالین کی پتلون، پرانا سا لمبا کوٹ جس کے سارے بٹن کھلے تھے۔ اڑے اڑے خشک بال، ادھڑا ہوا گلوبند، ایک طرف کو جھکا دبلا پتلا جسم، غیر متوازن اور غیر ہموار چال۔ جیسے آدمی ڈولتے ہوئے جہاز کے عرشے پر چہل قدمی کی کوشش کر رہا ہو۔ فرخندہ کو ماسٹر صاحب نے کسی طرح بھی متاثر نہ کیا۔ اس خیال سے کوفت ہونے لگی کہ اسے ہر روز دو گھنٹے اس انتہائی خشک اور بور آدمی کے پاس بیٹھنا پڑے گا۔

دن ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور شفق کی روشنی شام کی سیاہی میں گھل مل رہی تھی کھیتوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی تھی اور مکانوں کی چھتوں پر دھواں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ فرخندہ کا جی ایک دم اداس ہو گیا۔ اسے مسعود کا خیال آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھا بجلی کی روشنی میں گرم گرم کافی اڑا رہا ہو گا اور گرم جوشی سے دلچسپ باتیں کر رہا ہو گا۔ یا خدا کیا تو نے دنیا جہان کی اداسی صرف عورت ہی کے پلے ڈال دی ہے؟ فرخندہ نے کھڑکی بند کر دی۔ پردہ پھیلا دیا۔ وہ لکھنے کی میز کے دراز میں سے کاغذ قلم لے کر مسعود کو پریم پتر لکھنے بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے کونے میں "لاہور" ہی لکھا تھا کہ نیچے سے امی نے آواز دی۔

"فرخی! ذرا نیچے آ کر چاول تو چن دو۔"

فرخندہ نے کاغذ پھاڑ کر کونے میں پھینکا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ ماسٹر صاحب جب شام کے دھندلکے میں ڈوبی ہوئی وسن پورے کی کچی پکی گلیوں سے نکل کر بازار میں آئے تو یہاں سردی زیادہ تھی۔ انہوں نے کوٹ کے بٹن بند کر لئے۔ چوک میں آ کر وہ بس میں سوار ہوئے اور دہلی دروازے کے باہر اتر پڑے۔ وہ سنہری مسجد کے پہلو والی گلی کے ایک تنگ سے ڈربہ نما مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ اس مکان میں صرف دو ہی کمرے تھے۔ دیواریں بوسیدہ تھیں اور کوٹھے کی مٹی ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں والے دروازے کی چوکھٹ ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اوپر والی منزل کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب کوئی بیس ایک سال سے اس مکان میں رہتے آ رہے تھے پہلے پہل اس کا کرایہ بڑھا کر بیس روپے کر دیا تھا۔ مکان میں بجلی تو موجود تھی لیکن پانی کا نل نہیں تھا۔ بہشتی صبح و شام پانی بھرنے آیا کرتا۔ ماسٹر صاحب کی عمر اس وقت کوئی پینتالیس کے قریب ہو گی۔ ان کی زندگی کی داستان ان کی باتوں کی طرح روکھی پھیکی اور بالکل سپاٹ تھی۔ آپ سیالکوٹ میں ضلع کچہری کے ایک اشٹام فروش کے ہاں پیدا ہوئے۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ پیدا ہونے کے دو سال بعد ماں کا انتقال ہو گیا۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ والد صاحب بھی دو روز درد گردہ میں مبتلا رہ کر خدا کو پیارے ہو گئے۔ لاہور میں کچھ رشتہ دار مقیم تھے۔ ماسٹر صاحب ان کے ہاں آ کر رہنے لگے۔ پڑھائی کا سلسلہ تو ضرور جاری ہو گیا مگر اس کے لئے انہیں گھر میں صبح و شام نوکروں کی طرح کام کرنا پڑتا۔ بڑی دقتوں کے بعد میٹرک پاس کیا اور کارپوریشن کے دفتر میں پچاس روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ رشتہ داروں کا گھر چھوڑ کر سنہری مسجد کے ساتھ والی گلی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور وہیں رہنے لگے۔ میٹرک کے بعد گھر پر ادیب فاضل کی تیاری شروع کر دی۔ ادیب فاضل کا امتحان امتیازی نمبر لے کر

پاس کیا اور اگلے برس ایف اے بھی کر لیا۔ بی اے کی تیاری کر رہے تھے کہ میعادی بخار کا حملہ ہوا اور نتیجے میں سر درد کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پڑھنے سے منع کر دیا۔ دو تین سال کے علاج کے بعد سر درد تو دور ہو گیا مگر بینائی بہت کمزور ہو گئی۔ محلے میں کچھ بااثر لوگوں نے مل ملا کر ایک پرائیویٹ اسکول کی بنیاد رکھی تو آپ نے کارپوریشن کی نوکری سے استعفے دے دیا اور وہاں سکول ٹیچر ہو گئے۔ دل میں یہ خیال لئے ہوئے کہ اس طرح دفتر کی خشک اور اکتا دینے والی فائلوں کے بوجھ سے چھٹکارا بھی مل جائے گا اور کچھ آگے پڑھائی جاری رکھنے کا سلسلہ بھی بن جائے گا۔ چنانچہ آپ نے سکول میں بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ رات کو بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ ایک سال فیل ہونے کے بعد دوسرے سال ماسٹر صاحب نے تیسرے درجے میں بی اے پاس کر لیا اور اسکول میں چوتھی جماعت کے لڑکوں سے نکل کر آٹھویں جماعت کے لڑکوں کو پڑھانا شروع کر دیا کچھ تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کا ارادہ اب بی ٹی کرنے کا تھا کیونکہ اس طرح وہ اسکول میں سیکنڈ ماسٹر کا عہدہ حاصل کر سکتے تھے لیکن اس دوران میں اسکول کے مالکان اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے مل ملا کر ایک ایسی لڑکی سے ماسٹر صاحب کی شادی رچا دی جس کے ماں باپ لاہور سے سری نگر جاتے ہوئے بس کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ لڑکی لاغر اور دبلی پتلی تھی اور اندر ہی اندر دمے کا عارضہ لے کر ماسٹر صاحب کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پہلے ہی روز ایسے ایسا دورہ پڑا کہ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ دانت جڑ گئے اور منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا اس نے ٹیکہ لگایا۔ دس روپے فیس لی اور بیس روپے کا نسخہ لکھ دیا۔ مرض کی تشخیص ہسٹیریا ہوئی۔ رنگ محل والے حکیم بیجناتھ نے کہا۔

"کہیں بیاہتا استریوں کو بھی ہسٹیریا ہوا ہے؟ یہ تو مرگی ہے۔"

بہر حال علاج دونوں امراض کا شروع ہو گیا اور ماسٹر صاحب کی دونوں جیبوں سے پیسے نکلنا شروع ہو گئے۔ انہیں بی ٹی کی تیاری بھول گئی اور بی بی کی تیمارداری شروع کر دی جو کماتے اس نیک بخت کے علاج پر صرف کر دیتے۔ یہ نیک بخت بھی بیماریوں کی پوٹ ہی تھی۔ معدہ تو سدا کا روگی تھا جس دن مکسچر نہ پیتی روٹی ہضم نہ ہوتی۔ گلی میں پٹاخہ چلتا تو اسے غش آجاتا۔ کوئی اچانک دروازہ کھول دیتا تو یہ کلیجہ پکڑ کر ہائے وائے کرنے لگتی۔ زیادہ غصہ آجاتا تو سارے بدن پر رعشہ طاری ہو جاتا۔ مہینے میں پندرہ دن سر پر پٹی بندھی رہتی اور کمر پر

ہاتھ رکھ کر چلتی اور کچھ نہ ہوتا تو نکسیر ہی پھوٹ بہتی۔ صحت پہلے ہی کمزور تھی اس پر طرح طرح کی بیماریوں نے اسے شادی کے پانچ سال بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔ ہسٹریا اور مرگی نے باہم مل کر دمے کے مرض کو جنم دے دیا۔ اب جو راتوں کو کھانسی کا دورہ پڑتا تو ایسے لگتا کہ ابھی دم نکلا کہ نکلا۔ بے چارے ماسٹر صاحب کی جان عذاب میں آگئی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ نیک بخت بانجھ نکلی نہیں تو بیماریوں کے ہجوم میں اولاد کی لین ڈوری ماسٹر صاحب کا کچومر ہی نکال دیتی۔ ویسے اب بھی ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ماسٹر صاحب طبیعت کے بڑے نرم اور دھیمے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔ دوستوں کی بے اعتنائی رشتہ داروں کے مظالم اور دنیا داروں کی خود غرضی کو صرف دیکھا ہی نہ تھا اپنے اوپر سہا بھی تھا۔ زمانے کی چکی میں وہ زندگی کی تمام اذیتوں، دکھوں، پریشانیوں، پچھتاووں اور بیماریوں کے ساتھ پسے تھے۔ چنانچہ اب ان کے اندر ایک بے جان سی قناعت پسندی اپنے آپ تقدیر پرستی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اطاعت گذاری اور ملال انگیز سی بے نیازی پیدا ہو گئی تھی۔ زندگی کے کھرے کھرے اقتصادی بدحالی اور معاشی جدوجہد کے کٹھن تجربات نے انہیں صابر اور ہر حال میں خوش رہنے والا بنا دیا تھا۔

بچپن ہی سے وہ خاموش طبع اور شرمیلے تھے۔ نہ تو ان میں اپنے فیصلے پر ڈٹے رہنے کی قوت تھی اور نہ ارادے کی پختگی تھی اگر انہیں مالی پریشانیوں کا عفریت سامنے دکھائی نہ دیتا تو کبھی ایف اے اور بی اے پاس نہ کرتے۔ رشتہ داروں کی نوکری اور حکم برداری نے ان سے خود اعتمادی چھین لی تھی۔ وہ ہر بات کو فیصلے کی حد تک پہنچا کر دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے۔ پھر دوسرا جو فیصلہ کرتا آپ اس پر بلا توقف عمل در آمد شروع کر دیتے۔ ماسٹر صاحب کچھ بے وقوف بھی تھے۔ ان معنوں میں کہ انہیں محفل میں بیٹھ کر پوری ذمہ داری سے بات کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ یا ہم اسے اس طرح بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک زندگی میں کوئی بات بھی اتنی اہم نہ تھی کہ اس پر ذمہ داری سے سر جوڑ کر چہرہ سنجیدہ بنا کر گفتگو کی جائے ان کے خیال میں طلاق کا مسئلہ بھی ایسا ہی بچگانہ اور معمولی تھا جیسا کسی بچے کو ایک اسکول سے اٹھوا کر دوسرے اسکول میں داخل کروانے کا مسئلہ۔ یہی وجہ تھی کہ محلے میں ان کی شرافت کی تو ضرور دھوم تھی مگر کسی شخص نے ان سے آج تک کسی معاملے میں کوئی رائے نہ لی تھی۔ محلے کا چوہدری یا دوسرے بااثر لوگ ماسٹر صاحب سے بڑی خندہ پیشانی سے گفتگو

کیا کرتے لیکن انہیں ہر لمحے اپنے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا احساس رہتا۔ گویا ایک طرح سے یہ لوگ ماسٹر صاحب سے منافقانہ خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ ملتے تھے اوپر سے وہ بڑی محبت سے ہاتھ ملاتے۔ مگر دل میں یہ کہہ رہے ہوتے۔ "کس بیوقوف سے صبح صبح سابقہ پڑ گیا۔ اب تو اس سے دو چار باتیں کرنی ہی پڑیں گی۔"

اس کے برعکس ہمارے ماسٹر صاحب اپنے ہر معاملے میں دوسروں کی رائے لے لیا کرتے۔ جہاں اور لوگ اپنے ہزاروں روپ بناوٹی نقابوں میں چھپا کر بڑی پرفن ریاکاری سے ایک دوسرے سے ملتے وہاں ماسٹر صاحب اپنے ایک ہی روپ میں آدمی سے ہاتھ ملاتے اور تھوڑی دیر بعد بھول جاتے کہ انہوں نے کس سے کیا بات کی ہے اور کب کی ہے۔ ان کی مثال تو اندھے بھکاری کی طرح تھی جس کو خیرات میں کھوٹے سکے مل رہے ہوں اور جو انہیں خوش ہو ہو کر کبھی اس جیب میں ڈال رہا ہو کبھی اس جیب میں۔ ماسٹر صاحب کا ظاہر باطن اس لئے ایک نہیں تھا کہ وہ اسے اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے بلکہ محض اس لئے تھا کہ انہیں اپنا باطن چھپانا ہی نہیں آتا تھا۔ ہر برا بھلا جذبہ ان کے دل میں پیدا ہوتے ہی چہرے پر آجاتا جس طرح کمرے میں بتی جلنے سے روشندانوں کے شیشے اپنے آپ روشن ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر محلے میں ایسے لوگوں کی وافر تعداد مل جائے گی۔ جو محض اپنی ذاتی آسائش اپنی سماجی حیثیت کی ہر قیمت پر برقراری اور گھریلو خوش وقتی اور تن آسانی کے لئے زندہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے گھروں کی چار دیواریاں اس لئے کھڑی نہیں کیں کہ وہ انسان کو ایک بہتر اور خوب صورت خاندانی ماحول دے سکیں۔ بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے ڈربے انہوں نے محض اس لئے کھڑے کر رکھے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کی آفتوں دکھوں اور بیماریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ ساتھ والے گھر میں چور گھس آئے تو یہ اپنے دروازے بند کرنے لگتے ہیں۔ کسی کنبے کو روٹی نہیں ملتی تو یہ کئی کئی مہینوں کے لئے اپنے کنبے کی روٹیوں کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ گلی میں کوئی قتل ہوجائے تو یہ قاتل کو پکڑنے کی بجائے دھڑا دھڑ دکانیں بند کر کے گھروں میں آن گھستے ہیں اور بیوی بچوں کو ارد گرد بٹھا کر دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ یااللہ مقدمے میں گواہی نہ دینی پڑ جائے، محلے میں کوئی پاگل آجائے تو یہ اسے ادھ موا کر کے وہاں سے رخصت کرتے ہیں۔ کسی کی ترقی ہوجائے تو انہیں مہینوں بات کرنے کے لئے ایک مزیدار موضوع ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ لوگ غریب کو باسی اور بچا ہوا کھانا

کھلاتے ہیں۔ خیرات کرتے ہوئے بھکاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں گے۔ ان کے گناہ غسل خانوں کے سیلے کونوں میں گندے چیتھڑوں کے ڈھیروں تلے چپکے ہی چپکے پرورش پاتے ہیں اور نیکیاں مرغ بن کر صبح سے شام تک چھتوں کی منڈیروں پر اذانیں دیا کرتی ہیں۔ یہ شریف لوگ شراب نہیں پیتے۔ زنا کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں مگر شرابیوں اور زانیوں کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ یہ اپنی عورتوں کو سات پردوں میں چھپا چھپا کر رکھتے ہیں لیکن دوسری عورتوں کا پردہ فاش کرنے میں ذرا بھی حیا سے کام نہیں لیتے۔ ان کی ہولناک نظریں تو برقعے کے اندر گوشت تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خدا سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ اس کی دوستی کے اہل نہیں۔ حقیقت میں یہ بڑے ہی پتھر دل، بزدل، بے رس، خود غرض، پرفریب، اور مکار لوگ ہوتے ہیں جنہیں محض دکھاوے کی پارسائی کی بدہضمی ہوتی ہے۔ اور جو یہاں وہاں مردہ دل، بیمار شرافت کی کھٹی ڈکاریں لیتے پھرتے ہیں۔ اب اگر ہم ٹھنڈے دل سے سوچیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جس چار دیواری کو ہم کبھی گوشۂ عافیت اور کبھی گھر پیارے گھر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہاں ہماری آنے والی نسلوں کو ریاکاری مطلب پرستی مقصد براری خود غرضی اور ایک بڑی ہی دل آزار قسم کی حیوانی نفس پرستی کے سوا کسی چیز کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

ہمارے ماسٹر صاحب بھی اس قسم کے دنیادار شریف زادوں میں عرصہ بیس سال رہے تھے۔ مگر انہیں ان لوگوں میں رہنا ابھی تک نہ آیا تھا۔ وہ ابھی تک ایسے طور طریقے نہ اپنا سکے تھے جو انہیں ذمے دار مدبر اور بااثر لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیتے۔ انہیں تو اس بات کا بھی شعور نہ تھا کہ جب محلے میں کبھی کارپوریشن کا کوئی افسر یا کوئی پارلیمنٹ کا رکن آئے تو اس سے بات کرتے کہاں تھوڑا سا مسکرانا ہے کہاں پوری باچھیں کھول دینا ہے اور کہاں چہرے کو ایک دم سنجیدہ بنا کر انتہائی غوروفکر کی علامات کو ظاہر کرنا ہے۔ وہ تو ہر ایک چہرے پر ایک دردناک سی عاجزانہ مسکراہٹ لے کر ملتے اور دوسرے کی بات کو پوری طرح سمجھے بغیر ہی اسکی ہاں میں ہاں ملائے چلے جاتے۔ پھر جب تک دوسرا ہاتھ ملا کر رخصت نہ ہوتا یہ وہاں سے بالکل نہ ہلتے۔ محض اس خیال سے کہ کہیں پہلے اجازت مانگ لینے سے دوسرے شخص کی سبکی نہ ہوجائے۔ محلے کے سفید پوش عزت دار ماسٹر صاحب کو محلے سے باہر ملتے ہوئے کترایا کرتے۔ ایک تو انہیں ماسٹر صاحب کی ہر وقت کی احمقوں والی

مسکراہٹ سے چڑ تھی۔ دوسرے ماسٹر صاحب کا ڈھیلا ڈھالا بے تکا لباس درمیان میں حائل ہوجاتا کیونکہ اکثر ادھیڑ عمر کے سفید پوش حضرات کو محلے سے باہر نکل کر حفظ مراتب کا بڑا خیال رہتا ہے۔ ایک بار جب گلی میں بجلی کے نئے کھمبے لگوانے کے سلسلے میں محلے والوں کا ایک وفد بجلی گھر کے افسر اعلیٰ سے ملنے کے لئے جانے لگا تو ماسٹر صاحب بھی یوں ہی بن بلائے ساتھ ہولئے۔ اس خیال سے کہ محلے کا کام ہے انہیں بھی شامل ہوجانا چاہیئے۔ ماسٹر صاحب نے اپنا وہی پرانا لمبا کوٹ، میل خوری فلالین کی پتلون اور چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ جن پردن بھر کا گرد جما تھا۔ دوسرے لوگ دھلی دھلائی اچکنوں، پالش سے چمکائے ہوئے جوتوں اور سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلواروں میں ملبوس تھے۔ ہر آدمی کو ماسٹر صاحب کی موجودگی کھلنے لگی۔ لیکن ہر آدمی ردعمل کے طور پر پہلے سے بھی زیادہ خندہ پیشانی سے ماسٹر صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن باتیں کرتے ہوئے وہ استہزائیہ انداز میں ایک دوسرے سے چشمک زنی بھی کرتے جاتے۔ آخر محلے کے چوہدری نے ماسٹر صاحب کو یہ کہہ کر واپس کردیا کہ وہ گلی میں سے حافظ فضل دین وثیقہ نویس کو ساتھ لے کر بجلی گھر پہنچ جائیں (حالانکہ حافظ فضل دین وثیقہ نویس چوہدری صاحب کی ہدایت پر پہلے ہی سے بجلی گھر کے دفتر میں وفد کا انتظار کر رہا تھا) لیکن ماسٹر صاحب ویسی ہی دلچسپی اور لگن کے ساتھ واپس محلے کی جانب چل پڑے اور شام کو جب وفد آیا تو ماسٹر صاحب ابھی تک حافظ صاحب کو تلاش کر رہے تھے۔

ماسٹر صاحب ویسے تو ہر حالت میں مطمئن اور خوش و خرم رہنے کے عادی تھے لیکن شادی سے پہلے خاص طور پر ان کی روزمرہ کی زندگی بڑی خوشگوار میانہ روی سے گذر رہی تھی۔ نچلی منزل والی کوٹھڑی میں ایک چارپائی پر ان کا بستر بچھا رہتا۔ دیوار گیر الماری میں نصاب کی پرانی کتابیں اور سگریٹ کی خالی ڈبیا پڑی تھیں۔ پرانے طرز کی کارنس پر کڑوے تیل کی بوتل صابن دانی اور چورن اور معجون کی شیشیاں پڑی رہتیں۔ چارپائی کے قریب ہی تپائی پر درسی کتابوں کے علاوہ تام چینی کی ایک نیلی چائے کی چینک رکھی ہوتی جس کا روغن اکھڑ چکا تھا اور پیندا سیاہ پڑ گیا تھا۔ ماسٹر صاحب دونوں وقت کا کھانا باہر کھاتے اور گھر میں صرف صبح یا شام کی چائے ہی بناتے۔ چائے سے بھری ہوئی تام چینی کی چینک تپائی پر رکھ کر وہ بستر میں گھس جاتے۔ چائے پیالی میں ڈال کر مزے لے لے کر پیتے اور ساتھ ہی ساتھ کسی

کتاب کی ورق گردانی بھی کرتے جاتے۔ چھت کے درمیان لٹکی ہوئی بجلی کی بتی کو انہوں نے ستلی سے باندھ کر چارپائی کے عین اوپر کرلیا تھا جس کی وجہ سے روشنی کتاب پر ٹھیک پڑتی۔ دن میں سگریٹ بمشکل ایک پیکٹ پیتے۔ پان کبھی کبھی شام کو کھا لیتے سینما دیکھنے کا انہیں بالکل ہی شوق نہیں تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار اگر کبھی ان کے اسکول کے ساتھی اساتذہ پکڑ کر لے بھی جاتے تو انہیں وہاں بیٹھے بیٹھے نیند آجاتی۔ عشق و محبت ان کے بس کا روگ نہیں تھا لڑکیوں سے ان کا واسطہ صرف اپنے اس رشتہ دار کے گھر میں پڑا تھا جہاں ان کی حیثیت محض ایک ملازم کی سی تھی۔ یہ لڑکیاں ہمیشہ ان سے سودا سلف منگوایا کرتیں یا ان سے ٹھٹھے بازی کیا کرتیں۔ اس طرح ہمارے اس وقت کے نوعمر ماسٹر صاحب ہر گھڑی کمتری کے گھیرے اور شدید احساس میں متبلا رہتے، اور جوان ہوکر بھی انہوں نے کسی لڑکی سے کھل کر بات نہ کی۔ لڑکی کے سامنے آتے ہی وہ کچھ جھینپ سے جاتے اور اپنے آپ کو اس سے کمتر محسوس کرنے لگتے۔ یہ خیال تو ان کے دل میں پتھر کی لکیر بن چکا تھا کہ کوئی لڑکی ان سے محبت نہیں کرسکتی۔ پھر بھی وہ اپنے حال میں مست تھے اور عشق و محبت کے خواب دیکھ دیکھ کر ہی اپنے جذبات کی تسکین کرلیا کرتے۔

لیکن شادی کے بعد ان کی زندگی میں کچھ ایسی کھلبلی مچی کہ وہ بوکھلا اٹھے جیسے کھڑکی کا پٹ کھلنے سے اچانک ہوا کا ریلہ کمرے میں آجائے اور میز پر ترتیب سے رکھے ہوئے کاغذات فرش پر یہاں وہاں بکھر جائیں۔ ماسٹر صاحب عینک سنبھالتے کبھی اس کاغذ کو پکڑتے کبھی اس کاغذ کو اٹھاتے کمرے میں چاروں طرف چکر کھانے لگے۔ لیکن کھڑکیوں کے پٹ ایک ایک کرکے کھلتے چلے گئے اور پھر اس زور کا طوفان آیا کہ ماسٹر صاحب کو کسی شے کا ہوش نہ رہا۔ وہ ایک چیز کو سنبھالتے تو دوسری ان کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

بدمزاج، چڑچڑی اور بیماریوں کی پٹاری بیوی نے گھر میں آتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے حملہ کیا وہ اس چھوٹی سی غریبانہ کوٹھڑی کا سکون تھا۔ ماسٹر صاحب دن بھر اسکول میں سر کھپائی کرتے اور شام کو ہومیوپیتھی کے ڈاکٹروں اور حکیموں کی دکانوں کے چکر لگانا شروع کردیتے۔ پہلی اور دوسری منزل کی دونوں کوٹھڑیوں میں جگہ جگہ معجون کی ڈبیاں، نمکیات کی شیشیاں، سفوف کی پڑیاں اور خواب آور گولیوں کی بوتلیں دکھائی دینے لگیں۔ ماسٹر صاحب کی کتابیں الماری سے نکال کر ان کی چارپائی کے نیچے ڈھیر کردی گئیں، اور

الماری میں بیوی نے اپنی پرانی جوتیاں، کپڑے اور دوائی کی لمبوتری اور چوڑی چوڑی خالی بوتلیں بھر دیں۔ اور ماسٹر صاحب نے دبی زبان میں ذرا سا احتجاج کیا تو بدلگام بیوی نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ ماسٹر صاحب چپکے ہو کر مسکرانے لگے۔ ان کی عاجزانہ مسکراہٹ میں پہلی بار اذیت کی ایک گہری، بے معلوم اور دکھی لہر نے جنم لیا۔

وہ دن بھر کے تھکے ماندے گھر میں داخل ہوتے تو بدصورت لاغر بیوی اپنے کسی نہ کسی پرانے مرض کا رونا لے بیٹھتی۔ کبھی کمر پر ہاتھ لے جا کر کہتی۔

"آج پھر یہاں درد ہو رہا ہے۔ ذرا حکیم صاحب سے تیل تو لیتے آؤ۔"

کبھی آدھے سر کے شدید درد میں مبتلا بستر پر لیٹی تڑپ رہی ہوتی۔ پھر وہ اپنے خاوند سے سر دبواتی اور کس کر پٹی بندھواتی اور کہتی۔

"اس درد میں بھلا کھانا پکانا کیسے کرتی؟ میں کہتی ہوں آج تنور سے روٹیاں لے آؤ۔ آخر تم کھڑے کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟"

اور ماسٹر صاحب رومال اور چنگیر اٹھا تنور سے روٹیاں لینے چلے دیتے جب وہ سیڑھیوں میں ہوتے تو بیوی کی کمزور آواز آتی۔

"واپسی پر مہر جی سے میرے لئے سنگترے ضرور لائیو۔"

ہر وقت کی مریض بیوی خوب ڈٹ کر کھانا کھاتی۔ پھر سنگترے چھیل چھیل کر ان پر نمک سلیمانی چھڑک کر ہضم کرتی اور کانوں میں بادام روغن ڈال کر سو جاتی۔ بیوی کو اچھی طرح سلا کر ماسٹر صاحب باورچی خانے میں جا کر اپنے لئے چائے بناتے اور جب چائے سے بھری ہوئی تام چینی کی چینک لئے دبے پاؤں نچلی منزل میں آنے لگتے تو سوئی بیوی کی آنکھ کھل جاتی۔

"کیا مجھے ایک پیالی چائے بھی نہ پلاؤ گے؟"

ماسٹر صاحب کو زندگی میں پہلی بار ایک عورت سے سابقہ پڑا تھا اور انہوں نے اس عورت کو بغیر کسی گلے شکوے کے قبول کر لیا تھا جیسے یہ ایک قدرتی بات ہو، جیسے ہر عورت اپنے خاوند سے ایسا ہی سلوک کرتی چلی آئی ہو۔ ماسٹر صاحب نے بیوی کے مل جانے پر نہ تو کبھی خدا کا شکر کیا تھا اور نہ کبھی اس کی بدمزاجی، بیماری اور چڑچڑے پن کی شکایت ہی کی تھی۔ ہاں کبھی کبھی انہیں اس بات کا احساس ضرور ہوتا تھا کہ اب ان کی کوٹھڑی میں وہ پہلے

ازدواجی زندگی کے چھ سات سال گذر جانے پر بھی جب ماسٹر صاحب کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تو لوگوں نے انہیں اولاد کی ضرورت کا احساس دلانا شروع کیا۔ اب ماسٹر صاحب کو بھی خیال آیا کہ گھر میں ایک بچہ ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کی بیوی بانجھ ہے اور بچہ کبھی جن ہی نہیں سکتی۔ ماسٹر صاحب نے اس انکشاف کے ساتھ ہی اولاد کا خیال چھوڑ دیا۔ لوگوں نے کہا "دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر تمہاری نسل کیسے چلے گی؟" ماسٹر صاحب سر کھجانے لگے۔ دوسری شادی سے کیا ہو گا؟ اور پھر اپنی نسل چلا کر کیا کر لوں گا؟ اسکول میں جتنے بچے پڑھتے ہیں۔ آخر اپنے ہی تو ہیں۔ یہاں بھی ان کی فطری قناعت پسندی، گوشہ گیری اور ہر حال میں مطمئن رہنے کی عادت آڑے آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے شادی نہ تو بچے پیدا کرنے کے لئے کی تھی اور نہ ہی اپنی مردانہ زندگی کی تنہائیوں کے علاج کی خاطر کی تھی۔ بس یہ شادی تو ہو گئی تھی۔ محلے والوں نے کہا لڑکی یتیم ہے تم اسے اپنے گھر بسا لو۔ ماسٹر صاحب نے ہاں کہہ دی اور شادی ہو گئی۔

آج اس شادی کو بیس سال ہو گذرے ہیں۔

ماسٹر صاحب کے بالوں میں سفیدی آ گئی ہے اور وہ خشک ہو کر اڑنے لگے ہیں۔ وقت نے دبلے چہرے پر چھوٹے چھوٹے بے خیالی میں اٹھائے ہوئے دکھوں کی لکیریں کھینچ دی ہیں۔ زیادہ دیر خاموش بیٹھے رہیں تو نچلا ہونٹ ایک طرف لٹک جاتا ہے۔ اور گھٹی گھٹی آنکھوں میں بڑی رقت آمیز ویرانی جھلکنے لگتی ہے۔ چہرے پر ایک عاجزانہ سی مسکراہٹ سدا رہتی ہے۔ اس مسکراہٹ میں نہ انبساط ہے نہ طنز۔۔۔۔۔ ناک پر ٹکی ہوئی عینک کی مانند یہ ماسٹر صاحب کے چہرے کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ کسی بارات میں شریک ہوں یا کسی کی ماتم پرسی کو جائیں۔ یہ پھیکی بیجان اور بے ثمر مسکراہٹ ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی۔ شاید کبھی اس مسکراہٹ میں بھی رس ہوتا ہو کبھی اس مٹی ہوئی تحریر کا بھی کچھ مفہوم نکلتا ہو۔ کبھی اس اجڑی ہوئی کارواں سرائے میں بھی مسافروں کی چہل پہل ہوا کرتی ہو۔ لیکن اب تو یہاں سوائے ہولناک سناٹے اور منہدم چھتوں کی دیمک خوردہ کڑیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ زندگی کی دیوار پر کبھی نیلے پیلے رنگوں والا ایک اشتہار چسپاں تھا۔ جسے بچے نوچ کھسوٹ کر لے گئے اور جس کا اب ایک بے رنگ سا چیتھڑا ہی دیوار پر لٹک رہا تھا۔

روگی بیوی کی تمام بیماریاں عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی چلی گئی تھیں۔ ہسٹیریا مرگی میں بدل گیا تھا۔ کمر کا درد سر کے درد سے جا ملا تھا۔ دمے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔

ایسی خاموشی اور سکون نہیں رہا۔ انہیں بیوی کی تیمارداری کے لئے رات گئے تک جاگنا پڑتا اور چولہا جلانے کے لئے صبح سویرے اٹھنا پڑتا۔ شروع شروع میں انہیں ذرا دقت محسوس ہوئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ اس نئی زندگی کے عادی ہوگئے، اور اب اپنے آپ ہی منہ اندھیرے ان کی آنکھ کھل جاتی، وہ اپنی بیوی کے ہر حکم کی بجا آوری میں ایک قسم کی خوشی محسوس کرتے۔ یہ خوشی اس خوشی سے بڑی مختلف تھی جو کسی اخلاقی فرض کو پورا کرنے کے بعد انسان کو ملتی ہے۔ یہ تو ایک بے نام سی لذت تھی جو ماسٹر صاحب کو دوسروں کا کام کر کے اپنے جسم میں پھیلتی سمٹتی محسوس ہوا کرتی۔ اپنے خیال میں وہ بیوی کی خدمت کر کے یا اس کے نخرے اٹھا کر نہ تو اس پر احسان کر رہے تھے، اور نہ ہی خدا کی طرف سے اپنے ذمے سونپا گیا کوئی فرض ادا کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ تو اپنے آپ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جس طرح ہوا چلتی ہے تو درختوں کے پتے خود بخود ہی ایک دوسرے سے بجنے لگتے ہیں۔ اس میں کسی کاوش یا ارادے کو قطعی دخل نہیں ہوتا۔ ماسٹر صاحب کی شخصیت ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے عبارت تھی۔ انہیں ان کی زندگی سے نکال دیجئے اور باقی ماسٹر صاحب کا پرانا کوٹ، چمڑے کے گرد آلود جوتے اور فلالین کی میل خوری پتلون رہ جائے گی۔ ماسٹر صاحب غائب ہو جائیں گے۔

وہ سوکھ کر ہڈیوں کا پنجر رہ گئی تھیں۔ مزاج پہلے سے زیادہ چڑچڑا اور غصیلا ہو گیا تھا۔ معمولی سی بات پر ایک دم بھڑک کر اپنے آپ کو پیٹنا شروع کر دیتی۔ دوہتڑ مار مار کر منہ لال کر لیتی ماسٹر صاحب اسے پکڑتے ہی رہ جاتے۔ اس افراتفری میں ہمیشہ ان کی عینک کہیں نہ کہیں گر پڑتی اور وہ بیوی کو چھوڑ کر اپنی عینک کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگتے۔ اس کی عمر چھتیس سال کے قریب تھی۔ مگر وہ اپنے خاوند سے زیادہ بوڑھی معلوم ہو رہی تھی۔ نصف سر بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ کھنچے ہوئے چہرے پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ پپوٹوں کے بال جھڑ گئے تھے اور گردن کی ہڈی باہر کو نکل آئی تھی۔ اس عورت نے ہمیشہ اپنے خاوند سے نفرت کی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کی کسی بات پر کبھی بھی مشتعل نہیں ہوا تھا۔ اس نے بیوی کی ہر زیادتی کو گلہ کئے بغیر برداشت کیا تھا۔ اسے اپنے خاوند کی قناعت پسند اور ہر تکلیف کو چپ چاپ سہہ جانے والی طبیعت زہر لگتی تھی۔ وہ اسے ذہنی ایذا پہنچانے کے نت نئے طریقے تلاش کیا کرتی۔ مگر اس کے خاوند کی پیشانی پر ذرا بل نہ آتا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ باور کر

لیا تھا کہ اس کے خاوند کے چہرے پر جو ہلکی سی مسکراہٹ رہتی ہے وہ محض اسے جلانے اور اس کی کمزوریوں کا مذاق اڑانے کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ اندر ہی اندر اس بیوقوف سے غیر دلچسپ آدمی کی دشمن بن بیٹھی تھی اور محض اسے تنگ کرنے کے لئے اس نے کئی ایک فرضی بیماریاں گھڑلی تھیں۔ لیکن ماسٹر صاحب تو معلوم ہوتا تھا ایسی مٹی کے بنے ہیں جو نہ پھول اگا سکتی ہے اور نہ کانٹے ہی پیدا کر سکتی ہے۔ ہم انہیں ایک خود کار مشین بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ جس پر کسی جذبے کا اثر ہی نہ ہوتا ہو۔ وہ تو ہر چھوٹے بڑے حادثے کا اثر قبول کر لیتے تھے لیکن ایک بڑی منصفانہ سرد مہری اور بے جان سی یکسانی کے ساتھ جس طرح کسی ملک کا صدر مہمانوں کی لمبی قطار سے ہاتھ ملاتا ہے۔ یا جس طرح ساحل کی ریت پر بیٹھا ہوا کیکڑا سمندر کی لہروں میں ڈبکی کھانے کے بعد پھر دھوپ سینکنے لگتا ہے۔

شکی بیوی کو اب یہ وہم ہونے لگا تھا کہ ماسٹر صاحب نے اس کے بڑھاپے اور بیماری سے تنگ آ کر کسی دوسری عورت سے عشق بازی شروع کر رکھی ہے۔ وہ تو انہیں بے وقت اس فرضی عورت کے طعنے دینے لگتی تھی۔ ماسٹر صاحب تھوڑا سا ہنس کر معاملہ ٹال دیتے تو اسے اپنے وہم پر یقین ہو جاتا اور وہ غصے میں آگ بگولا ہو کر ان پر برس پڑتی اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو اپنا سینہ پیٹنے لگتی۔ جس دن ماسٹر صاحب نے اسے بتایا کہ انہیں وسن پورے میں ایک لڑکی کو روزانہ دو گھنٹے پڑھانے کی ٹیوشن مل گئی ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔

"تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟ تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ میں تو جانتی ہوں، یہ ایک دن ہو کر رہے گا۔ لوگو! میں لٹ گئی، لوگو! میرا سہاگ اجڑ گیا۔"

جھگڑالو عورت نے آسمان سر پر اٹھا لیا، اور خود غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔ ماسٹر صاحب نے فوراً پانی کا چھینٹا دیا، پیاز سنگھایا جب اسے ہوش آیا تو انہوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے بیوی کو سمجھایا کہ سوائے اس کے اور کسی بھی عورت کا انہوں نے کبھی خیال بھی نہیں کیا اور پھر یہاں ہر ماہ ٹیوشن کے چالیس روپے ملیں گے جن کی اگر وہ چاہے تو کمیٹی ڈال سکتی ہے۔ مکار بیوی آرام سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھ کر بولی۔

"دھیان سے سن رکھو بندھی کی بندھی رقم لا کر مجھے دینی ہو گی۔"

۷

اب ماسٹر صاحب نے فرخندہ کو باقاعدہ پڑھانا شروع کر دیا۔

وہ ہر روز سہ پہر چار بجے آتے۔ دو اڑھائی گھنٹے پڑھاتے اور چھ ساڑھے بجے گھر کو روانہ ہو جاتے۔ شروع شروع میں فرخندہ کی امی سر پر دوہری چادر اوڑھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور ماسٹر صاحب کو پڑھاتے دیکھا کرتیں۔ یا کبھی کبھی شیخ فقیر دین صاحب اپنا بہی کھاتہ لے کر وہیں آ جاتے اور صوفے پر بیٹھ کھاتہ سامنے رکھ حساب کتاب میں محو ہو جاتے۔ کسی وقت اکبر ایک آدھ چکر لگا جاتا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان لوگوں نے فرخندہ کی پڑھائی میں مخل ہونا چھوڑ دیا۔ ماسٹر صاحب فرخندہ کو بڑی توجہ اور محنت سے ایک ایک بات سمجھاتے، ہر مشکل شعر کا مفہوم پوری طرح ذہن نشین کرواتے۔ ان کا انداز کچھ ایسا گھریلو، سیدھا اور صاف ستھرا ہوتا کہ فرخندہ کو کسی مسئلے کو سمجھنے میں بھی دقت پیش نہ آتی۔ وہ انہیں ماسٹر جی کہا کرتی (اب ہم بھی انہیں ماسٹر جی ہی لکھیں گے) اس کا خیال تھا کہ ماسٹر جی ایسے خشک اور بے ہنگم آدمی کے ساتھ اسے دو گھنٹے گذارنے مشکل ہو جائیں گے۔ مگر اب اسے ان کی سیدھی سادی بے ساختہ باتوں اور ہر وقت بچوں ایسی لاابالی سی مسکراہٹ سے بڑی دلچسپی ہو گئی۔ پہلے پہل وہ ان کے سامنے سر جھکائے منہ میں گنگنیاں ڈالے بیٹھی رہتی۔ اور صرف "ہوں ہاں" سے ہی کام لیتی۔ مگر اب آہستہ آہستہ وہ ماسٹر جی سے کھل کر باتیں کرنے لگی تھی اور ان سے آنکھیں بھی چار کر لیتی تھی۔ جس طرح وہ اپنے بڑے بھائی سے باتیں کرتے ہوئے بھول جاتی کہ وہ ایک مرد سے ہمکلام ہے۔ اسی طرح اسے ماسٹر جی سے باتیں کرتے ہوئے بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایک غیر مرد سے گفتگو کر رہی ہے۔ ماسٹر جی کی باتوں، گفتگو کے لہجے اور کسی بات پر ذرا سا مسکرانے کے سیدھے سادے انداز میں کچھ ایسا گھریلو پن اور اپنائیت تھی کہ فرخندہ کو ایک پل کے لئے بھی غیریت کا احساس نہ ہوا تھا۔ ماسٹر جی بھی فرخندہ کے ساتھ بڑی ہمدردی اور ملائمت سے پیش آتے۔ اسے کبھی سبق یاد نہ رکھنے یا کسی شعر کی غلط تفسیر لکھنے پر ڈانٹ ڈپٹ یا سرزنش نہ کرتے۔

پڑھائی کی یہ جماعت نشست گاہ میں لگتی۔ شام کی چائے پڑھنے پڑھانے کے دوران ہی

پی جاتی۔ ماسٹر جی کو زندگی بھر کبھی چائے پینے کا اتنا لطف نہ آیا تھا۔ جتنا انہیں وسن پورے والے اس مکان کی نشست گاہ میں نصیب ہوا۔ کبھی عذرا اور کبھی بلقیس چائے سے بھری ہوئی کیتلی اور پیالیاں ان کے پاس رکھ جاتی۔ کبھی ماسٹر جی پیالیوں میں چائے بناتے اور کبھی فرخندہ کاپی پنسل الگ رکھ کر پہلے ماسٹر جی کے لئے پیالی میں چائے انڈیلنے لگتی۔ فرخندہ چونکہ خود زیادہ میٹھا پیتی تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ ماسٹر جی کی پیالی میں بھی چینی زیادہ ڈال دیتی اور ماسٹر جی کو ہر دو تین گھونٹ لینے کے بعد پیالی میں قہوہ ملانا پڑتا۔ فرخندہ خفیف سی ہو جاتی۔

"میں بھی کتنی بُری ہوں ہمیشہ چینی زیادہ ملا دیتی ہوں۔"

"اس میں بھلا برائی کیا ہوئی؟ ذرا بانگ درا تو کھولو۔"

اور ماسٹر جی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بانگ درا بھی پڑھائے چلے جاتے۔ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے پہلی بار ایک بھرے پرے گھر کا پُرسکون ماحول دیکھا۔ پہلی بار ایک پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے کنبے کے عزت دار افراد نے ان کی سماجی حیثیت کو تسلیم کیا تھا اور انہیں وہ رتبہ دیا تھا جس کے وہ معاشرتی اعتبار سے پورے پورے حقدار تھے۔ لیکن جس کا انہوں نے کبھی بھی کسی سے مطالبہ نہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی جوانی کا ابتدائی دور رشتہ داروں کے بچوں کو کھلاتے، مالکوں کی جھڑکیاں سنتے، آدھی آدھی رات کو برتنوں کا بھنڈار مانجھتے اور سارا سارا دن ننگے پاؤں لاہور کی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے گذارا تھا۔ شادی کے بعد جو انہیں اپنا گھر ملا وہاں سوائے سکون کے اور سب کچھ تھا۔ بیماری تھی، غصیلی بیوی کے گلے شکوے تھے۔ اس کی ہائے وائے تھی، گندگی نحوست، خود غرضی، بے وقعتی اور بے بسی تھی۔

آتشدان پر جہاں مٹی کا پیارا سا گلدان ہونا چاہئیے تھا وہاں معجونوں کی ڈبیاں اور دوائی کی بوتلیں تھیں۔ پلنگ تلے کتابوں کے ڈھیر پر جما ہوا گرد تھا اور تام چینی کی چائے بنانے والی گندی کیتلی تھی جس میں بیوی کی نظروں سے چھپ چھپ کر چائے بنایا کرتے۔ وہاں ان کی سیلی کوٹھریوں میں نمناک ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا اور رات کو بوسیدہ چھتوں کی کڑیوں میں جھینگر بولا کرتے۔

لیکن یہاں دھوپ تھی، روشنی تھی جو سورج کے طلوع ہوتے ہی کمرے میں پھیل جاتی۔

سلاخوں والی کھڑکی کے باہر بکائن کا ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں والا پیڑ تھا (جس پر مارچ اپریل کے دنوں میں ضرور ہلکے رنگ کے پھول آتے ہوں گے۔) کھڑکی پر چنا ہوا نیلی بوٹی والا چھینٹ کا پردہ تھا۔ کارنس پر رکھی ہوئی پھولدار صراحی تھی، شیشے کا گلدان تھا جس میں فرخندہ روز کے روز ایک آدھ پھول لگا دیا کرتی۔ آنگن والا بیری کا پیڑ تھا۔ جس کی شاخوں میں طوطے دن بھر شور مچایا کرتے تھے اور کچے پکے بیر کتر کتر کر آنگن کے فرش پر پھینکا کرتے۔ نرم مزاج ایثار کیش ماں تھی۔ مہربان بہنیں تھیں۔ بھابی تھی اور معصوم قلقاریاں مارنے والے، رونے والے ٹانگیں چلانے والے بچے تھے۔ یہاں سورج نکلتا تو کھیتوں میں سونا بکھر جاتا۔ مکانوں کی دیواروں اور مٹیوں اور مسجدوں کے میناروں کے منہ لال ہو جاتے۔ ہوا چلتی تو گلاب کی کیاریوں میں خوشبوؤں کے ہاتھوں سے پھول کی پنکھڑیوں کے دامن چھوٹ جاتے۔ بارش ہوتی تو گلیوں میں کیچڑ بھی ہو جاتا، بازاروں میں پانی بھی کھڑا ہو جاتا، اورشاد باغ والے آم کے جھنڈوں میں کوئلیں بھی کوکنے لگتیں۔ اگرچہ یہاں کوڑے کرکٹ سے لدے ہوئے گڈے بد بو پھیلاتے جوں کی چال چلتے ہوئے بھی مل جاتے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی کھیتوں اور باغوں کی طرف سے آنے والی سبزے کی مہک سے لدی ہوئی تر و تازہ ہوا بھی تھی۔ کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا گڈا ہماری زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے اور جب تک ہمیں زیادہ سہولتیں میسر نہیں ہو جاتیں۔ ہم نچلے متوسط طبقے والے اس حقیقت سے اغماض نہیں کر سکتے۔ مصیبت صرف اتنی ہے کہ موچی، بھاٹی یا دلی دروازے کے گنجان علاقے میں یہ حقیقت ہم پر سوار ہوتی ہے جبکہ شہر کے ان باہر والے علاقوں میں ہم اس حقیقت کو سرسوں کے کھیتوں میں کھڑے پل بھر کے لئے قریب سے گزرتا ہی دیکھتے ہیں۔ اگر اتنی تھوڑی سی قیمت پر انسان کا درختوں، پھولوں، کھیتوں، اور دھرتی کی ہری بھلی خوشبوؤں کے ساتھ ازلی اور ابدی ناطہ برقرار رہتا ہے تو یہ اتنا مہنگا سودا نہیں ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے نازک اور سب سے مضبوط ناطہ ہے جو ہمیں روٹی کے ساتھ ہی ساتھ حسن عطا کرتا ہے۔ انتھک محنت کے ساتھ ساتھ بے فکری سے پاؤں پسارنے کی اہمیت بھی جتاتا ہے اور وفاداری کے ساتھ ساتھ جفاکشی کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ ہمارے پاؤں میں کانٹا چبھو کر دل میں پھول کھلاتا ہے۔ یہ ہمارے دل میں بیج بکھیر کر ہمارے دماغ سے شگوفوں کی فصل کاٹتا ہے۔ یہ تیز دھوپ بن کر ہمارے جسم میں داخل ہوتا ہے اور خوشبو بن کر ہمارے ہونٹوں سے اڑ جاتا ہے۔ یہ

ہمارے چہرے کو گرم تانبے کی مانند دمکاتا ہے۔ اور ہمارے نازک ہاتھوں میں فولاد کی سختی پیدا کرتا ہے۔ یہ آگ برساتے سورج، ہونکتی سنسان دوپہروں، اجلے چاند کی ٹھنڈی راتوں، کھاد کی بو چھوڑتے کھیتوں، آم کے درختوں، ناشپاتی کے پھولوں، سرسوں کے کچے ڈنٹھلوں، پاؤں لہولہان کر دینے والی خار دار جھاڑیوں، زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلے ہوئے گاجر کے پتوں اور دھرتی کی چھاتی میں دھنستے ہوئے ہل کے تیز پھل کا ناطہ ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ضلع کچہری کی عمارت ہی نہیں کھیتوں کے بیچوں بیچ جانے والی پگڈنڈی بھی ہے۔ عدالت میں قسم کھا کر دی جھوٹی گواہی ہی نہیں، ڈال سے ٹوٹ کر گرتے ہوئے پتے کی آواز بھی ہے۔ ورکشاپ کے بھونپو کی چیخ ہی نہیں روشندان کے چھجے پر گرتی بارش کی ٹپا ٹپ بھی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بھونپو کی چیخ سن کر ورکشاپ کی طرف دوڑیں، ضلع کچہری کے برآمدوں میں وکیلوں کے پیچھے مارے مارے بھی پھریں، عدالت میں کھڑے ہو کر جھوٹی گواہی بھی دیں اور ہمارے کوٹ کے کاج میں ناشپاتی کا پھول بھی ہو؟ کیا پت جھڑ کے ویرانوں میں ہم بہار کی چھوٹی سی نشانی بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے؟ جبکہ اندھیری رات تاروں کے ان گنت دیئے جلا کر سورج کو یاد کیا کرتی ہے۔

عظیم ہے خدا۔ جس نے ہمیں بھوک دی اور حقیر ہے انسان جس نے ہمارے ہاتھ میں راشن کارڈ دے کر اس بھوک کا مذاق اڑایا۔ حسین ہے خدا جس نے ہمیں آنکھوں کے جھروکے دیئے اور بدصورت ہے انسان جس نے ان جھروکوں پر موٹی عینک کے پردے گرائے۔ اس نے ہمیں نیند عطا کی اور ہم نے خواب آور گولیاں ایجاد کیں۔ اس نے سورج طلوع کیا اور ہم نے لحاف اوپر کر لیا۔ اس نے شاخ پر پھول کھلائے۔ ہم نے وہ شاخ توڑ کر اپنے قربانی کے دنبے کو کھلا دی اور خود ڈکار مار کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ کتنا فراخ دل ہے، کتنا حیرت انگیز ہے۔ وہ گندگی لے کر گیہوں کے خوشے دینے والا۔ مردہ ہڈیوں کی کھاد پر سرسوں کے ڈنٹھل اگانے والا۔ کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا گڈا لے کر دھان سے لدا ہوا گڈا واپس کرنے والا ہمیں قلم اور کاغذ دینے والا۔ ہمارے گھر کے آنگن والے گملوں میں رتن جو کی کلیاں کھلانے والا۔ ہمیں سبز چائے کی پیالی اور بہترین سگریٹ عطا کرنیوالا۔

لیکن ماسٹر جی کے بہترین سگریٹ پینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ دن رات میں سگریٹ کی تین آنے والی دو ڈبیاں پھونکتے اور سبز چائے بھی انہیں صرف یہاں اس وجہ سے

مل جاتی کہ فرخندہ کی کشمیرن بھابی عذرا کو کبھی کبھی اپنی خاندانی روایات کا خیال آجاتا تھا۔ اس کے باوجود ماسٹر جی کو اس گھر میں وہ سب کچھ میسر تھا جس کے نہ ملنے کا انہیں کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ مگر اب انہیں ایک حسرت رہنے لگی تھی۔ اب انہیں اپنی زندگی کے بہت بڑے خلا کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہرے بھرے جنگلوں کی فضا میں پہنچ کر ماسٹر جی پر اپنے دھول اڑاتے ویرانوں کے ہولناک سناٹے زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ اب ان کا اپنا مکان انہیں زیادہ تاریک سنسان اور منحوس دکھائی دینے لگا تھا۔ مگر انہیں دن رات کا بیشتر حصہ اسی منحوس اور تاریک مکان میں گذارنا پڑتا۔ فرخندہ کے گھر تو صرف دو گھنٹوں میں انہیں جو سکون اور خوشی ملتی وہ عمر بھر کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ کیا یہ خوشی کی بات نہ تھی کہ انہیں یہاں چائے خود بنانے کی بجائے کبھی عذرا، کبھی بلقیس اور کبھی فرخندہ بنا کر پلاتی تھی؟ جب وہ گھر میں داخل ہوتے تو ہر ایک انہیں ادب سے سلام کرتا۔ کوئی لڑکی اگر ننگے سر یوں ہی بیٹھی ہوتی تو انہیں دیکھتے ہی دوپٹہ سر پر کر لیتی اور سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ وہ بولنا شروع کرتے تو ہر ایک انسان ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ ان کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنا جاتا۔ ہر سوال کے حل کرنے میں پوری مخلصی سے ان کی رائے لی جاتی اور پھر ان کی رائے کو حرف آخر سمجھ کر تسلیم کر لیا جاتا۔ چائے کی پیالی بنا کر سب سے پہلے ان کے آگے رکھی جاتی۔ اس خوشگوار گھریلو ماحول میں اگر انہیں کوئی شئے زندگی کی افسوسناک نفسا نفسی اور بد صورتی کا احساس دلاتی تو وہ فرخندہ کے خالہ زاد بھائی یعنی ایم اے (ادبیات) کے طالبعلم خالد کا وجود تھا۔ انہوں نے فرخندہ کے بڑے بھائی اکبر کو اپنی تمام خشک حساب دانوں والی پھیکی بے مروت طبعیت اور بیمار و بہی ذہنیت کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ انہیں فرخندہ کے باپ کی کنجوسی، روپے سے دیوانوں ایسی محبت اور ان کا خالص کاروباری اندازِ فکر بھی اتنا ناپسند نہیں تھا۔ لیکن خالد انہیں بھلا نہیں لگا تھا۔ ماسٹر جی کو اس سوکھے ساکھے چھائیوں بھرے کچھے ہوئے حاسدانہ چہرے اور چوہیوں ایسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے طالب علم سے نفرت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ نفرت انتہا پسندی کی علامت ہے اور ماسٹر جی کی ساری عمر میانہ روی میں گذری تھی۔ اگر یہ شخص انہیں اپنے محلے والوں میں یا اپنے گھر میں ملتا تو وہ اس سے حسب عادت ہاتھ ملا کر ملتے اور دوسرے لمحے بھول جاتے کہ کون تھا اور اس سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ مگر فرخندہ کے دھوپ کی روشنی، چائے کی خوشبو اور بیری کی ٹھنڈی چھاؤں والے گھر میں ماسٹر جی نے پہلی

ہی ملاقات میں ادبیات کے طالبعلم کی پر فریب شائستگی، ریاکارانہ تکلف اور حاسدانہ نگاہوں کو عریاں دیکھ لیا تھا۔ جس طرح چمڑے کا تاجر اپنے گودام سے دور ہو تو چمڑے کی بو فوراً سونگھ لیتا ہے۔ جبکہ گودام کے اندر رہ کر اسے یہ بو بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے ہی ہم کسی بھولے بھالے آدمی سے باتیں کرتے ہوئے اپنی کمینگی کے ایک ایک داغ کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں۔

خالد بھی دل ہی دل میں ماسٹر جی کے خلاف ایک خفیہ حسد اور بغض چھپائے ہوئے تھا۔ یوں تو اسے ماسٹر جی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن چونکہ وہ فرخندہ کے گھر میں آتے اسے پڑھاتے۔ اس کے پاس دو دو گھنٹے بیٹھے رہتے اور فرخندہ انہیں چائے بنا بنا کر دیتی۔ ان کی ہر بات کو بڑے غور سے سنتی۔ اس لئے خالد کو ماسٹر جی سے نفرت ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ ماسٹر جی سے بڑی ملائمت اور محبت سے پیش آتا۔ ہمیشہ ان سے بتیسی کھول کر بات کرتا۔ مگر درپردہ انہیں کسی نہ کسی علمی، ادبی یا سیاسی مسئلے پر پوری طرح زک پہنچانے کی فکر میں رہتا۔ ماسٹر جی کو اس شخص کی پوشیدہ ریاکاری کا علم تھا لیکن انہوں نے کبھی کوئی بات جتائی نہ تھی۔ اول تو ماسٹر جی کو کسی دوسرے آدمی کے بارے میں بہت ہی کم اندازہ ہوا کرتا۔ دوسرے وہ دل کی بات دل ہی میں رکھنے کے عادی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے کبھی کسی بات کو اتنی اہمیت نہ دی تھی کہ وہ ان کے دل و دماغ کا سکون تباہ کر دے۔

خالد ہفتے میں دو تین چکر فرخندہ کے گھر ضرور لگاتا۔ فرخندہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتی جیسا کہ ہمارے ہاں خالہ زاد بہنیں اپنے رشتہ دار بھائیوں کو ملا کرتی ہیں۔ اس کے دل میں کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ بات بات پر اپنے پھیکے ہونٹ کاٹنے والا بیمار سا آدمی اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ بلکہ شادی کا خواہشمند بھی ہے۔ خالد نے ابھی تک اظہار محبت اس لئے نہیں کیا تھا کہ فرخندہ کو وہ گھر کی کھیتی سمجھ رہا تھا جسے جب چاہے وہ کاٹ کر گھر میں ڈال سکتا تھا۔ لیکن ماسٹر جی کی آمد سے اس کے دل میں خواہ مخواہ کی رقابت سی پیدا ہو گئی اور اس نے فرخندہ کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی کنجوس مکھی چوس بڑی ہی مجبوری کی حالت میں صدری کی اندرونی جیب سے بٹوہ نکالتا ہے کیونکہ محبت کے اظہار میں بھی ادبیات کے اس منطقی طالبعلم نے اس حد تک احتیاط، دوغلے پن مکاری اور فریب سے کام لیا کہ پہلے حملے میں فرخندہ بالکل ہی نہ سمجھ سکی کہ خالد کیا کہنا چاہتا

ہے۔ لیکن اس کے دل میں کھٹکا سا پیدا ہو گیا۔ یہ خالد کی پہلی کامیابی تھی۔ وہ بٹوا نکال کر روپے کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسرا حملہ کر دیا۔ اب اس نے ایسے ذو معنی انداز گفتگو سے کام لیا کہ اگر فرخندہ ناراض ہو کر اسے جھڑک بھی دے تو وہ فوراً اسی بات کو بدل کر اس کا دوسرا مفہوم پیش کر دے۔

فرخندہ میز پر بکھری ہوئی اپنی کتابیں اور کاپیاں سمیٹ رہی تھی۔ ماسٹر جی اسے پڑھا کر ابھی ابھی گئے تھے۔ خالد دونوں ہاتھ کوٹ کے نیچے سے پشت پر رکھے بڑے اطمینان سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ حقیقت میں اس کے دماغ میں بڑی زبردست کش مکش جاری تھی۔ اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے اور اسے بتا رہے تھے کہ بلقیس آنگن میں بیٹھی گرم مسالہ کوٹ رہی ہے۔ عذار بھابی غسل خانے میں نہا رہی ہے۔ اور خالہ باورچی خانے میں بیٹھی دال کو ترکا لگا رہی ہے۔ یعنی مطلع بالکل صاف تھا، اور اب وہ بڑے اطمینان سے اظہار عشق کر سکتا تھا۔ مگر حرف مطلب زبان تک نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق اصل بات کو ان گنت نقلی پردوں میں چھپایا اور سلاخوں والی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر بولا۔

"موسم کتنا بدل گیا ہے۔ کیوں فرخندہ! آج مارچ کی تیسری ہے نا؟"

"جی ہاں اب تو گرمیاں سر پر کھڑی ہیں بھائی جان۔"

خالد کی زبان پر گویا کسی کڑوی دوائی کا قطرہ گرا اور اس کے سارے حلق کو بد مزہ کر گیا۔ کیا ضروری ہے کہ فرخندہ اسے ہر بات پر بھائی جان کہا کرے؟ اس نے چور نگاہوں سے فرخندہ کو دیکھا۔ وہ میز پر سے کتابیں وغیرہ اٹھا کر انہیں اپنی الماری میں لگا رہی تھی۔ اس کے پھولے ہوئے خشک بال بسنتی ربن سے گردن پر بندھے ہوئے تھے، اور ریشمی رخسار شام کی خوشگوار ہوا میں بڑے ہی تر و تازہ ہو رہے تھے۔ خالد کو ان نرم نرم خوبانیوں کا خیال آ گیا جو اپنی ٹہنیوں پر پکنے کے بعد باغ میں میٹھی میٹھی خوشبو اڑایا کرتی ہیں۔ فرخندہ نے بسنتی وائل کی گلابی پھولوں والی چست قمیض پہن رکھی تھی جو اس کی کمر پر پھنس گئی تھی۔ خالد کا حلق خشک ہو گیا تھا، اور ہتھیلیوں میں ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر ہتھیلیاں پونچھیں اور دل میں ڈرتے ہوئے مگر بظاہر بڑی بے نیازی سے بولا۔

"یہ بسنتی رنگ تم پر خوب پھبتا ہے فرخندہ! یہ کپڑا کہاں سے خریدا تھا؟"

"باجی میرے لئے کمیٹی بازار سے لائی تھیں۔"

"بہت خوب۔" اب خالد کھڑکی سے ہٹ کر فرخندہ کے قریب آ گیا اور یونہی اس کی الماری میں دیکھنے لگا۔

"کتابیں تم نے بہت جمع کر رکھی ہیں۔ کبھی انگریزی شاعری بھی پڑھی ہے؟"

فرخندہ ہنس پڑی۔ خالد کو اس کے موتیوں ایسے دانت نظر آئے تو اس کی ٹانگیں ذرا سی کپکپائیں۔

"اسی مضمون میں تو فیل ہوئی تھی۔"

"واہ بھئی واہ ۔۔۔۔ عورتیں تو اس قسم کی شاعری کو بہت پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ اس میں سوائے محبت کے اور کسی چیز کا ذکر ہی نہیں ہوتا اور محبت صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔"

فرخندہ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ من ہی من میں گھبرا سی گئی۔ اب جو وہ مسکرائی تو خالد نے اس کی بناوٹی مسکراہٹ کو صاف پہچان لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا ہے۔ اس نے ترکش سے دوسرا تیر نکالا۔

"ارے بھئی اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ محبت کا جذبہ تو صرف عورت ہی کے ورثے میں آیا ہے۔ ہم لوگ تو تمہاری محبت کے ساتھ ہی چل سکتے ہیں۔ فرض کر لو کہ میں تم سے کہتا ہوں فرخندہ مجھے تم سے محبت ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر یہی الفاظ تم دہراؤ اور مجھ سے کہو کہ خالد مجھے تم سے پیار ہے تو اس میں بڑے معنی پیدا ہو جائیں گے۔ جس طرح بٹن دبانے سے یکایک بتیاں روشن نہیں ہو جاتیں! مطلب یہ کہ جب عورت محبت کرتی ہے تو ساری کائنات میں سنگیت جاگ اٹھتا ہے۔ پھر منطقی طور پر بھی ہمیں عورت کے خمیر میں اس جذبے کی زیادتی کا جواز ملتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے فرخندہ؟"

فرخندہ نے الماری بند کر کے کرسی پر سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا، اور یونہی گلدان میں پھولوں کو درست کرنے لگی۔ اسے وہم سا ہونے لگا تھا اگر وہ کمرے سے نکل گئی تو خالد یہ سمجھے گا کہ فرخندہ اس کے اظہار محبت کی نیت کو پا گئی ہے۔ اس لئے وہ اپنے طور پر بالکل بے خیالی میں پھولوں کی سوکھی پتیاں جھاڑتی رہی۔ لیکن بول کچھ نہ سکی۔ خالد کو اس سے بڑی شہ ملی اس نے کیا کیا کہ آگے بڑھ کر فرخندہ کے کندھے پر اپنا کانپتا ہوا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا۔

اس ہاتھ کو اس نے پتلون کی جیب میں اندر ہی اندر بدن سے رگڑ کر خوب گرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ فرخندہ کا سارا بدن کانپ اٹھا۔ خالد لرزتی ہوئی خشک آواز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیونکہ تمہارے بال خوشبودار ہیں۔ تمہاری آنکھیں نمناک رہتی ہیں۔ تم بولتی ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ تم خاموش ہوتی ہو تو ہر شے گیت گاتی سنائی دیتی ہے-----"

فرخندہ کے کان ایک دم گرم ہوگئے۔ وہ اس بڑے حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اسے اپنے خالہ زاد بھائی پر غصہ بھی آیا، اور شرم بھی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر خالد کو ایک زور دار چانٹا لگا دے۔ مگر جیسا کہ ہمارے طبقے کی لڑکیاں ایسا نہیں کیا کرتیں۔ اس لئے اس نے وہیں کھڑے کھڑے گلاب کی ٹہنی کو جھاڑ کر اتنا ہی کہا۔

"بھائی جان آپ----- آپ نے مجھے غلط-----"

اور اس کی آواز اپنے ہی ابلتے ہوئے غصے اور شرم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر دب گئی۔ چوکیدار کا بھیس بدل کر چوری کرنے کے عادی خالد نے فوراً پینترا بدل لیا۔

"ارے----- تم تو سچ مچ ہی سمجھ بیٹھیں۔ بھئی میں تو تمہیں آئرلینڈ کے ایک پرانے شاعر کی نظم کا ترجمہ سنا رہا تھا۔ کتنی خوبصورت نظم تھی، ہے ناں؟ بھلا ہمارے کسی شاعر کو ایسا تخیل نصیب ہوا ہے؟"

فرخندہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سینے پر دوپٹہ سنبھالتی چپکے سے باہر نکل گئی۔

اب ایک بات خالد پر واضح ہو گئی کہ فرخندہ نے اس کے ساتھ عشق بازی کا رشتہ استوار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جزوی طور پر فرخندہ کی طرف سے نا امید ہو گیا تھا (کیونکہ وہ اس سے زیادہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا) لیکن اپنے جذبۂ محبت سے نا امید نہیں ہوا تھا۔ اس کا یہ جذبہ خالص محبت یا نفرت کی بجائے کسی شے کو مستقل مزاجی، ٹھنڈے دل اور مسلسل تعاقب سے عاجز کر کے پا لینے کی اساس پر قائم تھا۔ دیمک کے کیڑے کی مانند----- جو بڑے سے بڑے درخت کو اندر ہی اندر چاٹ کر دھڑام سے زمین پر گرا دیتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے تو بڑے بے ڈھنگے پنے سے فرخندہ کی بانہہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے ضرور اس کے اناڑی پنے کا برا مانا ہے۔ اسے اپنی کوششیں ترک نہیں کرنی چاہئیں۔ فرخندہ ایک نہ ایک دن اس کی ہو کر رہے گی۔ اس کے چھوٹے سے محدود مگر علمی

طور پر بڑے چالاک ذہن میں انگریزی اور لاطینی زبان کے شاعروں کی وہ تمام بے کسی کی نظمیں گھومنے لگیں جو انہوں نے اپنی محبوباؤں کے عشق میں ناکام ہونے کے بعد بڑے جوش و خروش سے لکھی تھیں۔ اس شخص نے زندگی کے ہر محاذ پر ہمیشہ گوریلا لڑائی لڑی تھی۔ یعنی اس نے میدان جنگ میں ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے ہمیشہ راتوں کو جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر دشمن کو پریشان کیا تھا۔ چنانچہ اس نے اس محاذ پر بھی ایسی ہی لڑائی کا فیصلہ کیا۔ جیب سے رومال نکال کر بڑے اہتمام سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور نیچے آ گیا۔

۸

مارچ کے دن شروع ہو گئے تھے۔ ان دنوں پیڑ پودوں پر پھول نکل آتے ہیں اور کھیتوں پر جو شام سے کچھ دیر پہلے ہوا چلا کرتی ہے وہ ایک صحت مند نوجوان کے سانس کی طرح نیم گرم ہوتی ہے۔ وسن پورے کے بڑے بازار میں دوپہر کو گرمیوں والی گرد سی اڑنے لگی تھی اور لوگوں نے دکانوں اور مکان کے آنگنوں میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا تھا۔ راتیں بڑی صاف اور چمکیلی ہو گئی تھیں۔ اور چھوٹے بڑے ستارے نگینوں کی مانند جگمگایا کرتے جہاں کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں گندے پانی والے کیچڑ بھرے نالے کے ساتھ ساتھ لیموں کی جھاڑیوں میں سفید کلیوں نے کھل کر ساری فضا کو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی مہک سے بوجھل بنا رکھا تھا۔ ناشپاتی کے باغ میں تو سوکھے درخت گلابی شگوفوں سے لد گئے تھے۔ سورج غروب ہونے کے بعد شام کی گرم گرم روشنی ان باغوں میں دیر تک پھیلی رہا کرتی۔ پتنگے اور مچھر یہاں سے گذرنے والوں کی آنکھوں میں پڑا کرتے۔ چارے کے ہرے بھرے کھیتوں پر سے ہو کر جو ہوا آتی اس میں سبزے کی ٹھنڈک ہوتی۔ ماسٹر جی کبھی ایسا کرتے کہ گھر سے فرخندہ کو پڑھانے وقت سے پہلے ہی چل پڑتے۔ وسن پورے کے چوک میں بس پر سے اتر کر وہ فرخندہ کے ہاں جانے کی بجائے گلیوں گلیوں ہو کر سیدھا کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔ اب انہوں نے گلوبند تو اتار دیا تھا۔ مگر پرانا لمبا کوٹ ویسے ہی ان کے ڈھیلے ڈھالے کندھوں پر منڈھا رہتا۔ کھیتوں اور باغوں کے بیچوں بیچ جانے والے غیر ہموار کچے راستوں پر وہ یونہی ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ کبھی کسی جگہ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ عینک اتار کر آنکھیں پونچھتے۔ رومال سے ناک صاف کرتے۔ عینک پھر سے جماتے اور کھیتوں میں چارہ کاٹ کاٹ کر گٹھے بنانے والوں کو دیکھنے لگتے۔ پھر چاہ میراں والی آبادی کو دیکھتے۔ جہاں ٹیلے والی بڑی مسجد کے سفید مینار ڈھلتی دھوپ کی ملگجی روشنی میں چمک رہے ہوتے اور کبھی اپنے پاس ہی درخت کے تنے پر رینگتی ہوئی موٹی موٹی چیونٹیوں کی قطار کو غور سے تکنا شروع کر دیتے۔ ان کے عقب میں وسن پورہ کی آبادی والے ایک منزلہ، دو منزلہ پکے مکانوں میں کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا ہوتا۔ بائیں جانب پیپل اور آم کے گھنے درختوں کے

تنوں میں سے شاد باغ کی کوٹھیاں اور کوارٹر دکھائی دیتے۔ پیپل کے پیڑ پر بڑی نرم و نازک، چکدار، چمکیلی، لال لال، نسواری اور ہری ہری پتیاں آئی ہوتیں جھڑے ہوئے بسنتی پتے نیچے زمین پر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے۔ ماسٹر جی یونہی ایک زرد پتا ہاتھ میں لے لیتے اور اس کی ڈنڈی گھمانے لگتے۔ یہ پتا واپسی پر کہیں راستے میں ہی گر پڑتا، اور انہیں خبر بھی نہ ہوتی۔

ایک دن انہوں نے کھیت میں ایک چھریرا سا پیڑ دیکھا۔ جس کی اوپر کو اٹھی ہوئی پتلی پتلی ٹہنیوں پر کتنے ہی گلابی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ماسٹر جی کو یہ پھول بڑے پیارے لگے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ یہ پھول فرخندہ کے لئے لیتا چلوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھے اور انہوں نے بالشت بالشت بھر کی دو ٹہنیاں توڑ لیں۔ جو پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ماسٹر جی نے انہیں سونگھا تو ان میں نہ بو تھی نہ خوشبو۔ وہ فرخندہ کے گھر کی جانب واپس ہو لئے۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ دائیں طرف والے کنوئیں کی جانب سے، جہاں رہٹ لگا تھا۔ اور کچھ لوگ بیٹھے سوکھی جھاڑیوں کا ڈھیر جلا رہے تھے۔ انہیں ایک آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ماسٹر جی نے سوچا کہ اس کسان سے ان پھولوں کے متعلق پوچھ ہی لینا چاہیے تاکہ وہ فرخندہ کو بھی بتلا سکیں۔ وہ آدمی ماسٹر جی کے پاس آ کر اپنے آپ ہی رک گیا۔ "کیوں بھائی ----- یہ کیسے پھول ہیں۔"

"پھول تو آلوچے کے ہیں باؤ جی۔ مگر آپ نے انہیں توڑا کیوں؟
آپ پھول نہیں لے جا رہے۔ ہمارے سیر بھر آلوچے لئے جا رہے ہیں۔ دیکھنے میں تو آپ بالکل ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں آپ سے کیا سلوک کروں؟"

ماسٹر جی کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے۔ پہلے انہوں نے سر جھکا لیا پھر سر اٹھا لیا اور کسان کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر وہی بے رنگ سی پُرملال عاجزانہ مسکراہٹ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھول اس آدمی کو واپس کر دیں، یا ہاتھ میں لئے وہیں کھڑے رہیں۔ کسان نے ہاتھ بڑھا کر ماسٹر جی کے ہاتھ سے پھول کی ٹہنیاں چھین کر کہا۔

"آپ میرے باپ کی عمر کے ہیں۔ اس لئے چھوڑے دیتا ہوں۔ اب آپ جائیے"۔

ماسٹر جی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی اور کچے راستے پر ڈگر ڈگر چل پڑے۔ کسان نے گھوم کر دیکھا۔ ماسٹر جی کے جوتے اور موٹی پتلون کے پائنچے

مٹی میں سنے ہوئے تھے۔

اس شام پڑھائی ختم کرنے کے بعد انہوں نے فرخندہ کو سارا واقعہ سنا دیا۔ فرخندہ ہنس پڑی۔

"ماسٹر جی۔ آپ نے تو بالکل بچوں کی طرح کیا۔"

"نہیں۔ پھول مجھے پیارے لگے تھے۔ میں نے سوچا توڑ لیتا ہوں۔ فرخندہ اپنے گلدان میں لگا لے گی۔"

"ہائے ---- خدا کے لئے پھر نہ ایسا کریں۔ یہ رکھوالے تو بڑے اکھڑ ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی عزت کا سول کیا جانیں؟"

ماسٹر جی نے فرخندہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ جواب دیتے بھی کیا؟ انہیں تو آج تک پوری طرح یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ آدمی کی عزت کن باتوں سے بڑھتی ہے اور کن باتوں سے گھٹ جاتی ہے۔ شعوری طور پر انہوں نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جو دوسروں کی نگاہوں میں ان کی عزت کا باعث بنتا۔ اور غیر شعوری طور پر تو انہیں اپنی باتوں اور بچوں ایسے بے سوچے سمجھے کے طرز عمل سے کئی بار بھری محفل میں خفیف ہونا پڑا تھا۔ ان کے سکول کے دوسرے ماسٹر تو کئی بار چڑ بھی جاتے کہ یہ کیسا احمق سا آدمی ہے۔ اس میں اتنی بھی عقل نہیں کہ محفل میں بیٹھ کر کس قسم کی بات کیسے کی جاتی ہے۔ جب دیکھو اپنی بیوقوفوں ایسی ہانکے جا رہا ہے لیکن ماسٹر جی کبھی ان کی باتوں کا برا نہ مانتے۔ بلکہ وہ تو ان کے طعنوں کو برا سمجھتے ہی نہیں تھے۔ بس کھسیانے سے ہو کر اپنے مخصوص انداز میں ذرا سا ہنس دیتے اور عینک کے شیشے میلے رومال سے پونچھنے لگتے۔

دراصل ہمارے ماسٹر جی دنیا والوں کے عزت بے عزتی کے عام بنے بنائے اصولوں سے بالکل ہی الگ تھلگ ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔ جس پر دوسروں کا سر بل جائے اور وہ عش عش کر اٹھیں۔ ان میں وہ دور اندیشی اور موقع شناسی تو نام کو نہ تھی، جو ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہوئے بھی گرمجوشی سے ملنے اور بتیسی کھول کر بات کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انہیں نہ تو اپنے دشمن کی پہچان تھی اور نہ اپنے دوست کی خبر۔ وہ جو ہر ایک سے ہنس کر ملتے اس لئے نہیں، کہ محلے میں ان کی شرافت اور خوش خلقی کی دھاک بیٹھے، بلکہ اس لئے کہ ان کا سبھاؤ ہی ایسا تھا۔ اور پھر جس شے

کو لوگ مسکراہٹ سمجھتے تھے وہ تو ماسٹر جی کے چہرے کا ایک ناگزیر حصہ تھی۔ جس طرح ناک، ہونٹ اور گردن کی ہڈی ----- خود ماسٹر جی کو بھی اپنے چہرے پر رہنے والی سدا کی مسکراہٹ کا علم نہ تھا۔ فطرت ان سے وہی کام لے رہی تھی جو وہ درخت سے لیتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ ہی بڑھتا چلا جاتا۔ لوگوں کو بنا جانے بوجھے بغیر کسی کوشش کے سایہ دیتا ہے۔ جلانے کے لئے سوکھی لکڑیاں اور سوکھے پتے فراہم کرتا ہے۔ کوئی آ کر اس کی شاخ کاٹ کر لے جاتا ہے ----- کوئی اس کے تنے پر اپنا اور اپنی محبوبہ کا نام کھود جاتا ہے۔ آخر ایک دن وہ سوکھ ساکھ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو جل کر راکھ بن جاتا ہے اور کچھ حصہ مکانوں اور دروازوں اور کھڑکیوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ تو ہر کسی کے کام پر اس لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ قدرت نے انہیں پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ اس میں نہ تو ان کی کوشش کو دخل تھا اور نہ خدمت خلق کے ہی گھٹیا جذبے کا احساس کارفرما تھا۔ یہ تو روشنائی سے بھرے ہوئے قلم والی بات تھی کہ ہاتھ میں لے کر کاغذ پر رکھیں اور وہ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

لیکن اب ان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی جنم لے رہی تھی۔

یہ تبدیلی ماسٹر جی کا شیخ فقیر دین کی چھوٹی لڑکی فرخندہ سے بڑھتا ہوا لگاؤ تھا۔ ان کے سدا کے مرجھائے ہوئے دل میں محبت کی نیم گرم چھوٹی چھوٹی لہریں بیدار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار شعوری طور پر انہیں آرزو رہنے لگی تھی۔ کہ وہ فرخندہ کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہا کریں۔ فرخندہ کا چھوٹے سا چھوٹا کام کر کے انہیں بڑی راحت ملتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ماسٹر جی اپنے جذبہ ایثار سے متعارف ہو رہے تھے بلکہ اس میں وہ لذت بھی لینے لگے تھے۔ اب ان کا جی اپنے گھر میں نہ لگتا وہ صبح ہی سے شام کا انتظار شروع کر دیتے۔ شام کو دیر تک فرخندہ کے ہاں بیٹھے رہتے۔ اسے بڑی محبت اور ذمہ داری سے پڑھاتے۔ (یہ ذمہ داری کا احساس بھی انہیں ابھی شروع ہوا تھا) وہ چائے کا طشت اٹھا کر لاتی تو اٹھ کر اس کے ہاتھ سے تھام لیتے اور چائے کی پیالی بنا کر اس اپنے ہاتھ سے دیتے اسے ہونٹ ذرا سکیڑ کر پیتے ہوئے بڑے پیار سے دیکھتے۔ ایک دفعہ فرخندہ کو سر درد نے آ لیا۔ ماسٹر جی بڑے پریشان ہوئے وہ روزانہ اس کے لئے ہومیوپیتھی کے سفوف اور اسپرو کی ٹکیاں لے کر آیا کرتے۔ آتے ہی فرخندہ سے اس کی سر درد کا حال پوچھتے۔ فرخندہ کی امی سے مل کر انہیں تاکید کرتے کہ فرخندہ کو سونے سے پہلے گرم گرم دودھ کی پیالی ضرور پلا دیا کریں۔ فرخندہ گلاب

جامن بڑے شوق سے کھایا کرتی تھی۔ ماسٹر جی نے اپنی سکول کی تنخواہ سے دس روپے نکال کر محلے کے حلوائی کو پیشگی دے دیئے اور اب فرخندہ کے لئے ہر روز دو تین گلاب جامن اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ فرخندہ نے انہیں بہت منع کیا کہ آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں۔ مجھے گلاب جامنوں کا اتنا شوق نہیں ہے۔ ماسٹر جی غمگین سے ہو کر چپ ہو گئے۔ اگر اس وقت انہیں کوئی غور سے دیکھتا تو اسے پہلی بار ماسٹر جی کے چہرے کی مسکراہٹ ماند پڑتی دکھائی دیتی۔ وہ عینک کے شیشے صاف کرنے لگے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں، کہ میں ---- اپنی بچی کو گلاب جامن کھلا کر ہی خوش ہو سکوں؟"

فرخندہ نے سر جھکا لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ محبت، عظمت اور ایثار کی دھیمی دھیمی خوشبو دار سی ہوا اس کے چاروں طرف چل پڑی ہے۔ اس کے بعد اسے ماسٹر جی کی کسی بات پر اعتراض کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ ماسٹر جی کو معلوم تھا کہ فرخندہ اپنے کمرے والے گلدان میں پھول ضرور لگایا کرتی ہے۔ یہی وہ خیال تھا جس کے زیر اثر انہوں نے اس روز کھیت میں آلوچے کی شاخیں توڑی تھیں۔ آلوچے کے شگوفے تو وہ حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن لوہاری دروازے سے وہ ہفتے میں ایک آدھ بار فرخندہ کے گلدان کے لئے کسی نہ کسی موسمی پھول کا گلدستہ ضرور لے آتے۔ فرخندہ باسی پھول نکال کر ماسٹر جی کے لائے ہوئے پھول لگا لیتی۔ ماسٹر جی خوشی اور فخر کے ملے جلے جذبات سے سرشار ہو جاتے۔ فرط مسرت سے ان کے ایک طرف کو لٹکے ہوئے ہونٹ کپکپانے لگتے۔ اور ان کے دل میں ایک شیریں سا درد جاگ اٹھتا۔ وہ کوٹ کے اندر ہی اندر سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتے۔ اور ازلی و ابدی محبت کی نورانی چوکھٹ پر اپنا سفید بالوں والا سر رکھ دیتے۔ وہ فرخندہ کے گلدان والے باسی پھول اپنے رومال میں باندھ کر جیب میں رکھ لیتے۔ فرخندہ ہنستے ہوئے پوچھتی۔

"ماسٹر جی ---- بھلا انہیں آپ کیا کریں گے"۔

ماسٹر جی مسکرا کر کہتے۔

"باسی پھولوں کی گلقند بڑی مزیدار بنتی ہے۔

"ارے ---- تو کیا آپ ان کی گلقند بنائیں گے؟"

"ہاں"

گھر جا کر ماسٹر جی پھولوں کی ان باسی پتیوں کو اپنے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیتے۔ انہیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں ان کی حاسد اور شکی مزاج بیوی کی نظر نہ پڑ جائے۔ چنانچہ وہ ان پتیوں کو ٹرنک میں اس طرح بکھیر دیتے جس طرح بعض لوگ ٹڈیوں سے کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لئے نیم کی خشک پتیاں بکھیر دیا کرتے ہیں۔ ایک دن ماسٹر جی فرخندہ کو پڑھانے آئے، تو وہ نشست گاہ میں اپنی امی، بہن بلقیس اور بھابی عذرا کے ساتھ بیٹھی بیر کھا رہی تھی۔ ماسٹر جی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بیروں کا موسم بھی آ گیا۔"

فرخندہ نے ہنس کر کہا۔

"مگر یہ تو ہماری اپنی بیری کے ہیں۔"

امی بولیں۔

"فرخی بیٹا ---- ماسٹر جی کو تازہ بیر جھاڑ کر لا دے۔"

فرخندہ نے آنگن میں جا کر بیری کی شاخ سے بندھی ہوئی رسی کو پکڑ کر تین چار جھکولے دیئے اور آنگن میں لال لال ہرے ہرے بیروں کی بارش ہونے لگی۔ بلقیس اور عذرا کے بچے گھٹنوں کے بل ادھر ادھر خوشی اور گھبراہٹ سے دوڑنے بھاگنے لگے۔ فرخندہ بیروں کی تھالی بھر کر اندر لے آئی۔ ماسٹر جی نے بڑے مزے سے بیر کھائے۔ فرخندہ گھٹلیاں کونے میں پھینکتی جا رہی تھی۔ جب ماسٹر جی روز کا سبق پڑھا چکے تو انہوں نے فرخندہ کو پانی کا گلاس منگوانے کے بہانے باہر بھیجا اور خود کونے میں پڑی ہوئی گھٹلیاں اٹھا کر انہیں کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ گھر آ کر انہوں نے ان گھٹلیوں کو بھی ٹرنک میں پھولوں کی باسی پنکھڑیوں کے ساتھ ہی سنبھال کر رکھ دیا۔ اس وقت ماسٹر جی کو اس بد نصیب باپ کا گمان ہوا جو اپنے مرے ہوئے بچے کی نشانیاں اکٹھی کر رہا ہو۔ کسی روز وہ ان نشانیوں کو سینے سے لگا کر خوب روئیں گے۔ لیکن کیا وہ ان سب بچوں کے سوگوار باپ نہیں۔ جو پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئے ہوں؟ کیا فرخندہ ان تمام جھیلے ہوئے دکھوں، اذیتوں، پچھتاووں، ندامتوں اور ان تمام گہری اور بے کراں خوشیوں کی علامت نہ تھی جو ماسٹر جی کے حصے میں کبھی نہ آئی تھیں؟ ماسٹر جی کو تو صرف یہ خیال ہی لذت انگیز مسرت سے ہمکنار کئے ہوئے تھا کہ خوشی اگرچہ ان کے پاس کبھی نہیں آئی۔ لیکن وہ ان کا نام تو جانتے ہے۔ اس اعتبار سے ان

کی حالت بالکل اس عورت کی سی تھی۔ جو اشکبار آنکھوں سے جلے ہوئے مکان سے اپنے ان ریشمی کپڑوں کے چیتھڑے اکٹھے کر رہی ہو جو اس نے ابھی نہ پہنے ہوں۔

سدھائے ہوئے جانور کی طرح ماسٹر جی کا ضمیر ان سے جو کرواتا وہ اعتراض کئے بغیر کئے چلے جاتے۔ چپکے ہی چپکے، اندر ہی اندر اس ہوشمند اور دور اندیش ناگ نے ماسٹر جی کی شکست خوردہ جنسی تمناؤں کو آب زمزم پلا کر تقدس کا جامہ پہنا دیا تھا۔ ماسٹر جی جنسی تشنگی کی اس کایا پلٹ سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ ان کی سادگیٔ طبع کے طویل سلسلے کی قدرتی کڑی تھی۔

آج سے بیس بائیس برس پہلے اگر فرخندہ انہیں ملتی، اور ان کی اسی طرح خبر گیری کرتی تو ماسٹر جی کی محبوبہ ہوتی۔ لیکن ماسٹر جی عمر کے اس حصے میں تھے، جہاں وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کو اپنی محبوبہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی مسلسل ناکامیوں اور نامرادیوں کی زندگی رہی تھی۔ ستم زدہ حالات اور شکست خوردگی کے پیہم صدمات نے عمر کی اس منزل پر پہنچ کر ان سے یہ امتیاز ہی چھین لیا تھا کہ بیوی کی محبت اور محبوبہ کی محبت اور بیٹی کی محبت کے خانے بنا کر رکھیں۔ ادھیڑ عمر میں یہ خانے وہ لوگ بناتے ہیں، جنھیں عام طور پر جنسی تفریق کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور جن کے ضمیر کی کھڑکی میں سے ایک ننگی آنکھ ہر شے کو ہر وقت عریاں دیکھتی رہتی ہے۔ اسی قسم کی ایک پوشیدہ کھڑکی ماسٹر جی کے اندر بھی تھی۔ جہاں ایک سرخ چشم خشم آلود عفریت پھنکارتا رہتا مگر ماسٹر جی اس کے وجود سے لاعلم تھے۔ فرخندہ کے وجود میں انہیں ماں کی شفقت، بیوی کا ایثار اور محبوبہ کی محبت، سبھی کچھ بیک وقت مل گیا تھا۔ ایثار، شفقت اور محبت کے اس آمیزے نے ایک چھوٹی سی بیٹی کا روپ دھار لیا تھا۔ جو ماسٹر جی کی انگلی پکڑے انہیں زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے نکال کر ان راستوں پر کشاں کشاں لئے جا رہی تھی جہاں سایہ دار درختوں کے جھنڈ تھے۔ اور پھولوں سے لدی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کے جنگل تھے۔

اس انوکھی اور کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی بڑی ہی چھپی ہوئی بڑی ہی عریاں محبت کی دبی دبی آگ ایک عرصے سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، ایک روز اچانک اس کا ایک بھرپور شعلہ سا بھڑک اٹھا اور ماسٹر جی چکا چوند ہو کر رہ گئے۔ ہوا یوں کہ ایک روز ماسٹر جی پڑھاتے پڑھاتے بہت تھک گئے۔ صبح ان کی بیوی نے ان سے بڑی سخت لڑائی کی تھی۔ دن بھر ان کا سر پتھر بنا رہا تھا۔ تیسرے پہر فرخندہ کو پڑھانے کے بعد ان کا سر درد سے

پھٹنے لگا۔ انہوں نے سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کو سہلانے لگے۔ فرخندہ نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

"ماسٹر جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

ماسٹر جی نے آنکھیں بند کر رکھیں تھیں اور میلے میلے سے ہونٹوں کو درد کی ٹیس کی وجہ سے اندر کو بھینچ رکھا تھا۔ انھوں نے فرخندہ کے سوال پر آنکھیں کھول دیں اور عینک اتار کر اس کے شیشے پونچھنے لگے۔

"یونہی ذرا سر درد کرنے لگا ہے۔"

"میں دبا دوں۔"

ماسٹر جی حیران سے ہو کر رہ گئے۔ کیا کوئی ان کا سر بھی دبا سکتا ہے؟ زندگی میں انھیں کئی بار سر میں درد ہوا تھا۔ لیکن کسی نے ایک بار بھی ان کا سر نہ دبایا تھا۔ ماسٹر جی کو فرخندہ کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ میں ضرور سر دبا دوں گی۔"

اور فرخندہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ اٹھ کر ماسٹر جی کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی اور ان کا بوڑھا، سوکھا سا کمزور سر اپنے جوان گرم ننھے منے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ ماسٹر جی کو یوں لگا جیسے انہیں کوئی پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کے بعد گدیلے والے بستر پر تھپک کر سلا رہا ہے۔ اس روز انھیں محسوس ہوا کے ان کا سارا بدن درد کرتا ہے۔ ایک ایک عضو، ایک ایک انگ دکھتا ہے۔ ان کے تھکے ماندے ٹوٹے پھوٹے جسم کے ایک ایک حصہ کو فرخندہ کے ہاتھوں کے گرم گرم دباؤ کی ضرورت ہے۔ اچانک ان کے سارے درد، ساری تکلیفیں، ساری اذیتیں اور سارے غم جاگ اٹھے تھے۔ فرخندہ کے نازک ہاتھوں نے ماسٹر جی کے جسم کے ان پوشیدہ تاروں کو چھیڑ دیا تھا جو مضراب کے انتظار میں زنگ آلودہ ہو چکے تھے۔ جس طرح گیلے کپڑے آگ کے سامنے بھاپ دینے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ماسٹر جی کے دل سے خوشی کی لہریں سی اٹھنے لگی تھیں محبت کے اس پہلے میٹھے بول نے ان کی روح میں چیخ و پکار مچا دی تھی۔ ان کے بدن کا ذرہ ذرہ انتہائی اشتیاق کے عالم میں ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ اس لالچی بہرے کی طرح جسے پہلی بار سماعت ملی ہو، اور جو ایک

پل میں دنیا جہان کی آوازیں سن لینا چاہتا ہو۔ انہیں اس ماں کی ممتا بھری تھپکیاں یاد آنے لگیں' جو انہیں کبھی نہیں ملی تھیں۔ انہیں اس بیوی کا محبت بھرا ہاتھ یاد آیا' جو ان کی طرف کبھی نہیں بڑھا تھا۔ انہیں اس محبوبہ کا ریشمی پر محبت گرم لمس یاد آگیا جو انہیں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ انہیں اس بچی کی یاد آگئی جنہیں وہ کبھی پیار سے اپنی بیٹی نہیں کہہ سکے تھے۔ انہیں وہ بہنیں یاد آگئی جنہوں نے کبھی ماسٹرجی کو بھائی جان کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ ان بھائیوں کا خیال ستانے لگا جو کبھی ان کی زندگی میں نہیں آئے تھے۔ ماسٹرجی کو اپنے ٹوٹے ہوئے بازو پر شکستہ امنگیں' شکستہ دل آرزوئیں' نیم جان تمنائیں اور زخم خوردہ دل یاد آنے لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ میدان جنگ میں لاشوں کے بیچ میں سے گزر رہے ہوں۔ وہ ایک لاش کے منہ پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھنے لگے۔ یہ ان کی ماں ہے۔ یہ بھائی ہے۔ یہ بہن ہے۔ یہ بیٹی ہے' یہ بیوی ہے' اور یہ محبوبہ ہے......

ماسٹرجی کو اب اپنی بے بسی اور گھریلو زندگی کی زبوں حالی کا شدید احساس رہنے لگا۔ جس طرح بادلوں کی خوفناک گرج کے بعد سناٹا زیادہ شدید ہو جاتا ہے اور بجلی چمکنے کے بعد اندھیرا زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ماسٹرجی کے ساتھ ہوا تھا۔ اب انہیں محسوس ہوا ان کی بیوی انتہائی بدمزاج' چڑچڑی' بدسلیقہ' سدا کی روگی' بدصورت اور بوڑھی ہے' اور اس کے چہرے کی کھچی ہوئی بدرنگ کھال پر مکروہ نیلی رگیں ابھری ہوئی ہیں۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی کے چہرے پر بیماری اور بڑھاپے کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھا۔ انہوں نے اپنی کوٹھڑی میں لگے ہوئے جالے دیکھے۔ ستلی سے بندھی ہوئی بجلی کی تار کو دیکھا جسے مکھیوں نے سیاہ کر دیا تھا۔ دوسری منزل کی کارنس پر لمبوترے نیلے گلدان کی بجائے بدہضمی' سردرد' مرگی' کمر درد کی دوائیاں' سفوف اور معجونیں دیکھیں۔ اپنی تپائی کے نیچے گرد آلود ادھڑی ہوئی کتابوں کا ڈھیر اور ٹوٹی ہوئی تام چینی کی بدوضع چلینک دیکھی۔ گویا ماسٹرجی کی جیب کٹ گئی ہو' اور انہیں کھوئی ہوئی رقم کی پائی پائی یاد آ رہی ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے کمرے کا حلیہ بدل سکتے۔ بیوی کو اس کی بدسلیقگی اور پھوہڑپنے کا طعنہ دیتے اور انگیٹھی پر دوائی کی بوتلوں کی جگہ شیشے کا پھولوں سے بھرا ہوا گلدان لاکر رکھتے۔ وہ حسب معمول اب بھی بیوی کی جھڑکیاں سنتے۔ اسے غشی کا دورہ پڑتا تو بھاگ کر اس کے لئے دوائی لاتے آگ جلاتے اور چائے بنا کر دیتے۔ اس کا بستر درست کرتے اس کا سر اور پاؤں دباتے۔ اور اگر دل ریوڑیاں کھانے کو چاہتا تو بازار سے ریوڑیاں لا کر اسے دیتے۔ لیکن اب یہ سب کام بے جان مشین کی طرح نہیں بلکہ اس جوشیلے بچے کی طرح سرانجام دیتے جسے رات کو مٹھائی کھانے کا لالچ دیا گیا ہو۔ دن بھر

فرخندہ کے ہاں جانے کا خوبصورت خیال، ماسٹرجی کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ اس خیال کی شکر ملی گولی کو کلے میں دبائے وہ اس کے رس کا مزا سارا دن لیتے اور بیوی کی ہر گھڑی کی ہر ناانصافی کو ہنسی خوشی برداشت کرتے چلے جاتے۔ تیسرے پہر جب وہ فرخندہ کے گھر کو روانہ ہوتے تو ان کا ادھڑا ہوا تھکا ہارا وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا دل خوشی سے نومولود بچے کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا ہوتا۔ اب انہیں مصری شاہ کے پل پر پہنچتے ہی گلاب کے پھولوں کی خوشبو آتی محسوس ہوتی۔ وسن پورے کے چوک کا موڑ گھومتے ہوئے انہیں فرخندہ کے بالوں میں لگے ہوئے خوشبودار تیل کی مہک سونگھائی دیتی۔ اور اس کی گلی میں داخل ہو کر انہیں یوں لگتا جیسے فرخندہ انہیں آواز دے رہی ہو۔

"ماسٹرجی! ماسٹرجی!"

وہ دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستک دیتے۔ کبھی عذرا کبھی بلقیس اور فرخندہ کا بھائی اسلم آکر دروازہ کھولتا۔ ماسٹر کو ان سبھوں میں فرخندہ کے دل نشیں انداز کا میٹھا سبھاؤ ملتا۔ وہ سر جھکائے چپکے سے نشست گاہ میں کھڑکی والے صوفے پر آکر بیٹھ جاتے۔ جب فرخندہ کتابیں ہاتھ میں لئے اندر آکر انہیں سلام کرتی تو کمرے میں ایک دم روشنی سی پھیل جاتی اور حنا کی خوشبو کی دھیمی دھیمی لہروں پہ پرسکون بھنور سے پڑنے لگتے۔ انہیں یوں لگتا جیسے وہ سیلے فرش، نم دیواروں اور دھوئیں سے بھرے ہوئے باورچی خانے سے نکل کر لیموں سے لدے ہوئے پیڑوں کے درمیان اُگے ہوئے مخملیں گھاس پر آکر بیٹھ گئے ہوں۔ فرخندہ کے بھورے بالوں والا سر دوپٹے سے نصف ڈھکا ہوتا۔ درمیان سے نکلی ہوئی مانگ پر سورج کی چٹان میں سے بہنے والی دودھ کی ندی کا گمان ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے متناسب کانوں کے پاس بالوں کے دو تین چھلے باہر نکلے ہوتے۔ جب کھڑکی میں سے ہوا اندر آتی تو چھلے لرزنے لگتے۔ ماسٹرجی کا جی چاہتا کہ وہ فرخندہ کے خوب صورت سر کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھام کر بڑی محبت اور شفقت سے اپنے خشک ہونٹوں سے اس کی پیشانی چوم لیں۔ مگر یہ آرزو ان کے دل کے گہرے کنوئیں میں گری ہوئی بلی کی طرح انہیں درد انگیز آوازیں دے کر ہی رہ جاتی۔ کسی سوال کا جواب سنتے وقت فرخندہ ماسٹرجی کی طرف اپنی نسواری آنکھیں جھپکا کر دیکھتی تو ماسٹرجی کی نظریں خود بخود جھک جاتیں، اور وہ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے۔ اسے آہستہ آہستہ پینے لگتے، اور ساتھ ساتھ فرخندہ کو سبق بھی بتلاتے

جاتے۔ پھر شام کی سنہری کرنیں، باہر کھیتوں، مکانوں، مسجد کے گبندوں بیناروں اور گلیوں میں پھیلنے لگتی۔ لال لال سورج شہر کی جانب بادشاہی مسجد کے پیچھے ڈوبنے لگتا۔ کھڑکی کے باہر سے کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ فرخندہ کام ختم کرکے کاپیاں سنبھالتی اور چائے لینے چلی جاتی۔ کبھی وہ دونوں استاد شاگرد مل کر چائے پیتے، اور کبھی ان کے ساتھ عذرا بھابی، بلقیس، اکبر اور اسلم بھی شریک ہو جاتے۔ شیخ فقیر دین صاحب رات کو منڈی سے گھر آتے تھے۔ ماسٹر صاحب سے ان کی ملاقات بہت کم ہوتا کبھی کبھی راستے میں ملاقات ہو جاتی شیخ صاحب نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوتے۔ اردو کا بار بار پڑھا ہوا چرمرا اخبار بغل میں داب رکھا ہوتا۔ بکری کی کھال کی بوسیدہ ٹوپی سر پر منڈھی ہوتی۔ پاؤں میں گرد آلود جوتے ہوتے۔ سڑک کے کنارے کنارے جھک کر مگر بڑی چوکنی آنکھوں سے ہر راہ گیر کا جائزہ لیتے آرہے ہوتے۔ ماسٹر جی سے بڑی محبت سے مصافحہ کرتے۔ پھولی ہوئی سبز ناک انگلی سے رگڑ کر میلی کچیلی بے رس آنکھیں سکیڑ کر ان سے پوچھتے۔

"بیٹی نے کچھ پہلے سے ترقی کی ہے کیا؟ بس پاس ہو جائے ہمیں تو صرف یہی غرض ہے۔ کہیں اس پر لگی ہوئی رقم نہ ڈوب جائے۔ اتنا خیال رکھیئے گا۔"

ماسٹر جی انھیں تسلی دیتے کہ فرخندہ بڑی ذہین لڑکی ہے اور وہ بڑی محنت سے پڑھائی کر رہی ہے۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔ اس بار وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوگی۔۔۔۔"

شیخ صاحب بڑے خلوص سے ماسٹر جی کا ہاتھ دبا کر کہتے۔

"پاس ہو جائے تو ہماری جان بھی اس مصیبت سے نکلے آپ جانتے ہیں کہ قحط سالی میں چالیس روپے ہر مہینے جیب سے نکالنے کتنے مشکل ہیں۔ اچھا جو میرے خدا کو منظور ۔۔۔۔ سلام و علیکم۔"

ماسٹر جی کو حقیقت میں شیخ صاحب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ فرخندہ اچھے نمبر لے کر پاس ہو جائے۔ کیونکہ اس میں فرخندہ کی مسرت کا راز پنہاں تھا۔ چنانچہ وہ انہیں دل لگا کر اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ چائے پر نشست گاہ میں بڑی رونق رہتی۔ فرخندہ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر ماسٹر جی کو دیتی۔ ماسٹر جی بڑے مزے لے لے کر چائے کی پوری بھری ہوئی دو پیالیاں چڑھا جاتے۔ ساتھ بسکٹ بھی کھاتے اور سگریٹ بھی پیتے۔ فرخندہ کو جی

بھر کر دیکھتے بھی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتے، اس کی آواز بھی سنتے۔ اسکی نسواری نسواری چمکیلی آنکھوں کو بڑی محبت اور عقیدت سے تکا کرتے۔ من ہی من میں اس کے اڑتے ہوئے ریشمی بالوں میں اپنے ہاتھ پھیرتے۔ اس کے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتے اور اس کی پیشانی چوم لیتے۔ اس خاوند کی طرح جو پردیس میں مرتے وقت دور افتادہ بیوی کو یاد کرکے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس باپ کی طرح جو سالوں بعد اپنے گھر آ کر اپنی جوان ہو چکی بچی کو گود میں اٹھانے کی بجائے صرف اس کی پیشانی چوم کر محبت سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔

فرخندہ بھی ماسٹر جی کا بے حد خیال رکھتی، اور ان سے بڑی محبت اور گہری عقیدت سے پیش آتی۔ ان کی ذرا ذرا سی خواہش کو پورا کرتے ہوئے بڑا فخر محسوس کرتی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ خود ماسٹر جی کا فرخندہ سے برتاؤ بڑا شفقت بھرا تھا اور وہ اس کے ساتھ اپنی چہیتی بیٹیوں ایسا سلوک کرتے۔ اس کے لئے دوسرے تیسرے روز پھول اور گلاب جامن لاتے۔ اسے ذرا کوئی تکلیف ہوتی تو گھر والوں کے ساتھ وہ بھی پریشان ہو جاتے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ماسٹر جی میں باپ کی اس روائتی محبت کا جوہر ملا تھا۔ جو شیخ فقیر دین کے ہاں بالکل نہیں تھا۔ فرخندہ کی والدہ بڑی مطمئن تھی کہ ان کی بچی کا ماسٹر جی کے ساتھ دل لگ گیا ہے۔ اور وہ بڑی دل جمعی سے پڑھائی کر رہی ہے۔ اکبر اور شیخ صاحب کو ان سے سوائے اس کے اور کوئی غرض نہ تھی کہ وہ ان کی لڑکی کو امتحان میں پاس کروادیں۔ فرخندہ کی بھابی عذرا اور بڑی بہن بلقیس بھی ماسٹر جی کی نرم مزاجی اور سادگی کو بہت پسند کرتی تھیں۔ کبھی کبھی فرخندہ کی دبلی پتلی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانے والی سہیلی انجم بھی وہاں آجاتی اور ماسٹر جی اور فرخندہ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی۔ اس وقت اگر باہر بارش ہونے لگتی تو لڑکیوں کی باتوں میں بڑی گرمجوشی آجاتی۔ روشندانوں کے چھجوں پر بوندوں کی ٹپاٹپ کا سنگیت شروع ہو جاتا۔ آنگن والے بیری کے پیڑ میں طوطے گیلے پر سمیٹ کر دبک جاتے۔ گلی والے درختوں کی بارش میں بھیگتی ہوئی ٹہنیاں تیز ہوا میں مکان کی دیوار سے اپنا آپ جھاڑنے لگتیں۔ فرخندہ کی نسواری آنکھوں کی چمک دوبالا ہو جاتی۔ چہرہ گرم ہو کر سانولا ہو جاتا۔ اور گردن پر نیم سنہری باریک بالوں کا رواں تھرتھرانے لگتا۔

اس گھر میں اگر کوئی شخص ماسٹر جی کے وجود سے بیزار تھا تو وہ فرخندہ کا خالہ زاد بھائی

سوکھا ساکھا، چھائیوں بھرے چہرے اور چوہیا ایسی آنکھوں والا ادبیات کا طالب علم خالد تھا۔
اس کو ماسٹر جی سے محض اس لئے بیر ہو گیا تھا کہ فرخندہ انھیں چائے بنا کر دیتی تھی۔ اور ان
کی ہر بات پر جی کہتی تھی۔ فرخندہ نے محض اسے جلانے کے لئے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ماسٹر جی
کا سر درد کرنے لگا۔ تو اس نے سر دبا دیا۔ اور درد جاتا رہا۔ خالد کا سینہ جل کر کباب ہو گیا۔
اسے ماسٹر جی سے نفرت ہو گئی۔ اس نے سکیڑے ہوئے ہونٹوں اور نفرت سے اوپر کو
سکوڑی ہوئی ناک کے ساتھ یہ بات سنی، اور محض اپنی رشتہ داری کا رعب جمانے کے لئے دبی
زبان میں کہا۔

"تمہیں غیر مرد کا سر نہیں دبانا چاہیے"۔

فرخندہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"ماسٹر جی تو میرے باپ کی جگہ ہیں"۔

خالد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فرخندہ ماسٹر
جی کو باپ سمجھتی ہے یا دادا جان۔ وہ تو صرف اس خیال سے جلتا تھا کہ وہ ان کا اتنا ذکر کیوں
کرتی ہے؟ اتنا خیال کیوں رکھتی ہے؟ اگر فرخندہ یہی دلچسپی اپنے بھائی میں لیتی تو خالد کو اس
سے بھی نفرت ہو جاتی۔ فرخندہ کو جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ میاں
صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس سے عشق فرما
رہے ہیں۔ اس نے خالد کو بات بات پر جلانے کی قسم کھالی تھی۔ مگر جس سے وہ محبت کرتی
تھی اس نے اس کے خط کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ خوش شکل، صحت مند اور گداز جسم
لڑکیوں سے کلاسیکی انداز میں عشق کرنے اور انہیں اپنے دام میں پھنسانے والے مسعود کو
فرخندہ کا خط مل گیا تھا۔ لیکن وہ فرخندہ کو جواب اس وقت دینا چاہتا تھا۔ جب وہ انتظار کرتے
کرتے تھک جائے۔ ہمارا پیشہ ور عاشق یوں لڑکیوں کی آتش عشق کو ہوا دیا کرتا، اور جب وہ
جذبات کی ماری دوڑی دوڑی اس سے ملنے آتیں تو وہ انہیں بڑی آسانی سے رام کر لیتا۔

آخر ایک روز انجم سہمی سہمی سی فرخندہ کے پاس آئی، اور اسے مسعود کا خط دیا۔ وہ
بڑی ڈری ہوئی تھی۔ فرخندہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ انجم نے کہا۔

"فرخی! خدا کے لئے اسے کہو اب میرے پتے پر خط نہ لکھے۔ اگر گھر میں کسی نے خط
کھول لیا تو مجھ پر مصیبت آجائے گی"۔

"اری مری کیوں جاتی ہے۔ وہ تو لڑکی بن کر خط لکھتا ہے"۔

"فرخی تم نہیں جانتیں۔ بھائی جان کو شک پڑ گیا ہے۔ وہ آج بھی لفافہ ہاتھ میں لے کر
بڑے غور سے لکھائی دیکھ رہے تھے۔ کیا تمہیں میری عزت کا اتنا بھی خیال نہیں ہے"۔

"اچھا بابا میں منع کر دوں گی۔ بس۔۔۔۔۔۔"

"مگر پھر تم خط کیسے منگواؤ گی؟"

"تمہیں اس سے کیا؟ اب تم جاؤ اور مجھے خط پڑھنے دو"۔

انجم چلی گئی اور فرخندہ نے اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازے کو چٹخنی لگائی اور
دھڑکتے ہوئے دل اور بیتاب آنکھوں کے ساتھ خط کھول کر پڑھنے لگی۔ خط مختصر مگر محبت
کے جذبات سے بھرپور تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا۔ مسعود نے خط کے جملے گالزوردی کے "سیب
کے درخت" اور ہارڈی کے ناول "ٹس" میں سے نقل کئے تھے۔ آخر میں اس نے کچھ اپنے
جملے لکھے تھے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ میں پرسوں صبح نو بجے چڑیا گھر کے دروازے پر
تمہارا انتظار کروں گا۔

وہ پرسوں مسعود سے ملنے جائے گی! فرخندہ کے دل میں مسرتوں کی مہتابیاں چھوٹنے
لگیں۔ مگر وہ کیسے جائے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ فکر مند سی ہو گئی۔ پھر کیا ہوا
محبت میں وہ سب کچھ کر گزرے گی۔ مسعود اس سے اتنی شدت سے محبت کرتا ہے، اور وہ
بھی اس سے اتنا پیار کرتی ہے۔ پھر وہ کیوں نہ اس سے ملنے جائے؟

فرخندہ نے ایک روز پہلے ہی سے گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ پرسوں اپنی نئی قمیض درزی
کو دینے انجم کے ساتھ انار کلی جا رہی ہے۔ اگلے روز ماسٹر جی اسے پڑھانے آئے۔ تو وہ
کمرے میں اپنی بہترین قمیض استری کر رہی تھی۔ کریپ کی تربوزی قمیض تھی جس پر
چھوٹے چھوٹے نیلے اور بسنتی پھول بنے ہوئے تھے۔ یہ فرخندہ کو بڑی پھنس کر آتی۔ اور اس
کے جسم کے تمام خطوط صاف دکھائی دینے لگتے۔ وہ یہ قمیض پہن کر کل صبح اپنے محبوب سے
ملنے جا رہی تھی۔ ماسٹر جی کو نشست گاہ میں فرخندہ کا انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ نیچے آئی تو اس کا
رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ بالوں کو دھو دھلا کر اس نے یونہی کنگھی کئے بغیر پیچھے ڈال رکھا تھا۔ جن
میں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کی قمیض میں جذب ہو رہے تھے۔

"ماسٹر جی مجھے دیر تو نہیں ہو گئی۔ دراصل میں اپنی قمیض استری کر رہی تھی"۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟"

"جی نہیں۔ کہیں نہیں، بس یونہی استری کر رہی تھی"۔

فرخندہ نے کچھ شرما کر کچھ گبھرا کر جواب دیا۔ اب اس نے کتاب کھولی اور ماسٹر جی سے سبق لینے لگی۔ اس کی نگاہیں کتاب پر تھیں۔ مگر وہ خود چڑیا گھر کے باہر کھڑی مسعود سے باتیں کر رہی تھی۔

٩

مئی کے دن تھے۔

سورج نے صبح ہی سے آگ برسانا شروع کر دی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق پورے آٹھ بجے انجم فرخندہ کے ہاں آ گئی۔ آج اس نے بھی اپنی عینک کے شیشوں کو رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رکھا تھا۔ دل ہی دل میں وہ سہمی ہوئی تھی کہ اگر کسی رشتہ دار نے انہیں وہاں دیکھ لیا تو مصیبت ہی آ جائے گی۔ مگر فرخندہ بڑی خوش تھی۔ پورے آٹھ بجے وہ اپنے وسن پورے والے گھر سے باہر نکل پڑیں۔ انہیں چوک میں ہی تانگہ مل گیا۔ پیسہ اخبار میں ان دونوں کی مشترکہ سہیلی رہتی تھی۔ طے یہ پایا کہ انجم اس لڑکی کے گھر میں رہے گی۔ اور فرخندہ وہاں سے مسعود کو ملنے چڑیا گھر چل دے گی۔ اپنی سہیلی کے ہاں جا کر فرخندہ نے خوب میک اپ کیا۔ اپنی سہیلی سے برقعہ بدلوایا، اور انجم کی جلد واپس آنے کی پر زور تاکیدوں کے درمیان وہ چڑیا گھر کی طرف چل پڑی۔

نیلے گنبد جا کر اسے تانگہ ملا۔ اس وقت نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ ساری انار کلی اسے پیدل چلنا پڑا۔ جس کی وجہ سے اسے پسینہ آ گیا۔ نقاب کے اندر ہی اندر وہ چہرے پر رومال پھر کر میک اپ ٹھیک کر لیتی۔ گردن پر پیچھے کی جانب پاؤڈر کی سفید سفید لکیریں سی پڑ گئیں۔ تانگے میں بیٹھ کر ذرا ہوا لگی تو پسینہ خشک ہوا ریگل کے چوک میں ٹریفک کی وجہ سے تانگہ رک گیا۔ فرخندہ نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ نو بجنے میں صرف تین منٹ باقی تھے۔ وہ اڑ کر چڑیا گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس نے کوچوان سے کہا کہ وہ کسی طرف سے نکل جائے۔ مگر ٹریفک کانسٹیبل نے ابھی تک ہاتھ کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ خدا خدا کر کے راستہ کھلا اور تانگہ چیئرنگ کراس کی طرف روانہ ہو گیا۔ باغ جناح کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی فرخندہ نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے مسعود کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ کیا وہ نہیں آیا؟ شاید یہی کہیں کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا ہو۔ تانگہ چڑیا گھر کے دروازے کے بالکل پاس جا کر رک گیا۔ فرخندہ تانگے میں ہی بیٹھی رہی۔ اس نے کوچوان سے کہا۔

"تانگہ ذرا ایک طرف کھڑا کرلو۔ مجھے ذرا انتظار کرنا ہے"

لاہوری کوچوان پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کی سواری اسے تانگہ تیز چلانے کو کیوں کہہ رہی ہے۔ عام طور پر کوچوان ایسی لڑکیوں کی عزت نہیں کرتے۔ اور وہ انہیں کوئی وقت نہیں دیتے۔

چنانچہ اس نے صاف انکار کردیا۔

"بی بی جی! سپاہی میرا چالان کردے گا۔ میں یہاں کھڑا نہیں ہوسکتا"۔

فرخندہ بڑی پریشان ہوئی۔

"پھر میں اتر کر کہاں جاؤں؟ تم ذرا کی ذرا نہیں ٹھہر سکتے؟"

"مجبوری ہے بی بی جی"۔

"اچھا تو پھر ایک چکر لگاؤ۔ چلو میں تمہیں اور پیسے دے دوں گی۔۔۔۔۔"

کوچوان سر جھٹک کر بڑبڑاتا ہوا تانگے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو پیچھے موڑ ہی رہا تھا کہ گیٹ میں سے ایک بڑا شاندار چمکیلا تانگہ اندر آتا دکھائی دیا۔ فرخندہ نے پچھلی سیٹ پر مسعود کو فوراً پہچان لیا۔ اس نے خوشی اور اطمینان کا گہرا سانس لیا اور تانگہ وہیں رکوالیا۔ دوسرا تانگہ بھی اس کے پاس ہی آکر کھڑا ہوگیا۔ مسعود جلدی سے اتر کر فرخندہ کے پاس آیا۔

"صرف پانچ منٹ لیٹ ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔ اسے کیا دینا ہے؟"

مسعود نے تانگے والے کو ڈیڑھ روپیہ دیا اور فرخندہ کو ساتھ لے کر اپنے تانگے میں آکر بیٹھ گیا۔ تانگہ انہیں لے کر لارنس روڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ مسعود نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ، سفید پتلون اور کریم کلر کا چمڑے کا پتلے تلے والا اکیشن جوتا پہن رکھا تھا۔ اسکے ماتھے اور ہونٹوں پر ذرا ذرا پسینہ آیا ہوا تھا۔ رنگ گرمی کی وجہ سے نکھرا ہوا تھا۔ اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے سگریٹ سلگا کر فرخندہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"کہو کیا حال ہے؟"

فرخندہ نے منہ پھیر کر کہا۔

"میں نہیں بولتی"۔

"کیوں؟"

"تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟"

"تمہاری قسم صرف پانچ منٹ لیٹ پہنچا ہوں اور وہ بھی اس لئے کہ راستے میں ایک جگہ تانگے کو ٹریفک کی وجہ سے رکنا پڑا۔

اصل میں فرخندہ کو اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ اس نے مسعود کو اپنے انتظار میں چڑیا گھر کے باہر بے چینی سے ٹہلتے ہوئے نہیں دیکھا اور اس کے بالکل ہی الٹ وہ پہلے پہنچ گئی۔ جب مسعود نے بڑی شائستگی اور کلاسیکی انداز میں معذرت کردی، اور بتایا کہ اسے رات بھر اس خیال سے نیند نہیں آئی کہ صبح فرخندہ سے ملنے جانا ہے۔ تو محبت کے جذبات سے لبریز لڑکی سب گلے شکوے بھلا بیٹھی تانگہ میسن روڈ کی طرف مڑ گیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

مسعود نے اس کی طرف مسکرا کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جہاں سوائے ہمارے اور کوئی نہیں ہوگا"۔

گھوڑا زور سے خرخرایا۔ کوچوان نے تھپکی دے کر کہا۔

"جیو"

مسعود نے پہلے ہی سے میسن روڈ پر اپنے ایک دوست کی کوٹھی میں بالکل الگ تھلگ کمرے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ مسعود کے اس دوست کی فیملی پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ اور وہ اکیلا رہ رہا تھا۔ یہ دوست انہیں کوٹھی کے برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا دکھائی دیا۔ تانگہ وہاں جا کر رک گیا۔

مسعود اور فرخندہ نیچے اتر آئے۔ مسعود کا دوست اٹھ کھڑا ہوا۔ مسعود نے فرخندہ کا رسمی لفظوں میں تعارف کروایا۔ اس نے ہلکا سا سر جھکا کر آداب عرض کیا۔ اور گھڑی دیکھ کر بولا۔

"اچھا بھئی مسعود میں ذرا چھاؤنی تک جا رہا ہوں۔ تم آرام کرو کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو نوکر کو آواز دے دینا۔ بائی بائی!"

مسعود کے دوست نے گیرج میں سے سکوٹر نکال لیا اور اس پر بیٹھ کر چھاؤنی کی طرف چل دیا۔ مسعود نے مسکرا کر بڑے معنی خیز انداز میں فرخندہ کو دیکھا۔ فرخندہ نے نقاب الٹ دیا تھا، اور وہ بڑی تروتازہ لگ رہی تھی۔ فرخندہ ذرا سا شرمادی۔

مسعود فرخندہ کو ساتھ لے کر کوٹھی کے اندر آگیا۔ جس کمرے میں وہ دونوں آکر بیٹھے۔ اس کی دو کھڑکیاں تھیں، جو عقب والے باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ باغ کیا تھا بس چھوٹا سا

تنگ سالان تھا۔ سامنے ایک دیوار کھڑی تھی ۔ جو گنجان بیل میں چھپی ہوئی تھی ۔ ایک درخت کیلے کا تھا، جس کے پتے گرمی میں مرجھائے ہوئے تھے۔ دوسرا درخت لوکاٹ کا تھا جس کے چوڑے پتوں پر کیڑے پتنگوں نے جالا بن رکھا تھا۔ گھاس بے طرح بڑھی ہوئی تھی، اور اس طرف سے سبزے کی گرم گرم بو اندر آرہی تھی۔ مسعود نے اندر آتے ہی کھڑکی کے پردے کھول دیئے ۔ کمرے میں بڑا ٹھنڈا ٹھنڈا سا پرسکون اندھیرا چھا گیا۔ چھت والا پنکھا دھیمی رفتار میں چل رہا تھا۔ کمرے کی فضا خوشگوار اور خنک تھی۔ فرخندہ نے برقعہ اتار کر ایک کرسی پر رکھ دیا۔ دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا، اور پاس ہی چند ایک کرسیاں پڑی تھیں۔ چوڑی سی بھدی میز پر لکھنے کا سامان کچھ کتابیں اور ایک تھرمس بوتل رکھی تھی جس پر گرد جم رہی تھی۔ فرخندہ نے اپنے کپڑوں پر ایوننگ ان پیرس کی پوری شیشی انڈیل رکھی تھی۔ اور مسعود نے یارڈلے کا بڑا اعلیٰ اور بڑی ٹھنڈی لطیف خوشبو والا عطر لگایا ہوا تھا۔ کمرے میں دونوں قسم کی خوشبوئیں مخلوط ہو گئیں۔ فرخندہ کی طرح مسعود نے بھی آج اپنی سج دھج میں کافی وقت صرف کیا تھا۔ اس نے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر ان میں بڑے اہتمام سے چھلے ڈالے تھے۔ سگریٹ ہولڈر کی چاندی کے رنگ کو ریشمی رومال سے رگڑ رگڑ کر چمکایا تھا۔ نہانے کے بعد سارے جسم پر یوڈی کلون کی مالش کی تھی ۔ دانتوں کو دو قسم کے ٹوتھ پیسٹ سے مانجھا تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی نیلی ٹی شرٹ کی سرخ دھاریوں پر انگلی پھر کر بڑے غرور کے ساتھ گردن اکڑائی تھی ۔ بن سنور کر گھر سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس نوٹ بک پر نظر مارلی تھی ۔ جہاں اس نے مختلف ناولوں اور افسانوں میں سے محبت بھرے جملے نکال کر نوٹ کر رکھے تھے۔ وہ اس معرکہ عشق کو سر کرنے کے لئے پوری تیاریوں کے ساتھ گھر سے لیس ہو کر نکلا تھا۔ وہ فرخندہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنے قبضے میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ جس طرح کہ صفراوی مزاج کے اعصابی مریض قسم کے عاشق عام طور پر کیا کرتے ہیں۔ مسعود محبت کے اس پہلو سے ناواقف تھا۔ وہ کھری کھری سیدھی سادی ایک محدود وقت کی عشق بازی کا قائل تھا۔ طویل سرد آہوں، گرم گرم آنسوؤں، جدائی کے گلے شکوؤں اور حاسدانہ جذبات سے کوسوں دور تھا۔ فرخندہ سے اسے محبت تھی ۔ اس لئے نہیں کہ اس نے اس خواب کی دنیا میں دیکھا تھا۔ یا اس نے اپنی نگاہ کی بجلی گرائی تھی ۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ اس کے حلقہ اثر میں آئی ہوئی ایک جوان، خوب صورت اور صحت مند

بدن کی لڑکی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ ابھی تک اس کے جسم سے لذت یاب نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت ایک خاص مقام تک پہنچنے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گی ۔ اس کھلاڑی کی طرح جو بال پھینکنے کے لئے تیزی سے بھاگتے ہوئے آتا ہے لیکن واپسی پر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا ہوتا ہے۔

پھر ایک دن دوسری لڑکیوں کی طرح وہ فرخندہ سے بھی بیزار ہو جائے گا اور تازہ لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ لیکن فرخندہ نے بڑے روائتی انداز میں مسعود کو اپنا دل دے رکھا تھا۔ وہ مسعود سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور محبت کے اس جال میں مسعود کو پوری طرح قابو کر لینا چاہتی تھی ۔ تاکہ وہ کسی غیر لڑکی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اور ہمیشہ فرخندہ کا دم بھرے، اور اسی کے ساتھ زندگی کے باقی دن گذارے۔

یہ ہماری ایک متوسط گھرانے کی شریف لڑکی کا نظریہ محبت ہے جو ہمارے معاشرتی ڈھانچے سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوا جارہا ہے۔ فرخندہ مسعود کو پاگلوں کی طرح چاہتی تھی۔ اور پجاریوں کی طرح پوجتی تھی ۔ اسے مسعود کی شکل صورت ہی نہیں بلکہ اس کے کپڑوں، جوتوں، سر کے چھلے دار بالوں اور سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں تک سے پیار تھا۔ اب یہ دو بالکل ایک دوسرے سے الٹ خیالوں والے دماغ ایک دوسرے کے سامنے کمرے میں بیٹھے تھے، اور کمرہ خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مسعود نے کھڑکی پر پردہ گرا دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیا تھا۔ فرخندہ پر محبت نگاہوں سے مسعود کے چہرے کو تک رہی تھی ۔ اور کچھ مسکرا کر کچھ شرما کر ننھی منی باتیں کر رہی تھی ۔ اور مسعود ہوں ہاں کرتے ہوئے اس کے خوب صورت چھوٹے سے پیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو کریپ کی چست قمیض میں پھنسا ہوا تھا۔ فرخندہ نے اس کی نگاہوں کا سراغ لگا کر کہا۔

"قمیض دیکھ رہے ہو؟"

مسعود نے فرخندہ کے پیٹ کے ساتھ لگی ہوئی قمیض پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

فرخندہ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پرے ہٹانا چاہا۔ مسعود نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر گرمجوشی سے دبایا۔

"کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں فرخندہ؟ میں جو تم سے اس قدر محبت کرتا ہوں۔ جو رات

کو صرف تمہارا نام لے کر سوتا ہوں (یہاں مسعود نے ناولوں کے رٹے ہوئے مکالمے بولنے شروع کر دیئے) جو ایک ایک ستارے سے رات بھر تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ فرخندہ تم نے مجھ پر جادو کر رکھا ہے۔ میں کسی سے بات کرتا ہوں تو تمہاری پیاری پیاری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ کسی لڑکی کی صورت دیکھتا ہوں تو تمہاری بھولی بھالی حسین شکل سامنے آجاتی ہے۔ میں جو اتنا کھلنڈرا اور آزاد تھا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہاری محبت میں اتنی شدت سے مبتلا ہو جاؤں گا۔

فرخندہ کے کانوں میں گویا شہد انڈیلا جا رہا تھا۔ اس کی خود پرستی کو بڑی تسکین مل رہی تھی۔ اس تصور ہی سے اس کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا کہ ایک جوان اور حسین لڑکا اس کی محبت میں گرفتار ہو کر ہر لڑکی سے بے نیاز ہو بیٹھا ہے۔ محبت میں وہ اسی فاتحانہ جذبے کی قائل تھی اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ جس شخص کی پوجا کرتی ہے وہ اس کے قدموں پر گرا ہوا ہے۔ وہ اپنی وفاداری اور محبت کے جواب میں اپنے محبوب کی والہانہ دل بستگی اور لگاؤ چاہتی تھی۔ مسعود کی باتوں نے اسے رنگین چاند تاروں والی ایک بڑی ہی خوش نما دنیا میں پہنچا دیا۔ اس نے حیا سے سرخ ہو کہ آنکھیں بند کر لیں اور سر جھکا لیا۔

مسعود نے اس چہرہ اوپر اٹھایا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے فرخندہ؟ بولو! جواب دو۔ دیکھو سر نہیں جھکاؤ، آنکھیں نیچی نہیں کرو۔ میری طرف دیکھو میں تشنہ لب تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔۔۔۔؟"

فرخندہ اب بالکل ایک عام گھریلو لڑکی کے روپ میں سامنے آ گئی۔ وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اور بار بار نگاہیں نیچی کر رہی تھی۔ جب مسعود نے بہت مجبور کیا تو اس نے سر کے اشارے سے "ہاں" کہی۔ اور پھر نظریں نیچی کر لیں۔ مسعود نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ فرخندہ کے ہونٹ مسعود کے ہونٹوں سے بھینچے ہوئے تھے، اور وہ اپنے ہونٹوں پر مسعود کے دانتوں کی سختی محسوس کر رہی تھی۔ پہلے تو مسعود اس کے ہونٹ چوستا رہا۔ پھر اس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں لیکر آہستہ آہستہ کاٹنے لگا۔ فرخندہ نے ایک گہری لذت میں سرشار ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور ہونٹ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اسے اپنا جسم کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم ہوتا محسوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا بدن پورا پکا ہوا پھل ہے جس کی کھال پھٹ گئی ہے

اور میٹھا رس جگہ جگہ سے بہنے لگا ہے۔ اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ گردن سے لے کر نیچے تک چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنی بانہیں مسعود کی گردن میں ڈال دیں۔

کامیابی کی اس پہلی لہر نے مسعود کے حوصلوں کو ہوا دی۔ اس نے پوری قوت سے فرخندہ کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ فرخندہ کا دم رکنے لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔ مسعود بالکل دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ فرخندہ کے ہونٹ درد کرنے لگے تھے۔ مسعود کا بھی منہ تھک گیا تھا اور اسے اب فرخندہ کے ہونٹ پھیکے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے بڑے مکار عاشقوں کی طرح ایک آنکھ کھول کر فرخندہ کو دیکھا۔ اسے صرف اس کی ایک آنکھ نظر آئی جو بند تھی۔ ہونٹ زیادہ بھینچ جانے کی وجہ سے فرخندہ کا ایک نتھنا اوپر کو چڑھ گیا تھا۔ مسعود نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے اٹھا کر پلنگ کی پٹی پر بٹھا لیا اور دایاں ہاتھ اس کے پیٹ پر پھیرنا شروع کر دیا جہاں اس کی تربوزی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ فرخندہ نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو مسعود نے اُسے بڑی محبت اور بڑی سختی سے جھٹک دیا۔ فرخندہ نے دونوں ہاتھ اس کی چھاتی پر رکھ کر اسے پرے دھکیلنا چاہا۔ اس جدوجہد میں دونوں پلنگ پر گر پڑے۔ فرخندہ کی بنیان اوپر چڑھ گئی اور مسعود نے اسے بھیڑیے کی طرح دبوچ لیا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لئے مسعود۔۔۔۔۔"

مگر مسعود کچھ نہیں سن رہا تھا۔ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک سنسان، خوفناک اور گھنے جنگل میں تھا اس کے چاروں طرف بھیگے ہوئے سیاہ تنوں والے دیو پیکر درخت تھے۔ گہرے سرخ چوڑے چوڑے پتوں والی آسمان کو اٹھتی چلی گئی جنگلی بیلیں تھیں، اور خاردار جھاڑیوں کے عقب میں سے جھانکتے ہوئے خونخوار چیتوں کی زرد آنکھیں تھیں۔ فرخندہ کو اپنے چہرے پر کسی وحشی جانور کا خرخراتا ہوا انتہائی گرم اور بدبودار سانس محسوس ہوا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

اس کا دم پھولا ہوا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ سینے پر کریپ کی قمیض چرمر ہو گئی تھی۔ دوپٹہ آدھا فرش پر اور آدھا صوفے پر پڑا تھا، اور بال کچھ کچھ بکھر گئے تھے۔ پنکھے کی ہوا کے باوجود جسم پسینے میں شرابور تھا اور جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے مسعود پلنگ

پر اس کی طرف جھکا۔ اسے وحشت ناک نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ فرخندہ نے جلدی سے قمیض ٹھیک کی۔ بال درست کئے اور دوپٹہ اوڑھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔

"مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں"۔

مسعود اپنے بالوں پر جیب سے نکال کر کنگھی کرتا ہوا اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"کون سی باتیں؟"

اس کا ابھی دم پھول رہا تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر ہولڈر میں پھنسایا اور اسے سلگانے لگا۔ وہ اپنے سارے رٹے ہوئے مکالمے بھول گیا تھا۔ اس وقت اسے صرف ایک بات کا----احساس تھا، کہ فرخندہ نے اسے بیچ میدان میں بڑی فاش شکست دی تھی۔ وہ کچھ کھسیانا بھی ہو رہا تھا۔ اور کچھ فرخندہ پر یہ ظاہر بھی کر رہا تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ اسے سمجھ بیٹھی تھی۔

فرخندہ نے اپنے ننھے سے ریشمی رومال سے اپنے ہونٹوں پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"یہی باتیں۔ آخر میں اتنی نادان نہیں ہوں۔ میں تم سے محبت ضرور کرتی ہوں مسعود لیکن میں اپنی محبت کے منہ پر کالک نہیں ملنا چاہتی"۔

"تم تو پاگل ہو گئی ہو فرخندہ۔ بھلا میں کبھی ایسی گھٹیا بات سوچ سکتا ہوں۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور تمہاری محبت کا میرے دل میں بے حد احترام ہے"۔

مسعود نے اب فرخندہ کی خوشامد شروع کر دی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید اس انتہائی مضبوط قلعے پر دوسرا حملہ کامیاب رہے۔ اسے عصمت کے اس دقیانوسی نظریئے پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اپنی شکست اور فرخندہ کی فتح پر بڑا جھنجھلایا ہوا تھا۔ مگر چہرے پر اس جھنجھلاہٹ کا نشان تک نہ تھا۔ دراصل وہ اس عقیدے کو آج تک حل نہ کر سکا تھا کہ یہ لڑکیاں جب والہانہ محبت کے جوش میں اپنے محبوب کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہیں تو پھر منہ کیوں پرے ہٹا لیتی ہیں؟ وہ فرخندہ کو کسی قسم کی جسمانی لذت پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ وہ تو خود اس طرف آ رہی تھی۔ پھر یہ درمیان میں اچانک دیوار سی کہاں سے آن کھڑی ہوئی تھی۔

سگریٹ کے دو تین کش لینے کے بعد جب اس کی طبیعت ذرا اعتدال پر آئی تو اس نے سیدھے سبھاؤ فرخندہ سے پوچھ لیا۔

"جب تمہیں مجھ سے محبت ہے تو پھر یہ بے رخی کیسی؟"

فرخندہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"بے رخی؟"

"ہاں ہاں بے رخی---- صاف اور سیدھی بے رخی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اور تمہارے جسم میں کوئی فرق ہے؟ کیا تم اپنے جسم سے الگ ہو کر مجھ سے محبت کرتی ہو؟ ----------------------؟ اگر ایسی بات تھی تو مجھ سے ملنے کیوں آئی تھیں؟ میرے گلے میں بانہیں کیوں ڈالیں تھیں؟ کیا تم اپنی محبت بھری باتیں اور سرد آہیں مجھے دے کر اپنا جسم کسی دوسرے کے لئے سنبھال کر رکھ رہی ہو؟ مجھے بتاؤ وہ کون شخص ہے جسے تمہاری محبت نہیں صرف جسم ہی نصیب ہوگا؟"

فرخندہ نے آہستہ سے کہا۔

"تمہارے سوا جو کوئی بھی میرا خاوند ہوگا"۔

مسعود نے جھلا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"اتنی سمجھدار ہو کر بھی تم ایسی باتیں کرتی ہو؟"

"میں بے وقوف بن کر اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت سے کھیلنا نہیں چاہتی"۔

مسعود اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"خدا کے لئے راشد الخیری کی ہیروئنوں ایسی باتیں نہ کرو"۔

"میں نے راشد الخیری کے ناول نہیں پڑھے۔ مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جس قسم کی میری زندگی ہے یا جس طرح کے گھرانے میں میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔ وہاں رہ کر میں اپنے دامن کو داغ دار نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کسی اور فضا میں یہ داغ بالکل دکھائی نہ دے لیکن ہمارے ماحول میں یہ داغ اندھیرے میں بھی چمکتا ہے"۔

مسعود پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور بے چینی سے ایک پیر ہلانے لگا۔

"فرخندہ تم ایٹم کے زمانے میں رہ رہی ہو۔ انسان نے ذرے ذرے کا جگر چیر کر سامنے رکھ دیا ہے۔ لوگ چاند پر راکٹ پھینک رہے ہیں۔ اور تم دہری بکل مار کر ایسے سیپ کی حفاظت کر رہی ہو جس میں کوئی موتی نہیں ہے"۔

فرخندہ کو مسعود کی یہ بات بُری لگی۔ اس نے برقعے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں اب جا رہی ہوں"۔

اچانک مسعود کو خیال ہوا کہ وہ جذبات کی رو میں غلط سمت بہہ نکلا ہے۔ اس نے جلدی سے فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے اتنی جلدی ناراض ہو گئیں۔ میں تو ایک بڑی عام بات کر رہا تھا اگر تمہیں بُری لگی ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔ اصل میں فرخندہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تمہیں زیادہ سے زیادہ اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں تمہارے جسم سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ جب میں فرخندہ کہتا ہوں تو میرا مطلب ہوا کی ایک لہر نہیں ہوتی۔ بلکہ میں تم سے، تمہارے ہونٹوں، تمہاری پیشانی، تمہاری آنکھوں، تمہارے خوبصورت پیٹ اور تمہاری پر شکوہ باہوں سے مخاطب ہوتا ہوں۔ میں تو ان کے بغیر تمہارا تصور تک نہیں کر سکتا۔ بھلا کبھی کسی نے ایسا درخت بھی دیکھا ہے جس کا تنا نہ ہو۔ شاخیں اور پتے نہ ہوں اور اس پر پھول کھلے ہوں؟"

فرخندہ ہاتھ کی انگلی پر اپنے نقاب کی ڈوری لپیٹ رہی تھی۔ اس کا بھورے بالوں والا خوب صورت سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا اور کانوں کے اوپر گرے ہوئے بالوں کے چھلے پنکھے کی ہوا میں ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ مسعود کی باتیں پوری کی پوری اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں، اور وہ دل ہی دل میں ان کی صداقت پر ایمان بھی لا چکی تھی۔ جس وقت وہ مسعود کے پہلو میں سے تڑپ کر اٹھی تھی تو اس کا جسم وہیں پلنگ پر پڑا رہا تھا۔ صرف ایک شریف باپ کی بیٹی اور بھلے مانس بھائی کی بہن اٹھ کر صوفے پر آن بیٹھی تھی۔ اسے تو مسعود کی اس بزدلی پر غصہ بھی آنے لگا تھا کہ اس نے ایک صحت مند جذبات کی آگ میں جلتی ہوئی عورت کے جسم کو تو وہیں چھوڑ دیا اور خود ایک شریف بیٹی اور ذمہ دار بہن کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اب وہ اس کی کسی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ اب عورت کا جسم پلنگ پر سے اٹھ کر دوبارہ بیٹی اور بہن کے قالب میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر یہ سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے گا"۔

مسعود کو جس بات کا کھٹکا تھا وہ ہو کے رہا۔ اسے معلوم تھا کہ ان لڑکیوں کی محبت کی تان شادی پر ہی ٹوٹتی ہے۔ اور شادی وہ ایسی لڑکی سے نہیں کر سکتا تھا جو اس سے ملنے چڑیا

گھر آ جائے اور اس کے ساتھ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں گھومتی پھرے۔ یہ خیال اس کے دل کی تہ میں عقیدہ بن کر بیٹھ گیا تھا۔

کہ جو لڑکی اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے پاس آ سکتی ہے وہ کسی دوسرے کے پاس بھی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی سوچ مسعود کی غلط کاریوں اور بوالہوسانہ عشق بازیوں کا قدرتی نتیجہ تھی۔ دوسری طرف وہ فرخندہ کو بھی ناخوش نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے فرخندہ کی رفاقت کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

"میں تو ابھی اسی وقت شادی پر تیار ہوں فرخندہ۔ مگر تمہارے گھر والے بھی تو مانیں؟"

"تم نے گھر والوں کو کس دن پیغام بھجوایا ہے۔"

"پیغام کا کیا ہے میں بھجوا دوں گا۔"

"دل مانتا ہے تو بھجوا دو۔"

مسعود نے فرخندہ کا ہاتھ بظاہر بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھوں میں محبت کا کیف بھر کر بولا۔

"دل تو یہ چاہتا ہے کہ اگلے جنم میں بھی تم سے بیاہ کروں اور پھر جنم جنم تک تمہارے ساتھ رہوں۔ مگر کیا کروں۔ دنیا والے ہمارے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ تم سے اتنی شدید محبت ہو جانے کے بعد کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری شادی تو اب صرف فرخندہ سے ہی ہو گی۔ میں تو کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

فرخندہ نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر مسعود کو اس طرح دیکھا جس طرح بیوی پہلی بار اپنے خاوند کو دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں حیا، پاکیزگی، اشتیاق، شدت ایثار اور وفا پرستی کا جذبہ چھلک رہا تھا۔ لیکن ہمارے پیشہ ور عاشق کو اس قسم کی لطیف باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ فرخندہ کی آنکھوں میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے نزدیک عورت کی محبت کا یہ انتہائی مقدس پہلو ایسے ہی تھا جیسے کسی دیہاتی کے لیے سکہ ڈال کر قسمت کا حال دریافت کرنے والی مشین جسے وہ حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اس نے فرخندہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے گول گول شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"پھر تم مجھ سے اپنا آپ چھپاتی کیوں ہو؟ کیا یہ مجھے میری لازوال محبت کی سزا دے رہی ہو؟ جب ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو یہ درمیان میں پردہ کیوں حائل ہے؟ ہم سے بڑھ کر اور کس کو اتنا حق ہو گا کہ وہ محبت کے نشے میں ڈوب کر جوانی کی تمام رعنائیوں سے لذت یاب ہوں۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ پھر یہ دقیانوسی نظریوں میں کیوں الجھ رہی ہو؟"

فرخندہ نے اپنا سر مسعود کے کندھے سے لگا کر کہا۔

"محبت میں اگر انسان برے بھلے کی تمیز کھودے تو پھر اسے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ عورت کا جسم اس کی شخصیت کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن عورت صرف جسم ہی نہیں ہوتی۔ اگر تم مجھے صرف میرے جسم سے پہچانتے ہو تو اس کے ڈھل جانے پر تم مجھے بڑی آسانی سے گھر سے نکال باہر کرو گے"۔

مسعود نے جلدی سے کہا۔

"تم میرا مطلب غلط سمجھی ہو۔ میری مراد ہر گز یہ نہیں تھی کہ میں صرف تمہارے جسم سے پیار کرتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ-----"

فرخندہ نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں وہ بھی جانتی ہوں۔ جو لڑکی گھر والوں سے دھوکا کر کے اپنے عاشق سے ملنے کسی غیر مرد کے مکان میں آ جاتی ہے۔ وہ سب کچھ جان رہی ہوتی ہے۔ مگر مسعود میرے جسم اور میری عزت کے ساتھ میرے سارے خاندان کا ناموس وابستہ ہے۔ یہ بات دقیانوسی ہو یا بے معنی----- بہر حال یہ ایک حقیقت ہے اور کوئی بھی ذمہ دار لڑکی اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتی۔ میں لاکھ تمہاری سہی لیکن میرا جسم صرف اس شخص کی امانت ہے جو میرا رشتہ میرے ماں باپ سے آ کر حاصل کرے گا"۔

مسعود سمجھ گیا کہ فرخندہ پر اس وقت اس کا جادو نہیں چل سکے گا۔ چنانچہ اس نے ایک دور اندیش جادو گر کی طرح اپنی پٹاری بند کر لی اور سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ فرخندہ نے الٹے ہاتھ سے اپنی کمر کھجلائی تو اس کی گول گول چھاتیاں اور نمایاں ہو گئیں۔ مسعود نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت وہ صرف بنیائن اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کی پتلون کولہوں پر پھنسی ہوئی تھی۔ اور چھاتی پر سیاہ بال

تھوڑے سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ فرخندہ کا سارا بدن کپکپا سا گیا۔ اس نے سوچا اگر مسعود سے اس کی شادی ہو گئی تو ایک دن وہ اس کے پاس بیٹھی کتنی محبت، کتنے اعتماد سے ان سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہو گی۔ یہ کتنی تلخ حقیقت تھی کہ اس کا ابھی تک مسعود سے بیاہ نہیں ہوا تھا۔ کاش وہ آج ہی پیغام بھجوا دے اور کل ہی ان دونوں کا بیاہ ہو جائے۔ مسعود اس کا بڑا مثالی خاوند ہو گا۔ وہ خوبصورت ہے۔ جوان اور پر کشش شخصیت کا مالک ہے۔ وہ کتنی شان سے اس کے ساتھ سیر کرنے اور سینما دیکھنے جایا کرے گی۔ فرخندہ کا جسم اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ تنہائی میں اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے والی فرخندہ کس بے رخی سے منہ موڑ کر دور جا بیٹھی ہے۔ فرخندہ کے جسم نے فیصلہ کر لیا کہ اب اکیلے میں وہ اس کے سینے پر محبت سے ہاتھ پھیرے گی تو وہ پتھر کی طرح سخت بن جائے گا اور اسے جی بھر کر تڑپائے گا۔ ادھر فرخندہ کو شادی بیاہ کا خیال انگلی سے لگائے اس رنگین میلے کی سیر کروانے چل دیا جو خوش نما باغوں، جہیز کی چیزوں، سینما کی ٹکٹوں، ہوٹل کے لذیذ کھانوں، سونے کے زیورات، پر تکلف دعوتوں اور دام دے کر خریدی ہوئی حسین راتوں کی لذتوں سے بھرا ہوا تھا۔

اب کافی دیر ہو گئی تھی اور فرخندہ کو انجم کا خیال آنے لگا تھا جو پیسہ اخبار والے گھر میں بیٹھی بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر برقعہ پہن لیا۔

"جا رہی ہو؟"

"ہاں----- انجم انتظار کر رہی ہو گی۔ میں تو بڑی مشکل سے یہاں آئی ہوں"۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟"

"میں تمہیں خط لکھ بھیجوں گی۔ تم خط بالکل نہ لکھنا۔ انجم بڑی گھبرا رہی ہے"۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگے تو مسعود نے فرخندہ کو اپنے سینے سے لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔ برآمدے میں مسعود کا دوست آرام کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ فرخندہ کوٹھی کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ مسعود کے دوست نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔ "کیا بنا؟" مسعود نے آہستہ سے اسے آنکھ ماری اور جلدی سے فرخندہ کے ساتھ ہو لیا۔

۱۰

برسات شروع ہو چکی تھی۔

ماسٹر جی فرخندہ کو پڑھانے آتے تو ایک بینگی ٹیڑھی سلاخوں والی میل بھری چھتری ضرور ساتھ ہوتی۔ اس چھتری کو انہوں نے دوسری منزل والی پر چھتی سے اتار کر جھاڑا تو اس میں سے بے شمار ٹڈیاں نکلیں تھیں۔ ساون کی گھٹا ذرا کھل کر برستی تو مصری شاہ سے لے کر وسن پورے تک جل تھل ہو جاتا۔ ماسٹر جی پل کے باہر رک جاتے۔ پتلون گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیتے۔ جوتے بغل میں دبا لیتے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں قدم قدم چلنا شروع کر دیتے۔ بسیں، تانگے اور شرارتی لونڈے اُن کے قریب سے چھینٹے اڑاتے ہوئے گزر جاتے۔ مگر ماسٹر جی چھتری تانے، جوتے بغل میں دبائے، پتلون چڑھائے فرخندہ کے گھر کی جانب چلتے چلے جاتے۔ ان علاقوں میں مچھروں اور مکھیوں نے دھاوا بول رکھا تھا۔ دوسری طرف راوی سیلاب کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ بارش ذرا طول پکڑتی تو مکان ٹپکنے لگتے، بجلی فیل ہو جاتی۔ گندے نالے کے پل سے وسن پورے کے چوک تک جانے والی کھیت کی کچی دیوار ڈھے جاتی، بوسیدہ مکانوں کی چھتیں چٹخنے لگیں۔ لوگوں میں ہراس سا پھیل جاتا۔ وہ رات کوٹھوں پر کھڑے ہو کر اذانیں دینی شروع کر دیتے۔ مینہ بند ہوتا تو گڑھوں اور سڑک کے نشیبوں میں کئی کئی دن پانی سڑا کرتا۔ ذرا دھوپ چمکتی تو گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی۔ حبس کے مارے دم گھٹنے لگتا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑے اور گیلے تولیے عجیب قسم کی واہیات بو دینے لگتے۔ کیڑے پڑے امرود، گلی سڑی ناشپاتیوں اور مکھیوں بھری بہاولپوری اور ملتانی کھجوروں کی بکری عام ہو جاتی۔ اگر کہیں ہیضے کی کوئی واردات ہو جاتی تو کارپوریشن کے دکان نما دفتر کے باہر ایک میلی سی میز بچھا کر ایک بد مزاج پرانا ڈاکٹر سپرٹ لیمپ اور ٹیکہ لگانے کا سامان لے کر بیٹھ جاتا اور بچوں کی باہنیں کھینچ کھینچ کر انہیں ٹیکہ لگانے لگتا۔ کھانے پینے کا مزہ جاتا رہتا۔ بھوک منجمد سی ہو جاتی۔ بازار دو دن سوکھتے تو دس دن کیچڑ سے بھرے رہتے۔ نئے کپڑے پہن کر مصری شاہ سے بچ کر نکلنا محال ہو جاتا تانگے والے کرایہ دگنا کر دیتے۔ اگر سیلاب آ جاتا تو تمام آبادی میں کہرام سا مچ جاتا۔ گندے نالے کے

الٹے چلتے ہی لوگ دھڑا دھڑ گھروں کا سامان ریڑوں پر لاد کر شہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتے۔ کبھی کبھی سیلاب انہیں اچانک آلیتا اور انہیں بچوں کو محفوظ مقامات تک پہنچانے کی مہلت ہی نہ ملتی۔ شہری دفاع، فوج اور پولیس کے لوگ انہیں کشتیوں میں بٹھلا بٹھلا کر باہر نکالتے۔ انہیں کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے سیلاب کا پانی نیچے ہی نیچے سے درانتی کی طرح چلتا۔ مکانوں کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دیتا۔ اس گندے تیل ملے بدبو دار پانی سے مکان کے دیوان خانے الماریوں کے پہلے خانوں تک بھرے ہوتے چار پانچ روز بعد جب سیلاب کا پانی خشک ہوتا تو لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر واپس گھروں میں آکر دیکھتے کہ دیوان خانوں اور صحنوں میں کالے سیاہ لجلجے کیچڑ کی تین تین انچ موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ صوفوں کا کپڑا گل گیا ہے فرش زمین میں دھنس گئے ہیں۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ ایک تیز اور ناقابل برداشت بدبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ہفتہ بھر تک گھروں کی صفائیاں اور مرمتیں ہوتی رہتیں۔ محنت پسند گھریلو لڑکیاں جھاڑو اور پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں لے کر فرش کو رگڑ رگڑ کر چمکا دیتیں کمروں کی چیزوں کو پھر سے سجا دیتیں کارپوریشن کی گاڑیاں سیلابی کیچڑ کی ڈھیریاں اٹھا اٹھا کر باہر کھیتوں میں ڈال آتیں۔ دھوپ میں بازار سوکھ جاتے۔ ہر وقت سیلاب کی تباہی کا ذکر کرنے والے دوسری باتیں کرنے لگتے۔ کاشتکار کھیتوں میں تباہ شدہ فصل کو اکھاڑنے لگتے۔ بادامی باغ والے کارخانے پھر سے چھک چھک شروع کر دیتے اور منہ اندھیرے مزدور روٹیوں کے ڈبے ہاتھوں میں لٹکائے تیز تیز قدموں سے کام پر جانے کے لئے گھروں سے نکل پڑتے دفتروں کے بابو شیو بنا دانت مانجھ اور چائے پی کر سائیکلوں پر دفتروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اسکول کی چھوٹی بڑی لڑکیاں نیلی سبز قمیضوں اور سفید دوپٹوں میں ملبوس کتابیں دبائے گلیوں سے نکل کر بازار سے ہو کر بس سٹاپ پر آکر کھڑی ہو جاتیں اور زندگی ایک بار پھر اپنے گھسے پٹے پرانے ڈھیرے پر چلنے لگتی۔

جب کبھی ماسٹر جی کے وہاں ہوتے ہوئے موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی تو بڑا مزا آتا۔ فرخندہ کے کمرے والی کھڑکی کا پردہ ہوا میں پھڑپھڑانے لگتا۔ وہ پڑھتے پڑھتے اٹھ کر پردہ چن کر فیتے سے باندھ دیتی وہاں زاہدہ اور بلقیس بھی آجاتیں کیونکہ فرخندہ کی کھڑکی میں سے باہر بارش کا نظارہ پوری طرح دیکھا جا سکتا تھا وہ مکانوں کے درمیان میں خالی جگہ تھی وہاں سے دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور چاہ میراں والی آبادی کے مکان اور مسجد کے سفید سفید مینار بارش کی چادر میں دھندلے دھندلے سے دکھائی دیتے بارش کی تیز بوچھاڑیں درختوں کی ٹہنیاں ایک طرف کو جھک گئی ہوتیں پرندے گیلے پروں کو سمیٹ کر درختوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔ مکانوں کے پرنالے چھتوں کی مٹی بہا کر لاتے ہوئے دھڑا دھڑ گلی کی نالی میں

گرنے لگے۔ ہوا ایک دم ٹھنڈی اور لطیف ہو جاتی۔ ماسٹر جی پڑھائی چھوڑ دیتے فرخندہ اپنی بہن اور بھابی کے ساتھ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو جاتی۔ ماسٹر جی باہر گیلری میں آ جاتے صحن میں بارش کی موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی ہوتیں۔ بیری کے درخت کے پتے تیز بارش میں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوتے۔ بارش کا پانی ان پتوں کو بہا کر نالی کی طرف لے جاتا۔

پھر نشست گاہ میں چائے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر فرخندہ اس میں خالی چمچ ہلاتی تو کمرے کی بھیگی ہوئی نم فضا میں چائے کی گرم خوشبو اڑنے لگتی۔ گلی والا نیم کا پیڑ بارش میں بھیگنے کے بعد اپنے تنے اور پتوں سے کڑوی کڑوی سی خوشگوار مہک چھوڑ رہا ہوتا۔ فرخندہ کا جی خواہ مخواہ چاہتا کہ وہ باغ میں جا کر جھولا ڈالے اور ساون کے گیت گائے مگر اس نے باغ میں کبھی جھولا نہیں جھولا تھا بچپنے میں اُس نے دروازے کی چوکھٹ میں رسی ڈال کر جھونٹے ضرور لیے تھے بھاپ چھوڑتی چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگاتے سے ماسٹر جی کی عینک کے شیشے دھندلا جاتے جنہیں وہ بار بار اپنے میلے رومال سے پونچھا کرتے ذرا دوپٹہ ہٹتا تو فرخندہ کے کانوں پر گرے ہوئے بھورے بالوں کے خشک چھلے کھڑکی سے آتی ہوئی برسات کی تیز ہوا میں جھولنے لگتے ماسٹر جی کے کمزور ہاتھوں میں عینک لرز جاتی۔ ان ہاتھوں نے بیمار بیوی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر آگ جلائی تھی دھواں دیتے چولہے کو پنکھا کیا تھا۔ اس کے گندے مندے کپڑے دھوئے تھے۔ برتن مانجھے تھے۔ اس کا بستر بچھایا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھری تھیں اور اپنی کوٹھری میں جھاڑو دی تھی۔ کبھی کسی کے بالوں میں گلاب کا پھول نہ لگایا تھا۔ کبھی کسی معصوم بچے کے منہ میں پیار سے روٹی کا ٹکڑا نہیں ڈالا تھا۔ کبھی سنہری بالوں کے ان خشک چھلوں کو انگلیوں سے نہیں چھوا تھا جو ذرا سی ہوا میں کانپنے لگتے ہیں۔ یہ کمزور بے رنگ سی بوڑھی ہوتی انگلیاں اُس جلے ہوئے درخت کی سوکھی ٹہنیوں سے بہت ملتی جلتی تھیں جہاں اب پھول آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنی انگلیوں میں جب ماسٹر جی نے فرخندہ کے لئے گلاب جامنوں سے بھرا دونا تھام رکھا ہوتا تو انھیں اپنے ہاتھ سے سورج کی شعاعیں چھوٹتی معلوم ہوتیں۔ سارا راستہ وہ اس دونے کو دل سے لگائے لگائے رکھتے۔ اسی طرح جب کبھی وہ موسمی پھولوں کا گلدستہ لوہاری دروازے سے خریدتے تو ان پھولوں کو کبھی نہ سونگھتے۔ جس طرح ہندو پجاری دیوتاؤں کی نذر کرنے والے پھولوں کو کبھی ناک سے نہیں لگاتے۔

فرخندہ سے اپنے اس انوکھے رشتے کا تجزیہ انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا شاید نفسیاتی طور پر وہ ایسا کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کیا خبر اتنی پیاری چمکیلی دھوپ میں لہراتی ہوئی پھولوں بھری نازک گھاس کے نیچے کوئی زہریلا ناگ پھن اٹھا کر کھڑا ہو جائے۔ اس وقت ماسٹر جی کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو ایک تھکا دینے والے طویل سفر کے دوران پہلی بار کسی سایہ دار کنج میں آ کر پاؤں پسار لیتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد طے شدہ مسافت کی کلفتوں اور درپیش سفر کے اندیشوں کو بھول جاتا ہے۔ فرخندہ کا ہنستا، بولتا، چلتا پھرتا روشن اور شگفتہ وجود ان کی شفقتوں، تشنگیوں اور غمگساریوں کا مرکز تھا۔ جہاں سے ہمدردی محبت اور یگانگت کے کبھی خشک نہ ہونے والے چشمے پھوٹتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ پنسل بناتے بناتے چاقو سے فرخندہ کی انگلی ذرا سی کٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ ماسٹر جی کے ہاتھ میں فرخندہ کی کاپی تھی جس پر اس نے ایک نظم کی تشریح کی ہوئی تھی۔ فرخندہ کے منہ سے ہلکی سے تکلیف بھری آہ نکل گئی۔ ماسٹر جی کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے جھٹ سے فرخندہ کی خون آلود انگلی اپنے منہ میں ڈال لی اور اُسے چوسنا شروع کر دیا۔ فرخندہ کچھ شرما سی گئی۔ اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور آہستہ سے انگلی اپنی طرف کھینچنے لگی۔ ماسٹر جی ان تمام باتوں سے بے خبر فرخندہ کی نازک سی انگلی منہ میں ڈالے اُسے چوس رہے تھے۔ اچانک دروازے کا پردہ ہٹا اور فرخندہ کا کمینہ فطرت خانہ زاد بھائی ادبیات کا طالب علم اور اس کا ناکام عاشق خالد اندر داخل ہوا۔ اُس نے جو اندر کا منظر دیکھا تو اُس کا خون کھول اٹھا اور سوکھے ساکھے چہرے پر چھائیوں کے داغ کچھ اور گہرے ہو گئے۔ اُس کے مدقوق سے چہرے پر بڑی مکارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ قریب آ کر بولا۔

"بہت خوب! معلوم ہوتا ہے فرخندہ کل کا سبق لے رہی ہے۔"

فرخندہ نے جلدی سے اپنی انگلی کھینچ لی۔ وہ سہم سی گئی۔ لیکن فوراً ہی اُس نے اپنی طبیعت کو سنبھال لیا۔ ماسٹر جی احمقوں کی طرح خالد کا منہ تکنے لگے۔

"فرخندہ کی انگلی کٹ گئی تھی۔ میں نے چاقوں کا زہر چوس لیا ہے۔ برسات میں ان باتوں کا بڑا خیال رکھنا چاہیئے۔"

خالد طوطے کی طرح گردن ادھر ادھر گھما رہا تھا اور بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کمرے کی دیواروں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں --- آج کل تو ہر بات کا بڑا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور آپ تو فرخندہ کا خیال رکھتے ہی ہیں۔
کیوں فرخندہ؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

فرخندہ کا جی چاہا کہ وہ خالد کا منہ نوچ لے۔ اُس نے نفرت سے سر پیچھے کو جھٹک کر کہا۔

"میں نہیں جانتی۔"

فرخندہ انگلی پر پٹی لپیٹنے لگی۔ خالد نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"لاؤ میں لپیٹ دوں۔"

"شکریہ! اب آپ مجھے پڑھنے دیں گے یا اپنی فضول باتوں سے میرا وقت ضائع کریں گے۔"

خالد بوکھلا سا گیا۔ اُسے فرخندہ کے منہ سے اس قسم کے بے باک جواب کی توقع نہ تھی۔ اُس نے بڑی گہری نظروں سے ماسٹر جی کو اور پھر فرخندہ کی انگلی کو دیکھا اور چپکے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ماسٹر جی نے عینک اُتارتے ہوئے کہا۔

"میں نے --- میں نے کوئی ایسی حرکت تو نہیں کر دی جو بُری ہو؟"

فرخندہ نے پٹی کی گرہ باندھتے ہوئے ماسٹر جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بالکل نہیں۔"

ماسٹر جی نے عینک لگائی اور افسردہ خاطر سے ہو کر فرخندہ کی کاپی پر پنسل سے غلط مقامات پر نشان لگانے لگے۔

خالد ایسی خصلت کا آدمی نہیں تھا۔ کہ ماسٹر جی کے اس فعل کو نظر انداز کر جاتا۔ وہ تو پہلے ہی سے اس قسم کے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ فرخندہ اس کی فطرت سے پوری طرح واقف تھی۔ لیکن وہ خود چونکہ بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی اس لئے اُس نے اس واقعے کو بالکل کوئی اہمیت نہ دی۔ اور خالد کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی من مانی کارروائی کرے۔

دوسرے روز خالد فرخندہ کے والد کی دکان پر عین اُس وقت پہنچا جب وہ دکان بڑھا رہے تھے اور نوکر چاولوں اور دوسرے اجناس کی بوریاں اندر رکھ رہے تھے۔ شیخ فقیر دین دکان کے سامنے لکڑی کی ایک پرانی کرسی پر بیٹھے پنکھے سے ہوا کر رہے تھے کہ خالد نے قریب جا کر

انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام آؤ بیٹے۔ آج ادھر کیسے؟"

"میں گھر جا رہا تھا۔ سوچا آپ سے بھی ملتا جاؤں۔"

"بس میں بھی چلنے کو ہوں۔ بھائی رحمت --- یہ بار دانہ پچھلی کوٹھڑی میں رکھوا دو۔ اب اس کا سودا کراچی والے بیوپاریوں کے آنے پر ہی ہو گا۔"

تھوڑی دیر بعد شیخ صاحب اور خالد اکبری منڈی سے نکل کر پیدل ہی وسن پورے کی طرف چل پڑے۔ شیخ صاحب بڑے جہاندیدہ اور زیرک تھے۔ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ برخوردار بے مقصد ان کے پاس نہیں آیا۔ مگر خود کچھ کریدنے کی بجائے انہوں نے موقع دیا کہ خالد اپنے آپ ہی دل کی بات کہہ ڈالے۔ گرد آلود جوتے۔ گھر کی دھلی ہوئی شلوار، کھدر کی چوخانہ قمیض اور اسکے اوپر میلی سی واسکٹ پہنے جس کے بٹن کھلے تھے شیخ صاحب ایک ہاتھ پشت پر رکھے اور دوسرے ہاتھ سے کبھی کان کھجلاتے کبھی ناک کھجلاتے اور کبھی اُسے یونہی کھلا چھوڑے باتیں کرتے چلتے گئے۔ خالد بھی مکاری اور موقع شناسی میں شیخ صاحب سے پیچھے نہیں تھا۔ شیخ صاحب کو ان کے کاروباری تجربات اور معاملہ فہمی نے دور بینی عطا کی تھی تو خالد کی چالاکی، پُرفریب شائستگی اور مکارانہ زیرکی میں اس کی فطرت کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ تمام صفات اُس کے خون میں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اس اعتبار سے وہ شیخ صاحب پر سبقت لے گیا تھا ادھر ادھر کی باتوں میں اُس نے اس قدر ہوشیاری سے فرخندہ کی پڑھائی کا ذکر چھیڑ دیا کہ شیخ صاحب کو بالکل محسوس نہ ہو کہ خالد انکے ساتھ صرف اسی موضوع پر بات کرنے آیا تھا

خالد کہنے لگا کہ اس کے ایک دوست نے لڑکیوں کا پرائیویٹ سکول کھولا ہے جس کی پرنسپل اس کی اپنی بیوی ہے اس اسکول میں شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ ایف۔اے۔ بی۔اے وغیرہ کی تیاری کروائی جاتی ہے۔

"پہلے یہ میرا دوست انکم ٹیکس کے دفتر میں ملازم تھا۔ اتفاق سے اس کی شادی ایک بڑی پڑھی لکھی خاتون سے ہو گئی۔ اور انہوں نے لڑکیوں کا سکول کھول لیا اب وہ دونوں بڑے مزے میں ہیں۔"

"جب تو انہیں خوب آمدنی ہوتی ہو گی۔ کتنی لڑکیاں پڑھتی ہیں وہاں؟ فیس کیا لیتے ہیں وہ لوگ؟ پانچ روپیہ فی لڑکی سے کیا کم ہو گی۔ اگر پچاس لڑکیاں بھی ہوں تو ڈھائی سو روپے

توبہی ہوگئے۔ بی اے والیوں سے تو وہ زیادہ پیسے لیتے ہوں گے۔"

شیخ صاحب دماغ میں ان لوگوں کی آمدنی، جمع خرچ وغیرہ کا حساب بنانے لگے۔ خالد بولا۔

"جی ہاں ---- ویسے ایف اے والی لڑکیوں سے وہ ساڑھے دس روپے مہینہ لیتے ہیں۔"

شیخ صاحب چونک سے گئے۔

"جب تو حساب کہیں کا کہیں جا پڑا۔ لوگ تو گھر بیٹھے اتنی دولت جمع کر لیتے ہیں۔ ایک ہمیں دیکھو کہ دن بھر دکان پر چکی پیسنا پڑتی ہے جب کہیں جا کر تانبے کے پیسے کی صورت نظر آتی ہے۔"

خالد نے بات کا رخ اقتصادیات کی طرف جاتے دیکھا تو فوراً اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹ آیا۔ مگر زمانہ ساز آدمی نے شیخ صاحب کی بات کو ہی پلٹا دے دیا۔

"ٹھیک ہے خالو جان۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ اتنی محنت کی کمائی میں سے اپ چالیس روپیہ مہینہ فرخندہ کی پڑھائی پر خرچ کر رہے ہیں۔ مجھے تو اس شہر میں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔"

شیخ صاحب نے اپنے اس یگانہ صفت فعل کی تعریف پر فخر بھی محسوس کیا اور کچھ فکر مند بھی ہوگئے اگرچہ ٹیوشن کے چالیس روپے فرخندہ کی والدہ اپنے ذاتی خرچ کے پیسوں میں سے ادا کرتی تھی پھر بھی وہ ذاتی خرچ شیخ صاحب کی جیب سے ہی نکلتا تھا۔ شیخ صاحب کی آنکھوں کے سامنے چالیس روپے کی پوری رقم ایک ایک پیسہ کر کے یہاں سے وہاں تک پھیل گئی۔ انہوں نے بڑے تاسفانہ انداز میں ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"مجبوری ہے بیٹے۔ اس کی ماں نے بیٹی کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے بھی یہ نقصان برداشت کرنا ہی پڑتا ہے یہ خیال کر کے چپ ہو رہتا ہوں کہ لڑکی پڑھ لکھ جائے گی تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔"

خالد نے اپنی چوہیوں ایسی آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے اگر آپ فرخندہ کو میرے دوست کے پرائیویٹ سکول میں داخلہ دے دیں تو یک مشت تیس روپے بھی بچ جائیں گے اور وہ لوگ پڑھائی بھی بڑی محنت سے

کرائیں گے میں انہیں خود جا کر مل لوں گا۔ سکول بھی اتنی دور نہیں یہ بس کشمیری دروازے میں ہے۔

شیخ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ تیس روپے ماہوار کی بچت بڑی چیز تھی۔ لیکن پھر انہیں خیال آیا کہ لڑکی کا معاملہ ہے کہاں گھر سے نکل کر روزانہ کشمیری دروازے جایا کرے گی۔ کیا خبر وہاں کا ماحول کیسا ہو پرنسپل کا خاوند کس خصلت کا ہو۔ زمانہ کونسا جا رہا ہے کہیں ان کی عزت پر ہی نہ آ بنے۔ کم از کم اس طرح لڑکی گھر میں سب کے سامنے تو ہوتی ہے یہ سوچ کر انہوں نے تیس روپے کی رقم تجوری میں رکھنے کی بجائے بادل نخواستہ پھر واپس کر دی۔

"نہیں بھائی۔ میں بچی کو گھر سے باہر نہیں بھیج سکتا۔ زمانہ بڑا نازک ہے۔ عزت کے سامنے روپے کی کوئی وقعت نہیں۔"

خالد حیران رہ گیا کہ کنجوس بوڑھا روپے پر عزت کو ترجیح دے رہا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کئی بار سودا کر کے اپنی بات سے مکر گیا تھا اور آڑھتیوں میں اس کی بڑی بدنامی ہوئی تھی۔

"خوب یاد آیا۔ میرے دوست کی بیوی تو گھر پر آ کر بھی پڑھا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے میں کل اس سے بات کروں گا۔ وہ تو بیس روپے ماہوار پر بھی راضی ہو جائے گی۔"

"بڑی مشکل ہے بھائی۔ ماسٹر صاحب کو زبان دے رکھی ہے۔ وہ غریب آدمی ہیں اب تو اس امتحان کے بعد ہی کچھ ہو سکے گا۔"

"پھر بھی خالو خان۔ ماسٹر صاحب غیر مرد ہیں۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ آج کل تو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔"

شیخ صاحب چپ ہو گئے۔ دراصل وہ ماسٹر جی کی شرافت کے بڑے مداح تھے یہی وجہ تھی کہ ان پر خالد کی اس بات کا زیادہ اثر نہ ہوا جو بات انہیں ماسٹر جی کو جواب دینے پر اکسا رہی تھی وہ بیس روپے کا فائدہ تھا۔ مگر بغیر کسی وجہ کے وہ انہیں ٹیوشن سے جواب بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ماسٹر جی کی شرافت کا میں قائل ہوں وہ فرخندہ کو اپنی ہی بچی سمجھ کر پڑھاتے ہیں اور پھر وہ تو میری عمر کے ہونے کو ہیں۔"

خالد نے جب ہر وار خالی جاتے دیکھا تو مجبوراً اپنے ترکش میں سے آخری اور اپنی دانست میں بڑا کاری تیر نکال کر چلّے پر چڑھایا۔ اس وقت وہ مصری شاہ والے ریلوے پل کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ خالد زمین پر نظر گاڑھے بڑے ہمدردانہ اور برخوردارانہ انداز میں بولا۔

" بات دراصل یہ ہے کہ خالو جان کہ ہماری عزت آپ کی عزت ہے۔ لیکن آدمی کسی کا منہ بند نہیں کر سکتا۔ میں کبھی یہ حرف زبان پر نہ لاتا۔ پر مجبور ہوں۔"

شیخ صاحب چونکنے سے ہوگئے۔

"آخر ایسی کونسی بات ہوئی ہے؟"

اس کے بعد خالد نے انہیں فرخندہ کی انگلی کے چاقوں سے زخمی ہونے اور ماسٹر جی کے انگلی کو منہ میں ڈال کر اُسے چوسنے کا سارا واقعہ شیخ صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ شیخ صاحب بڑے غور سے سنتے رہے۔ چہرے پر کچھ تردد کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک ہاتھ سے قراقلی کی پرانی ٹوپی اٹھا کر دوسرا ہاتھ سر پر پھیرا سبز پھولی ہوئی ناک کھجائی اور پھر آہستہ سے بولے۔

مجھے تو بھائی اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ میں خواہ مخواہ ماسٹر صاحب کی روزی پر لات ماروں۔ ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ تو بڑی معمولی بات ہے۔"

خالد اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اب وہ بے حد شرمندگی اور خفت محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا چالاک بوڑھے نے اس کی نیت کو بھانپ لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب اب سمجھ گئے تھے کہ خالد یہی بات کرنے ان کے پاس اکبری منڈی آیا تھا مگر وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ خالد ماسٹر جی کے خلاف کیوں ہے۔؟ شاید وہ انہیں پسند نہیں کرتا۔ آٹے دال کے کاروبار میں پھنس کر اور جوانی کے دن ہلدی چاول اور ہینگ کی بوریوں کے درمیان گزارنے کے بعد شیخ صاحب اپنے کام اور دنیا داروں کے ساتھ لین دین کے معاملوں میں تو بڑے تاک ہو گئے تھے مگر انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں پہنچ کر کسی مسئلے کا سراغ لگانا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ویسے بھی ان کی جنسی زندگی بڑی ہموار، بے داغ اور پُرسکون رہی تھی یہ شریف سا بھلا مانس قسم کا دریا کسی سیلاب یا طوفان سے دوچار ہوئے بغیر بڑی سست روی سے ایک ہی انداز میں بہتا چلا گیا یہی وجہ تھی کہ وہ خالد کے

ذہن کی نچلی تہوں میں جمی ہوئی جنسی کمینگی اور فاسد خیالات کی دلدل تک نہ پہنچ سکے۔ کیا ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ پرانے لوگوں کی شرافت نفس اور جذباتی سادگی میں ان کی معتدل خوراک راست فکری اور احساس وضعداری کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔؟

لیکن ہم جن حالات میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کا معاملہ بالکل الگ ہے آج ضمیر کا مفہوم اور اس کا خمیر بدل گیا ہے بدلتے ہوئے جغرافیائی حالات سیاسیات کی رنگ آمیزی اقتصادی پریشانیوں کے مسائل نے ان تمام پرانی قدروں کی چولیں ہلا دی ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ کسی نئے تاج محل کی تعمیر کی امید میں یہ عمارت ایک دن اپنے آپ ہی دھڑام سے زمین پر آن گرے اور ریزہ ریزہ ہو جائے تاہم کہیں نہ کہیں کسی محل کا گرا پڑا ستون، کسی شہ نشین کی اکھڑی ہوئی چوکھٹ ان لوگوں کی یاد ضرور دلاتی رہے گی۔

۱۱

فرخندہ نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ گھر میں کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ اتنا مشکل امتحان اتنی آسانی سے اور پھر اچھے نمبروں میں پاس کر لے گی۔ لیکن وہ کامیاب ہو گئی۔ اس کے لئے ماسٹر جی کی محنت اور فرخندہ کے جی لگا کر پڑھنے کی لگن دونوں کو سراہا گیا۔ شام کو ماسٹر جی آئے تو ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ ایک ہار میں روپے روپے والے اکیس نوٹ پروئے تھے شیخ صاحب نے ماسٹر جی کو مبارکباد دی اور ہار میں لگے نوٹوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگلے ماہ گھر کے خرچ کے لئے دو سیر گھی کم آنا چاہیئے۔ فرخندہ نے اپنی سہیلیوں کی دعوت کر دی۔ چائے کے ساتھ مٹھائی پیش کی گئی۔ عینک والی دبلی پتلی انجم پر دھان بنی دعوت میں پھر رہی تھی۔ سمن آباد والی خالہ کو بھی بلایا گیا تھا خالد نے فرخندہ کو ایک ایسے انڈمی پن کا تحفہ دیا جو اُسے ایک دوست نے کویت سے بھیجا تھا فرخندہ قلم لینا نہیں چاہتی تھی مگر خالہ اور اپنی امی کے ہوتے انکار نہ کر سکی۔ اُس نے قلم لے کر رکھ لیا اور خالد کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ فرخندہ بڑے خوبصورت لباس میں تھی۔ گلابی قمیض اسی رنگ کا چنا ہوا دوپٹہ پاؤں میں سبز سینڈل کانوں میں سرخ بندے اور نیم سنہری بالوں میں جوڑے پر لگا سفید گلاب ---- ماسٹر جی فرخندہ کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سمار ہے تھے۔ ان کی بے رنگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو بار بار چھلک آتے انہیں یوں لگتا گویا وہ فرخندہ کو اُس پیارے لباس میں ایک روز گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ دیکھنے کے لئے پڑھا رہے تھے وہ کونے والے کاؤچ پر فرخندہ کی والدہ کے پاس بیٹھے چپکے چپکے گہرے سانس لیتے۔ کیونکہ فضا میں فرخندہ کے سانس کی خوشبو تھی۔ فرخندہ کا جہاں پاؤں پڑتا وہاں وہ اپنی آنکھیں رکھ دیتے وہ کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اٹھاتی تو ماسٹر جی کو یوں محسوس ہوتا جیسے انہوں نے وہاں اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے ہیں وہ فرخندہ کے ساتھ کمرے سے باہر جاتے واپس آتے اس کی آواز کے ساتھ ہونٹ ہلاتے وہ چپ ہو جاتی تو آنکھیں بند کر لیتے وہ اپنی سہیلیوں میں قہقہہ لگاتی تو ان کا جی چاہتا کہ خوشی سے ناچتے ہوئے باہر گلی میں نکل جائیں اور بکائن کے درختوں کی لٹکتی ٹہنیوں سے ہاتھ ہلا ہلا کر

انہیں فرخندہ کے پاس ہونے فرخندہ کے مسرور ہونے کی خبر سنائیں۔

خالد بھی فرخندہ کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی فرخندہ کے بالوں میں لگے سفید گلاب کی بلائیں لے رہا تھا۔ مگر اس کی نگاہوں میں اس بھوکے آدمی کی چمک تھی جو گلی میں کھڑا کھڑکی کے اندر لوگوں کو چٹ پٹے کھانے کھاتے دیکھ رہا ہو۔ جس میں اتنی جرات بھی نہ ہو کہ ان کے منہ سے نوالہ چھین لے اور اتنا حوصلہ بھی نہ ہو کہ ایک نظر دیکھ کر گزر جائے اسے فرخندہ کے تمتمائے ہوئے رخسار پہلے سے زیادہ خوبصورت اور سینہ معمول سے زیادہ اُبھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گلابی ریشمی قمیض اُس کے جسم پر چست ہو گئی تھی جس نے جسم کے مدوّر خطوط خالد کے لیے خطرناک حد تک نمایاں کر دیئے تھے اس کا چھوٹا سا پیٹ پھنسی ہوئی قمیض میں خالد کو اپنی طرف جھانکتا دکھائی دے رہا تھا۔ قمیض کا گریبان کچھ ایسا قطع کیا گیا تھا کہ فرخندہ کے سینے کا ہلکا ہلکا اُبھار عریاں ہو رہا تھا۔ خالد اس گریبان سے چپکا کمرے میں فرخندہ کے ساتھ ساتھ چکر کھا رہا تھا۔ اُس نے جب انڈمی پن پیش کیا تو اُس کی گرسنہ نظریں پانی کی بوندیں بن کر فرخندہ کے سینے پر گریں اور اس کی قمیض کے اندر بہ نکلیں فرخندہ نے ایک جھرجھری سی لے کر نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا تھا اور خالد کا چیچک زدہ چہرہ پہلے سے زیادہ بدصورت ہو گیا تھا اس کی چوہیا ایسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دھواں کھائی لکڑی کی طرح زرد ہو کر سلگنے لگیں اور وہ کھسیانا سا ہو کر ہاتھ ملنے اور پھر جیب سے رومال نکال کر منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔ فرخندہ نے رکابی میں امرتیاں ڈال کر ماسٹر جی کو دیں تو خالد جل بھن کر رہ گیا۔ فرخندہ نے ذرا ہنس کر ماسٹر جی سے بات کی تو خالد کے منہ میں جھاگ آ گیا اور حلق کڑوا ہو گیا وہ میلے کالر میں پھنسی ہوئی گردن پر انگلی پھیر کر فرخندہ کے بڑے بھائی اکبر سے کہنے لگا۔

"آدمی کو ایک نہ ایک ساز بجانا ضرور سیکھ لینا چاہیئے کیونکہ میرا خیال ہے اس طرح اُس کی روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔؟"

اکبر نے منہ کے اندر ہی اندر اپنے بناوٹی دانت کو نکال کر زبان سے دوبارہ چپکاتے ہوئے کہا۔

"کالج کے دنوں میں ایک بار میں نے طبلہ بجانے کا سبق لیا تھا۔ لیکن دو ہی دن بعد میری ہتھیلیاں سوجھ گئیں۔ پھر میں بنسری بجانی سیکھنے لگا۔ مگر میرے ہونٹ درد کرنے

لگے اور روٹی کھانی مشکل ہو گئی۔

اصل میں یہ باتیں بیکار لوگوں کے مشغلے ہیں۔"

خالد کے کان اکبر کی باتوں پر لگے تھے اور آنکھیں چوری چوری فرخندہ کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ چست قمیض میں پھنسے ہوئے کولھے جب چلنے میں تھر تھراتے تو خالد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں ایک بار فرخندہ نے جھک کر دری پر انجم کا گرا ہوا جُھمکا اٹھایا تو خالد کی گردن اپنے آپ ٹیڑھی ہو گئی اور اس کے گندے دانتوں سے رس کر بہنے والا رال ہونٹوں کے پاس آکر رک گیا۔ فرخندہ کی شلوار پر چائے گر پڑی۔ اُس نے ہلکی سی چیخ مار کر سلوار جھاڑی تو اس کے پائنچے اوپر اُٹھ گئے اور پنڈلیاں تھوڑی تھوڑی ننگی ہو گئیں۔ خالد کو یوں لگا جیسے اُس نے فرخندہ کو ساری کی ساری ننگی دیکھ لیا ہو۔ اس کی کھوپڑی میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس کا نحیف جسم گرم ہو کر ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ اور کانوں میں سیٹیاں سی بج اٹھیں اکبر نے چائے کے لئے مزید دودھ مانگا تو فرخندہ دودھ کا کٹورا لے کر پاس آ گئی اور بازو اٹھا کر اپنے بھائی کی پیالی میں دودھ انڈھیلنے لگی۔ کمرے میں اگرچہ پنکھا چل رہا تھا۔ پھر بھی فرخندہ کے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے اور بغلوں میں قمیض گیلی ہو کر چپک گئی تھی۔ خالد کو گیلی قمیض کے اندر بھورے رنگ کے بال دکھائی دیئے اور اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں اور اس خیال سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا کہ فرخندہ کی گیلی قمیض کے اس حصے کو ماسٹر جی بھی دیکھ رہے ہیں۔ فرخندہ کے جسم سے خس کے عطر کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ خالد کو یہ خوشبو اُس کے پسینے کی بو کا ایک حصہ معلوم ہوئی اور اسے یوں لگا گویا فرخندہ ایک بہت بڑی بغل ہے جو بالوں سے بھری ہے اور پسینے میں تربتر ہے خالد کے نتھنے پھڑکنے لگے اور اسے اپنے جسم میں کمزوری کا احساس ہوا۔ جیسے وہ بڑی جسمانی مشقت کر کے آ رہا ہو۔ اس کے برعکس ہمارے ماسٹر جی اپنی رگوں میں زندگی کا تر و تازہ خون گردش کرتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ ان کی حالت بالکل اس خشک پودے کی سی تھی جسے کئی دنوں کے بعد نہر کا ٹھنڈا پانی مل رہا ہو۔ ان کی محبت، پیار، ماتما --- جو کچھ بھی تھا --- فرخندہ کے وجود کے محدب شیشے سے نکل کر کمرے گلی شہر دنیا اور کائنات کی ہر شے میں جھلکنے لگا تھا ۔ انہیں دنیا کی حقیر سے حقیر شے پر اپنی اسی ماتما، اسی پیار کی چھاپ دکھائی دے رہی تھی۔ فرخندہ گھر یا جنگل کی ہوا بن کر

چل نکلی تھی اور اس کی لہروں نے جس تنکے کا بھی منہ چوم لیا تھا وہ ماسٹر جی کے لئے امر ہو گیا تھا پھول بن گیا تھا چاند بن گیا تھا سورج بن گیا تھا اور اس ایک پھول نے ہزاروں پھولوں کو جنم دے ڈالا تھا ایک چاند نے لاکھوں چاند بنا دیئے تھے اور ایک سورج نے کروڑوں سورجوں کا سراغ دیا تھا محبت اور پریم کی اس عظیم لہر نے روشنی کی اس ہیبتناک چمک نے ماسٹر جی کی بیوی کو بھی خوبصورت بنا دیا تھا اور ان کی گزری ہوئی پُر درد زندگی کی ایک ایک تکلیف ایک ایک مصیبت اور ایک ایک دکھ کو معنی خیز بنا دیا تھا ان کے دل میں اپنی بیمار، چڑچڑی اور بد مزاج بیوی کی خدمت کا ایک ولولہ سا اٹھا اور ان کا جی چاہا کہ وہ اپنی بیوی کے پاؤں دابیں اس کے لئے آگ جلائیں اُسے چائے بنا کر دیں۔ اُس کے جھوٹے برتن مانجھیں اور اس کی دوائیوں کے لئے۔ شہر میں مارے مارے پھرتے رہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ماسٹر جی کو اب اس بات کا دھڑکا بھی لگا تھا کہ فرخندہ نے امتحان پاس کر لیا ہے اور اب ان کی خدمات درکار نہیں ہوں گی۔ انہیں کل یا پرسوں بلا کر بڑی محبت سے کہ دیا جائے گا کہ اب وہ فرخندہ کو پڑھانے مت آیا کریں۔ کیونکہ فرخندہ ادیب فاضل سے نکل گئی ہے اور اب کالج میں جا کر پڑھا کرے گی۔ ماسٹر جی اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس گھر میں انہیں وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی تلاش میں انہوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ صائع کر دیا تھا اس گھر نے ان کی زندگی کے پھیکے خاکوں میں رنگ بھرے تھے۔ ان کے ہر گزرے ہوئے برس کو ہر تباہ حال لمحے کو ہر اوندھے منہ پڑے جذبے کو بڑے پیار سے اٹھا کر سینے سے لگایا تھا یہ گھر ماسٹر جی کی زندگی کا وہ مشرق تھا جس کے قرمزی افق پر سے ان کے اندھیرا کھائے جیون کو سدا کے لئے روشن کر دینے والا سورج طلوع ہوا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پھوٹا ہوا وہ چشمہ تھا جس میں سے نکلے ہوئے دریا نے ان کی زندگی کے ریگستان کی ریت اڑاتی ندیوں کو جل تھل کر دیا تھا یہی وہ مرکزی نقطہ تھا جس کے محور پر آ کر انہوں نے اپنے اردگرد ہر شے کو محبت اور پریم کے ہمہ گیر کبھی نہ شروع ہونے والے کبھی نہ ختم ہونے والے ازلی اور ابدی چکر میں دیکھا تھا۔ وہ اس نقطے سے ہٹ کر ایک بار پھر انتشار، تاریکی اور بے مقصدی کے اذیت ناک کباڑ خانے میں گرنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ کانٹوں میں الجھا ہوا آدمی جب پھول دیکھ لیتا ہے تو اس کی اذیت دو چند ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے منہ سے شیخ صاحب یا اکبر کو نہیں کہہ سکتے تھے کہ انہیں ابھی جواب نہ دیں ابھی فرخندہ

کو مزید محنت کروانے کی ضرورت ہے ابھی ماسٹر جی کی زندگی کے کچھ سال باقی ہیں۔ ابھی وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ماسٹر جی اس روز فرخندہ کی دعوت کے لئے سیر بھر گلاب جامن اور گلاب کے پھولوں کے ہار لائے تھے شیخ صاحب نے ماسٹر جی کو سوا پانچ روپے کی باقر خانیاں ساتھ کر دیں اور پھولی ہوئی سبز ناک سکوڑ کر بولے۔

"دل کہتا ہے آپ کو ایک من مٹھائی لا کر پیش کروں۔

آپ نے جس محنت سے فرخندہ کو پڑھایا ہے اس کا معاوضہ میں دے ہی نہیں سکتا۔ مگر کیا کروں پیسہ کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا صبح سے شام ہو جاتی ہے جب کہیں جا کر ایک پیسے کی شکل نظر آتی ہے۔ آپ برا نہ مانیں میں غریب----"

اکیس روپوں والا پھولوں کا ہار فرخندہ نے بنوایا تھا جسے دیکھ کر شیخ صاحب کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا۔ یہ روپے فرخندہ نے اپنی امی سے لئے تھے جس نے ہمیشہ سے اپنی بیٹی کی خوشی کا خیال رکھا تھا اس کے لئے اپنے سخت دل کنجوس خاوند کی جھڑکیاں بھی سہی تھیں۔

ماسٹر جی ہار اور باقر خانیوں کی ٹوکری اٹھائے مصری شاہ کے پل پر سے سواریوں والے تانگے میں سوار ہو کر رات کو گھر پہنچے۔ ان کی بیوی کو سر درد کا دورہ پڑ گیا تھا اور وہ چھت پر لیٹی ہائے وائے کر رہی تھی اپنے خاوند کو سر درد کے بغیر آتا دیکھ کر جل بھن کر رہ گئی۔ مزید براں جب پھولوں کے ہار دیکھے تو اس کے مرض میں شدت سے اضافہ ہو گیا سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"کوئی جئے یا مرے۔ تمہاری بلا سے تمہیں تو اس گھر والوں نے تعویذ پلا دیا ہے میں پوچھتی ہوں آخر وہاں میری کونسی سوکن بیٹھی ہے جس نے تمہیں بیوی بھلا دی؟ ہائے ---ہائے---میں کل ہی وہاں جا کر اس کا منہ نوچ لوں گی تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟ ہائے۔ ہائے----"

ماسٹر جی کے لئے یہ نئی باتیں نہیں تھیں۔ انہوں نے ٹوکری اور ہار شکستہ تخت پوش پر رکھے اور بیوی کے پاس جا کر اس کا سر دبانے لگے۔

"دوائی پی تھی؟"

بیوی نے ان کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

"تم پوچھنے والے کون ہو؟"

ماسٹر جی چپکے سے اٹھ کر نیچے گئے بیوی کے لئے کیتلی میں چائے گرم کی اور اوپر لا کر اُسے گھونٹ گھونٹ پلانے لگے۔ بیوی نے چائے پیتے ہوئے پھولوں کے ہار میں لگے روپے روپے کے نوٹ دیکھے تو ہاتھ سے پیالی پرے ہٹا کر بولی۔

"انہوں نے اور کیا دیا ہے؟"

ماسٹر جی نے پیالی تخت پوش پر رکھ دی اور اپنی کھاٹ پر بیٹھ گئے۔

"سوا پانچ کی باقر خانیاں اور یہ ہار۔"

"کتنے کے نوٹ ہیں تم نے کوئی اڑایا تو نہیں؟"

ماسٹر جی نے سر کھجلا کر کہا۔

"اکیس روپے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک روپیہ نکال کر تانگے والے کو دونی دی تھی۔"

"تم سے پیدل نہیں آیا جاتا تھا؟ تمہیں خبر نہیں بیماری نے میرا کیا حال کر دیا ہے؟

مجھے اچھی خوراک اچھے علاج کی ضرورت ہے؟ لاؤ یہ سب کچھ ادھر۔"

بیوی نے باقر خانیوں کی ٹوکری اپنی چارپائی کے نیچے کر لی اور ہار توڑ کر سارے کے سارے روپے نکالے اور انہیں ایک ایک کر کے گننے لگی۔ پورے بیس گن کر اُس نے باقی چودہ آنے ماسٹر جی سے بھی لے لئے۔ ساری رقم اپنے سرہانے کے نیچے دبائی اور ایک بار پھر سر کے درد سے کراہنے لگی۔ ماسٹر جی پائنتی کی طرف ہو بیٹھے اور بیوی کے پاؤں دابنے لگے۔ کیونکہ سر کو وہ اس لئے ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی کہ بقول اس کے ماسٹر جی کے گندے کپڑوں میں سے گھوڑے کی لید کی بد بو آتی تھی۔ انہوں نے بیوی کے کہنے پر کچی دیوار کے ساتھ رسی میں بندھا بجلی کا بلب بجھا دیا کیونکہ روشنی میں مچھر تنگ کرتے تھے۔ اور خود کبھی اس کے پاؤں دابتے اور کبھی اسے کھجوری پنکھے سے ہوا دیتے بیوی سو گئی تو ماسٹر جی بڑی آہستگی سے پائنتی سے اٹھے اور زمین پر ہار میں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے گلاب کے پھول جھولی میں ڈال کر نیچے لے گئے۔ پہلی منزل میں جا کر انھوں نے پھولوں کو اپنے پرانے ٹرنک میں کپڑوں کے تلے اسی جگہ بچھا دیا جہاں اس سے پہلے کے فرخندہ کے گل دان کے

باسی پھولوں کے پتیاں اور اسکے کھائے ہوئے بیروں کی گٹھلیاں رکھی تھیں۔ جب انھوں نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کیا انھیں اس کے اندر سے چھوٹے چھوٹے بچوں کی سسکیاں لے لے کر رونے کی کمزور آوازیں سنائی دیں ماسٹرجی نے اس بد نصیب باپ کی مانند سر جھکا کر ان آوازوں کو سنا جسے اب اپنے بچوں سے ملنے کی کوئی اُمید نہ ہو اور چپکے سے اٹھ کر دوسری منزل میں آگئے۔ یہاں انہوں نے لکڑی کا بورا جلا کر دوپہر کی بچی ہوئی کھچڑی گرم کر کے کھائی پانی پیا اور اوپر اپنی کھاٹ پر آ کر لیٹ گئے۔ رات بھر انہیں مچھر کاٹتے رہے ان کی بیمار بیوی وقفے وقفے کے بعد ہائے وائے کرتی رہی۔ لیکن وہ سوئے رہے۔ دوبار انہوں نے اٹھ کر بیوی کو پانی پلایا اور پھر سو گئے۔

اس رات خالد سمن آباد والے اپنے مکان کی کھلی چھت پر مچھر دانی لگے پلنگ پر بالکل نہ سو سکا۔ اسے ایک بھی مچھر نہیں کاٹا پھر بھی پہلو بدلتا رہا۔ بار بار اٹھ کر صراحی میں سے ٹھنڈا پانی پیتا رہا۔ فرخندہ کا بدن کبھی بالوں کا گچھا بن کر اس کے جسم پر پھرنے لگتا اور خالد کو کھجلی شروع ہو جاتی کبھی وہی بدن سوکھی ریت بن کر اس کے حلق میں اڑنے لگتا اور خالد اٹھ کر پانی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جاتا اور کبھی زخم کا گہرا سرخ نشان بن کر اس کی مسہری کے اندر دہکنے لگتا اور خالد کے سارے جسم میں درد شروع ہو جاتا۔ کبھی وہ اپنے آپ میں یوں محسوس کرتا جیسے فرخندہ کا جسم ایک دلدل بن گیا ہے اور وہ اس کے اندر دھنستا ہی چلا جا رہا ہے اندر اور اندر ---- اور اس کے منہ سے چیخ سی نکل جاتی۔ کسی وقت وہ دیکھتا کہ فرخندہ کو گھوڑے پر بٹھلائے اڑائے چلے جا رہا ہے اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ مقابلے پر آئے ہوئے ہر دشمن کا سر قلم کیے جا رہا ہے پھر اُس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے یہاں سینکڑوں عورتیں بھی ہیں ان میں فرخندہ بھی ہے اور خالد سٹیج پر بیٹھا ستار بجا رہا ہے۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہے۔ اس کے سنگیت نے لوگوں کو دم بخود کر دیا ہے۔ پھر لوگ تالیاں بجاتے ہوئے اٹھ کر اُسے پھولوں سے لاد رہے ہیں۔ فرخندہ اس کے گلے میں اپنے ہاتھ سے پھولوں کا ہار ڈال رہی ہے۔ کبھی وہ بہت بڑا شاعر بن جاتا اور کچھ ایسے انداز میں شعر پڑھتا کہ لڑکیاں خوشی کے نعرے بلند کرتیں۔ سٹیج پر آ کر اس سے لپٹ لپٹ جاتیں۔

مصیبت یہ تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں اپنے آپ کو ایک ہی روپ میں دیکھ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ مردوں اور عورتوں کے اس بے پناہ خیالی ہجوم میں اپنے آپ کو بیک وقت سنگیت کار،

شاعر فلاسفر، دنیا کا سب سے بڑا امیر آدمی مشہور ایکٹر حسین ترین نوجوان سپین کا بہادر بھینسے باز اور چمپئن پہلوان دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اُس نے شہر کی ہر لڑکی کے دولہا کے بھروپ میں اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ ہر برات میں دولہا بنا پھولوں میں لدا پھندا، خوشبو دیتا ریشمی رومال ہونٹوں پر رکھے، کار میں بیٹھا ہر دلہن کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ پھر ہر دلہن فرخندہ بن گئی اور ہزاروں لاکھوں فرخنداؤں کو گاڑیوں میں لاد لاد کر گھر لے آیا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہر حجلہ عروسی میں گھسنے لگا۔ اب وہ فلم کا ایک ہر دلعزیز ہیرو بن گیا وہ جس گلی میں سے گزرتا عورتیں کھڑکیوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتیں اسے دبی دبی آہوں کی آوازیں سنائی دیتیں اس پر عطر میں بسے ریشمی رومال اور محبت نامے پھینکے جاتے جب یہ طلسم ٹوٹتا تو خالد کے ہونٹ کڑوے ہوتے حلق خشک ہوتا اور اُسے اپنے بد صورت، کمزور جسم سے پہلے سے بھی بڑھ کر نفرت ہو جاتی وہ سوچتا کہیں سے اسے سلیمانی ٹوپی مل جائے جسے پہن کر وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

اور یوں ہر خوبصورت لڑکی کے کمرے میں گھس کر اس کے جسم سے لذت اندوز ہو اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر باہر آ جائے یا پھر وہ مشین گن لے کر گھر سے نکل پڑے اور دنیا کے ہر خوبصورت اور صحت مند آدمی کو گولیوں سے بھونتا چلا جائے۔ غرضیکہ ساری رات خالد کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ پھلوں کے نرم نرم بستر پر پڑا ہے اور اُسے ہزاروں بچھو، مچھر اور کیڑے مکوڑے کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ صبح اٹھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فرخندہ سے شادی کر کے رہے گا فرخندہ اس کی سب سے قریبی رشتے دار ہے اسے فرخندہ پر سب سے زیادہ حق ہے اور وہ فرخندہ کو اپنی قرابت داری باپ کی سوشل حیثیت اور اپنی ڈگری کی وجہ سے جو اس سے بہتر اور کہیں استعمال میں نہیں آ سکتی تھی آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے لئے پہلی شرط خالد کا برسر روزگار ہونا تھا۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ ایم اے کرنے کے بعد فوراً کہیں نہ کہیں ملازمت کر لینی چاہیئے امتحان وہ دے چکا تھا اور اب نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ یہ رہ گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح فرخندہ کو کالج میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ کیونکہ اگر وہ کالج میں داخل ہو گئی تو ظاہر ہے خالد کو اس کے بی اے وغیرہ کرنے تک دو تین سال انتظار کرنا پڑے گا۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کالج کی فضاء میں پہنچ کر فرخندہ کو کسی ایسے

لڑکے سے محبت ہو جائے جو خالد سے خوبصورت، سمارٹ اور صحت مند ہو۔ اگر محبت نہ بھی ہو سکی۔ جب بھی محض کالج کی فضا میں چند برس گزارنے کے بعد فرخندہ کے زاویہ نظر کے بدلنے کا امکان تھا۔ وہ بہتر سے بہتر اور من چلے سے من چلا لڑکا دیکھ چکی ہو گی۔ ہو سکتا ہے پھر وہ خالد کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ سوال یہ تھا کہ فرخندہ کو گھر کیسے بٹھلایا جائے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ شیخ فقیر دین یعنی فرخندہ کے والد کے کان میں کالج کی برائیاں اور نئی تعلیم کے خطرات ڈالے جائیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ لڑکیوں کو کالج میں پڑھانا اپنی کمائی کو آگ لگانا ہے خالد کو یقین تھا کہ دوسری بات شیخ صاحب کے دل کو لگے گی۔ اور ہوا بھی یہی خالد نے کچھ ایسی ہوشیاری، موقعہ شناسی اور مکاری سے باتیں کیں۔ کہ شیخ صاحب فرخندہ کو کالج کی بجائے گھر ہی پر پڑھانے پر راضی ہو گئے۔ خالد کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ فرخندہ پڑھائی ہی چھوڑ دے لیکن فرخندہ کی امی اکبر اور شیخ صاحب نے اس کی مخالفت کی کیونکہ کم پڑھی لکھی ہونے کی صورت میں فرخندہ کی شادی کسی اعلیٰ سرکاری افسر سے نہیں ہو سکتی تھی طے یہ ہوا کہ فرخندہ کو گھر پر ہی ماسٹر جی اگلے امتحان کی تیاری کروائیں گے۔ اس سودے میں خالد کو اتنا نقصان ضرور ہوا کہ ماسٹر جی کا کانٹا وہیں کا وہیں موجود رہا۔ مگر خالد کو ماسٹر جی سے وہ خطرہ نہیں تھا جو فرخندہ کے کالج جانے کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف فرخندہ کو کالج سے ایک بار پھر بچھڑنے کا از حد دکھ ہوا کیونکہ مسعود سے کھلم کھلا ملنے کی اُمید پر ایک بار پھر پانی پھر گیا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ یہ سارا کیا دھرا خالد کا ہے تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اسے خالد زہر دکھائی دینے لگا۔ اب اس نے خالد سے بات چیت کرنا بھی ترک کر دیا۔

ادھر ہمارا جدت پسند عاشق مسعود اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود فرخندہ سے بے خبر نہیں تھا۔ دوسرے حملے میں زبردست ہزیمت اٹھانے کے بعد وہ ایک بہت بڑے حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ فرخندہ کو حاصل نہ کر سکنے کی حقیقیت کو اس نے اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ گویا کسی نے اس کے گھر میں مری ہوئی بلی پھینک دی ہو اور مسعود اس بلی کی لاش لیے دشمن کے گھر کی تلاش میں پھر رہا ہو۔ اس نے لڑکی بن کر ڈر پوک انجم کے پتہ پر فرخندہ کو خط لکھا انجم سنگر مشین پر بیٹھی چادر کے کناروں پر پھول کاڑھ رہی تھی کہ اس کی والدہ نے خط لا کر دیا۔ اُس کا رنگ اڑ گیا اور مشین کے پائیدانوں پر پاؤں بھاری ہو گئے۔

دوپہر کو اس نے وہ خط فرخندہ کو دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"فرخی خدا کے لئے اُسے منع کرو کہ خط نہ لکھا کرے اگر کسی کو شک پڑ گیا تو مجھے جان سے مار دیا جائے گا۔"

فرخندہ نے خوشی خوشی لفافہ چاک کیا اور سر جھٹک کر کہنے لگی۔

"تو تو یونہی مری جا رہی ہے وہ تو لڑکی بن کر خط لکھتا ہے۔"

انجم خشک ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر فرخندہ کو اپنی گھریلو مجبوریاں بیان کرنے لگی۔ اور فرخندہ بڑے انہماک سے خط پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ مسعود نے اُسے پاس ہونے پر مبارکباد دی تھی اور ملنے کے لئے بلایا تھا۔ فرخندہ نے ایک ایک سطر کو بار بار پڑھا اور ہنسنے لگی۔ کیونکہ مسعود نے بڑی کاوش سے لڑکیوں کی لکھائی میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔ ہر لفظ کا آخری حرف مڑ گیا تھا اور سطریں بینگی ٹیڑھی ہو رہی تھیں۔ فرخندہ نے اسی وقت ایک مختصر سا خط کا جواب لکھ دیا اور اپنی کاپی میں چھپا دیا اس کا خیال تھا کہ صبح وہ خود انار کلی جا کر اسے پوسٹ کر دے گی۔

ماسٹر جی حسب سابق شام کو پڑھانے آیا کرتے تھے۔ یعنی چار پانچ بجے کیونکہ ہمارے ہاں شام سے مراد یہی وقت لیا جاتا ہے۔ اُس روز آسمان پر ساون کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی شاد باغ اور وسن پورے کے پار والے کھیتوں اور پھلدار باغوں کی جانب کسی وقت کوئل کی صدا سنائی دے جاتی تھی۔ یہ بھادوں اور اسوج کے ملاپ کا زمانہ تھا اور بارش کے بعد رات کو ٹھنڈ سی ہو جایا کرتی۔ یعنی لوگ چادر لے کر کمرے کے اندر سویا کرتے تھے۔ ساون رت نے اس آبادی کے بعض نشیبی علاقوں کو مستقل جوہڑ بنا دیا تھا۔ مکانوں کی حوضیاں اپنے گندے پانی سمیت ان جوہڑوں سے جا ملی تھیں۔ یہاں لوگوں کو مچھر دن کے وقت بھی کاٹا کرتے۔ راتوں کو تو ان لوگوں کو چین کا ایک پل بھی نہ ملتا بازار کیچڑ سے بھر جاتا بسیں اور تانگوں کے گھوڑے اپنی ٹاپوں سے یہ کیچڑ اڑا اڑا کر دکانداروں اور راہ چلنے والوں پر اچھالا کرتے مصری شاہ والا پرانا گندا نالا گندے تیل کی بو چاروں طرف پھیلا دیتا اور اس میں گداموں کے آنگن میں ڈکراتی بھینسوں کی آوازیں اور گوبر کی بد بو بھی آن شامل ہوتی۔ فرخندہ کے مکان کے باہر گلی میں دھریک یا بکائن کے پیڑ ہرے ہرے ترو تازہ پتوں سے لد گئے تھے آنگن والی بیری کا بھی یہی حال تھا اس نے تو

گویا نئی سبز پوشاک پہن لی تھی۔ لیکن اُس کی اُوپر والی ٹہنیوں میں الجھی ہوئی پتنگ کا ڈھانچہ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ اس ڈھانچے میں تھوڑی سی ڈور بھی الجھی ہوئی تھی جس کا مانجا بارشوں میں اتر گیا تھا۔

تیسرے پہر ماسٹر جی بھی فرخندہ کو پڑھانے آئے ساون کے پانی سے لدے بادل جھکے ہوئے تھے معلوم ہو رہا تھا کہ بارش ہوئی کہ ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گندے نالے کے پل والے گوالے بھینسوں کو باڑے میں ہانک رہے تھے۔ گلی والے بکائن کے پیڑوں کی ہرے بھرے پتوں والی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں میں کبھی اس طرف کو لہراتیں اور کبھی دوسری طرف کو جھک جاتیں بیٹھک والی جالی دار کھڑکی کا پردہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا کمرے میں بادلوں کی وجہ سے بڑا خوشگوار اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ فرخندہ نے بتی جلا دی اور کتاب کھول کر ماسٹر جی سے سبق لینے لگی۔ اس کے ماتھے پر آئی ہوئی خشک بالوں کی ایک لٹ ہوا میں ہل رہی تھی۔ دوسری منزل میں بھابی عذرا کا بچہ کسی بات پر ضد کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ فرخندہ کی بہن بلقیس اپنی بچی کو کھٹولی پر سُلا کر اُس پر جالی ڈال غسل خانے میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ فرخندہ کی والدہ باورچی خانے میں ترکاری بنانے میں مصروف تھیں۔ اسلم اپنے دوستوں کے ساتھ شاہدرہ پک نک پر گیا ہوا تھا۔ اکبر اپنی بیوی کو بار بار بچے کو چپ کرانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ شیخ صاحب ابھی دکان پر ہی تھے۔ ماسٹر جی کوئی ایک گھنٹہ پڑھانے کے بعد فرخندہ کو انگریزی کے مشکل الفاظ کے معنی لکھوا رہے تھے کہ رسوئی میں سے فرخندہ کی امی نے آواز دی۔

"فرخندہ بیٹی! آ کر چائے پی جاؤ۔"

فرخندہ نے "آئی امی" کہا اور کاپی بند کر کے باہر نکل گئی۔

فرخندہ کے جانے کے بعد ماسٹر جی نے جیب سے ڈبیا نکال کر سگریٹ جلایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کش لگانے لگے۔ پھر انہوں نے ایک کتاب اٹھالی۔ اُسے کھولا پہلے صفحے کے کونے میں فرخندہ نے پن سے اپنا نام لکھا تھا۔ ماسٹر جی کو وہ اپنا نام معلوم ہوا۔ انہوں نے کتاب بڑی عقیدت سے بند کر کے رکھ دی۔ کتاب کے پاس ہی سرخ جلد والی ایک کاپی پڑی تھی۔ ماسٹر جی نے کاپی اٹھالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ یہ فرخندہ کی انگریزی کی کاپی تھی جس میں اس نے مشکل الفاظ کے معنی لکھ رکھے تھے ماسٹر جی

فرخندہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو بڑی محبت عقیدت اور تقدس سے دیکھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ورق الٹا تو اچانک ان کے سامنے پیڈ کے چھوٹے نیلے کاغذ پر مسعود کے نام لکھا ہوا فرخندہ کا محبت نامہ آ گیا۔

پیارے مسعود!

اتنی دیر کے بعد تمہارا پیارا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ تم نے یہ کیوں لکھا؟ بھلا میں تمہیں کبھی بُھلا سکتی ہوں۔ مرد بے وفا ہوتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں۔ مگر عورت کی محبت سچی ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں بس ایک ہی بار محبت کرتی ہے۔ اور جس کے ساتھ کرتی ہے اس کے سوا اور کسی کو کبھی منہ نہیں لگاتی بس اُسی کی ہو رہتی ہے۔ تمہیں کیا خبر میں نے تمہارے بغیر اتنے سارے دن کس طرح گزارے ہیں جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔ مگر دل نہیں مانتا۔ تمہاری پیاری پیاری صورت سامنے آ جاتی ہے کیا کروں۔ اچھا میں منگل کے دن دوپہر کو پورے ایک بجے تم سے ملنے لارنس باغ والے چڑیا گھر کے گیٹ پر آؤں گی۔ تم گیٹ کے پاس میرا انتظار کرنا جی تو تم سے ملنے کو ذرا نہیں چاہتا۔ پھر خیال آتا ہے۔ کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔

ہمیشہ تمہاری

فرخندہ

ماسٹر جی نے جلدی سے کاپی بند کر کے میز پر رکھ دی۔ حالانکہ فرخندہ ابھی رسوئی میں ہی تھی۔ پھر بھی انہیں یوں لگا جیسے وہ ان کے پاس کھڑی انہیں چوری چوری خط پڑھتے دیکھ رہی ہے ان کے ہاتھ کی انگلیاں کانپیں اور سگریٹ کی راکھ کپڑوں پر گر پڑی۔ وہ کپڑے جھاڑنے لگے تو سگریٹ دری پر گر پڑا وہ جھک کر سگریٹ اٹھا رہے تھے کہ فرخندہ چائے لیے اندر داخل ہوئی۔

"ایش ٹرے تو آپ کے پاس ہی رکھا ہے ماسٹر جی۔"

"ہاں ہاں۔ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔"

فرخندہ نے چائے کی پیالی بنا کر ماسٹر جی کو دی۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ پینے لگے دو ایک بار پیالی ان کے ہاتھوں میں کانپ کانپ گئی۔ مگر انہوں نے جلد اپنی اس کمزوری پر قابو پالیا۔ فرخندہ بھی چائے پی رہی تھی اور ماسٹر جی کو اپنے بھائی کے بچے بلّو کی شرارتوں

کے قصے بھی سنا رہی تھی۔

"ماسٹر جی کیا بتاؤں۔ اب تو وہ اتنا ہوشیار ہو گیا ہے کہ جس چیز کا نام لو اُسے اٹھا کر لے آتا ہے۔ کل میں نے اُسے کہا۔ بلّو اندر پلنگ پر سے تولیہ اٹھا لاؤ بھاگا بھاگا گیا اور تولیہ لے آیا۔

چڑیا کو دیکھ لے تو "چیا۔ چیا" کہتا اس کی طرف ہاتھ ہلانے لگتا ہے۔"

ماسٹر جی فرخندہ کی باتیں بھی سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں اس محبت نامے کے الفاظ بھی گونج رہے تھے۔ جو فرخندہ نے مسعود کو لکھا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے فرخندہ انہیں جھوٹ موٹ بلّو کی باتیں سنا رہی ہے دراصل وہ انہیں کہنا چاہتی ہے کہ ماسٹر جی! کیا بتاؤں اب تو مسعود کے بغیر جینا دوبھر ہو گیا ہے جس چیز کا بھی نام لوں بے اختیار زبان سے مسعود نکل جاتا ہے منگل وار کو اسے ملنے لارنس باغ جا رہی ہوں۔ ابھی منگل کے بیچ دو روز باقی ہیں۔ لیکن میرا دل ابھی سے دھڑکنا شروع ہو گیا ہے میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں مسعود سے بے حد پیار کرتی ہوں۔

وہ فرخندہ کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہے تھے جن پر انہیں اس کے عاشق کے بوسوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے فرخندہ کے ہونٹوں کے پاس زخم کے نشان کو بھی غور سے دیکھا۔ انہیں یوں لگا جیسے یہ بھی اُس کے عاشق کی سنگدلی کا مظہر ہے چائے پیتے میں ان پر ایک لطیف سی غم انگیز اُداسی چھا گئی تھی۔ ان کی حالت کچھ ایسی عورت سے ملتی جلتی تھی جسے ایک عرصے کے بعد جا کر یہ راز معلوم ہو کہ وہ اپنی گود میں کسی دوسرے کے بچے کی پرورش کر رہی ہے یا اس کسان سے مشابہ تھی۔ جس کی کمائی ہوئی فصل اس کی آنکھوں کے سامنے غیروں میں لٹ رہی ہو۔ وہ مسعود نامی فرخندہ کے عاشق کو اپنا رقیب نہیں سمجھ رہے تھے۔ انہیں تو وہ ایک ایسے ڈاکو کی شکل میں نظر آ رہا تھا جو انہیں غافل پا کر ان کی جمع پونجی کو لوٹے لئے جا رہا ہے ماسٹر جی کو مسعود پر رشک بھی آ رہا تھا۔ اور تعجب بھی ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی صرف یہی ایک صفت تھی کہ وہ بوڑھا نہیں تھا اور اُس نے فرخندہ کو کبھی ایک بار مصنوعی آہ بھر کے کہا ہو گا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہو۔" کیا اس جملے کو اتنا حق دیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک دوسرے انسان کے تمام حقوق کو پامال کرتا ہوا انہیں بے حقیر تنکوں کی طرح بہا کر لے جائے؟ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہے

جو ماسٹر جی ایسے ادھیڑ عمر کے بے وقوف بے ضرر بے اثر لوگوں کو ان کی کھوئی ہوئی لٹی ہوئی محبتیں واپس دلوا سکے؟ فرخندہ اب ماسٹر جی کی نہیں تھی۔ وہ کبھی بھی ان کی نہیں تھی۔ لیکن انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا انہوں نے کسی وقت کسی لمحے بھی فرخندہ کو ان معنوں میں اپنی نہیں سمجھا تھا جن معنوں میں ایک جوان آدمی اپنی محبوبہ کو سمجھتا ہے۔ وہ تو فرخندہ کو اپنے اندھیرے گھر کا اجالا تصور کرتے تھے اور اب یہ اجالا ان کے گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔

ماسٹر جی واپس اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے راستہ بھر اسی قسم کے پریشان کن خیالات میں اُلجھے رہے اتنی مدت کی خوشگوار تسکین کے بعد پہلی بار ان کا ذہنی سکون متزلزل ہو رہا تھا بادلوں میں ہلکی ہلکی گرج کے بعد بوندا باندھی ہونے لگی تھی شام ہو گئی تھی اور مصری شاہ کی دکانوں کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ ماسٹر جی نے چھتری کھول کر اوپر کر لی اور سر جھکائے پیدال ہی چلتے گئے۔ ایک تانگہ تیزی سے ان کے قریب سے ہو کر گزرا۔ کوچوان نے تلخ لہجے میں ماسٹر جی کو کچھ کہا جسے انہوں نے بالکل نہ سنا۔ اس وقت وہ بڑے ہی حسرت انگیز اور پُر اذیت لمحات کا عذاب برداشت کر رہے تھے۔ ان کی ساری شخصیت دو ٹکڑوں میں بٹ کر انہیں اپنے چوڑے چوڑے پاٹوں میں گیہوں کے دانوں کی طرح پیس رہی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے ہر جذبے نے اپنا نقاب الٹ دیا ہے اور اپنے اپنے درجوں میں وہ ان سارے دوستوں اور دشمنوں کو چیختے چلاتے عریاں دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک بڑے ہی ہیبتناک منظر کی نقاب کشائی ہو گئی تھی۔ بڑی ہی شرمناک حقیقت کا گیان حاصل ہو گیا تھا۔ یہاں وہ ایک ادھیڑ عمر کے باپ کو دوسرے کی بچی سے درپردہ عشق کرتے اور ایک ادھیڑ عمر کے عاشق کو دوسرے کی بچی کا باپ بنتے دیکھ رہے تھے یہاں عشق اور مامتا ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ روشنی اور اندھیرا کچھ اس طرح ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے کہ وہ بالکل الگ الگ بھی دکھائی دے رہے تھے اور انہیں کوئی الگ الگ کر بھی نہیں سکتا تھا ایک نامراد باپ اور ایک ناکام عاشق کی سر بفلک شوریدہ سر موجوں کے طوفان میں ماسٹر جی کی کمزوری، بیوقوف سی شخصیت کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے کی طرح تھپیڑے کھا رہی تھی اور خوفناک سمندر کی ہیبت سے لرز رہی تھی۔ ماسٹر جی کو پسینے آ گئے چھتری پر گرتی بوندوں کا شور انہیں سمندری طوفانوں کی ہاہاکار سے مشابہ معلوم ہو رہا تھا۔ ان

کے دل و دماغ میں ایسا کہرام مچ رہا تھا جس کی ایک ہلکی سی آہٹ بھی انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

کئی بار انہوں نے اپنے دل سے کہا کہ وہ کیوں پریشان ہے؟ فرخندہ کو ایک نہ ایک روز کسی دوسرے کا ہونا ہی تھا اگر کل کو اس کا بیاہ ہو جاتا تو کیا پھر بھی وہ اسی طرح تڑپتا اور خون کے آنسو روتا؟ فرخندہ کو کبھی انہوں نے مسعود ایسے نوجوانوں کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اسے اپنی بچیوں کی طرح سمجھتے ہیں اور بچیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ انہیں تو ایک نہ ایک دن کسی غیر مرد کے حوالے کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر یہ سارا ہنگامہ، یہ تکلیف دہ سوچ، کرب انگیز ملال اور شرمناک پچھتاوا کس لئے؟ کیوں؟ --- ماسٹر جی کی اس قسم کی باتوں کا ان کے دل پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ کہیں یہ بھی تو ایک حقیقت نہیں تھی کہ ہمارے ماسٹر جی نے کبھی فرخندہ کو صحیح معنوں میں اس نظر سے نہیں دیکھا تھا جس نظر سے اس کا باپ شیخ فقیر دین اسے دیکھتا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے۔ کہ دنیا کا کوئی باپ سوائے اپنی بیٹی کے اور کسی کی جوان لڑکی کو اپنی بیٹی نہیں سمجھ سکتا؟ چاہے اس عفریت، اس درندے کو لاکھ اخلاقی اور معاشرتی قواعد کی بوسیدہ زنجیروں میں باندھ باندھ کر رکھا جائے؟ ہماری خواہش ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن ہم زندگی کے حقائق کو اپنی خواہش کے مطابق کبھی نہیں ڈھال سکتے۔ ہماری خواہش اپنی جگہ پر اور زندگی کے حقائق ہمیشہ اپنی جگہ پر رہیں گے مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہمارے ماسٹر جی نے فرخندہ کو کبھی عاشق کی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا یا اگر وہ دیکھ رہے تھے تو انہیں اس کی خبر نہیں تھی۔ یہ تو بالکل کسی دوسرے کے مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر جھانکنے والی بات تھی اس من کے اندر چھپے ہوئے چور کے وجود کا تو ماسٹر جی کو اب احساس ہوا تھا جب کہ انہیں فرخندہ کے انگ انگ پر کسی دوسرے مرد کی ملکیت اور محبت کی مُہر دکھائی تھی۔ جب تک وہ خود اپنے آپ سے کہتے رہے کہ وہ فرخندہ کو کبھی اپنی نہیں بنا سکتے۔ انہیں اس کے شدید رد عمل کا احساس نہ ہوا تھا لیکن اب یہی بات ایک دوسرے مرد نے انہیں کہ دی تھی اور وہ اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنی بھیانک محرومی کے متحمل نہیں ہو رہے تھے گویا ایک آبشار تھی جو دریا کی بجائے مٹی کے پیالے میں آن گری تھی اور پیالے کے پرخچے اڑ گئے تھے جب تک سورج چمکتا رہا انہیں دھوپ کا احساس نہ ہوا جونہی سورج غرب ہوا تو وہ روشنی کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ جب

تک پھول گلدان میں پڑے رہے انہیں خوشبو کا پتہ بھی نہ چلا۔ جونہی کوئی گلدان اٹھا کر کمرے سے باہر لے گیا تو ماسٹر جی نے چونک کر ارد گرد دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں۔ "وہ خوشبو کہاں چلی گئیں۔؟"

انہوں نے سوچا اگر ان کا یہ لگاؤ خالص جسم کا لگاؤ بھی ہوتا تو سوائے جدائی کے درد، بدنامی کی خاک، ذلت کے شرمناک داغوں اور عمر بھر کے پچھتاوے کے انہیں اور کیا مل جاتا وہ کسی لڑکی سے بیاہ نہیں کر سکتے کسی کی عشقانہ محبت حاصل نہیں کر سکتے۔ کسی لڑکی کو عمر بھر نہیں پڑھا سکتے کسی کو اپنی محبوبہ نہیں بنا سکتے۔ کسی کو اپنی بچی نہیں بنا سکتے۔ سوائے ایک بیمار، بد مزاج اور بدصورت بیوی کے ان کا اور کوئی نہیں ہے۔ اور سوائے ایک درد بھرے بے کس اور ہبرت انگیز بڑھاپے کے ان کا اور کچھ نہیں ہوگا۔ ایک دن وہ مر رہے ہوں گے نزاع کا عالم ہوگا۔ آوازیں ڈوب رہی ہوں گی شکلیں دور ہو رہی ہوں گی۔ اور وہ بستر مرگ پر سوکھی پژمردہ بے نور آنکھیں بند کئے سوچ رہے ہوں گے کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ اس سارے ناٹک کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ دریا کہاں سے نکلا تھا اور کہاں آ کر ختم ہو رہا ہے۔ سوائے اندھیرے کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ کوئی اولاد نہیں۔ کوئی نام لیوا نہیں۔ کوئی محبت میں آنسو بہانے والا نہیں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں ---- مصری شاہ والی گلی کے بکائن کے درخت بہار میں پھول لایا کرتے تھے۔ ٹہنیوں میں چڑیاں بولا کرتی تھیں۔ اب کچھ نہیں کچھ نہیں --- بیری کے آنگن والے مکان میں ایک لڑکی ان کے لئے چائے بنایا کرتی تھی۔ وہ لڑکی اب کہاں چلی گئی کیا وہ بھی ایک دن بوڑھی ہو جائے گی؟ کیا ایک دن اس کا بھی منہ پوپلا ہو جائے گا اور ایک ایک کر کے سارے دانت جھڑ جائیں گے۔ ظالم ہے: ظالم ہے اس زندگی کے کھیل کھیلنے والا! --- پھر انہیں خیال آئے گا کاش انہوں نے ایک بار، صرف ایک بار کسی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہوتا۔ کاش زندگی ایک بار پھر اسی ہرے بھرے درختوں والی گلی کی طرف لوٹ چلے! کاش پردہ ایک بار پھر اٹھے اور پاوڈر سرخیوں سے چمکتے ہوئے خوبصورت چہروں والا وہ خواب انگیز ناٹک ایک بار پھر شروع ہو ---- لیکن پھر تو ایک پل کی بھی مہلت نہیں ملے گی زندگی اپنا آنچل اٹھائے دامن کشاں دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہوگی۔ دریا کا پانی واپس لوٹ سکتا ہے۔ مگر پھول کی اڑتی ہوئی خوشبو کا دامن کوئی نہیں کھینچ سکتا خوشبو اڑتی جا رہی ہوگی زندگی خلاؤں کے راکھ آلود اندھیروں میں گھلتی

اڑتی گُم ہورہی ہو گی اور اس سمندر میں غرق ہونے والے جہاز کے مستول کا آخری سرا ایک بار ابھرے گا پھر ڈوب جائے گا اور پھر کچھ باقی نہیں رہے گا۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔

ماسٹر جی اب فرخندہ کو پڑھانے آتے تو سارا وقت اپنی شاگرد سے نگاہیں چرائے رہتے کسی وقت پڑھاتے میں گہری سوچ میں گم ہو جاتے اور پھر اپنے آپ ہی چونک اٹھتے فرخندہ غیر شعوری طور پر ماسٹر جی میں ایک ہلکی سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی اُس نے ایک بار یونہی پوچھ بھی لیا۔ ماسٹر جی سر درد کا بہانہ بنا کر چپکے ہو رہے۔ پیر وار کی شام کو ماسٹر جی دل پر ایک نامعلوم سا گہرا بوجھ لے کر فرخندہ کے گھر سے نکلے۔ انہیں معلوم تھا کل دوپہر کو وہ مسعود سے ملنے جا رہی ہے۔ فرخندہ اس روز بڑی چہک رہی تھی اور اس نے ماسٹر جی کو دو بار چائے بنا کر دی تھی اور پوچھا تھا۔

"آپ بسکٹ کیوں نہیں کھا رہے ماسٹر جی؟"

لیکن ماسٹر جی فرخندہ کے گیلے بالوں کو دیکھ رہے تھے جن میں چھلے ڈالنے کے لئے پنیں لگی ہوئی تھیں۔ چہرے کی جلد کولڈ کریم کی مالش سے روغنی ہو رہی تھی کل یہ چہرہ گلاب کے پھول کی طرح دوپہر کی گرمی میں تمتما رہا ہو گا۔ کیونکہ دوسرے روز منگل کا دن تھا۔ مسعود سے ملنے کا دن تھا۔ دوسرے روز ماسٹر جی سکول میں کچھ اُلجھے اُلجھے سے ادھر ادھر چکر لگاتے رہے ان کے من میں ایک بیکلی اور بے چینی سی تھی ان کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا بچوں کو پڑھاتے ان کی میلی آنکھیں بجھ سی جاتیں اور چہرے کی جھریاں اور زیادہ گہری ہو جاتیں خود فراموشی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے انہوں نے روٹی کھائی مٹی کے کٹورے میں پانی پیا اور چپکے سے اسکول سے باہر نکل آئے۔

سورج پوری طرح گرمی برسا رہا تھا تانگوں میں جتے ہوئے گھوڑے پسینے میں تر بتر تھے اور دھوپ میں ان کی کھال چمک رہی تھی ماسٹر جی سنہری مسجد کی بغلی گلی میں سے نکل کر رنگ محل والے سٹاپ پر آ کر کھڑے ہو گئے یہاں کوئی سامان نہ تھا بس آئی وہ اس میں سوار ہو گئے اور ریگل کے سٹاپ پر اتر گئے یہاں سے وہ پیدل ہی فٹ پاتھ کے درختوں کے سایوں تلے چلتے چڑیا گھر پہنچ گئے۔ ماسٹر جی کو یہ کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا کہ فرخندہ اسے وہاں دیکھ لے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ فرخندہ کو معلوم ہو جائے ماسٹر جی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ لارنس باغ کے دروازے کے بالمقابل فٹ پاتھ والے باغ میں ایک درخت کے

سائے میں بیٹھ گئے۔ وہ درخت کی اوٹ میں اس طرح بیٹھے تھے کہ انہیں تو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ چڑیا گھر کا دروازہ صاف دیکھ رہے تھے۔ ریگل کے چوک والی گھڑی نے بارہ کا آدھا بجایا۔ ماسٹر جی کا کمزور سا دل دھڑک رہا تھا۔ انہیں دو ایک بار خیال بھی آیا کہ وہ واپس چلے جائیں کیونکہ وہ کوئی اچھی بات نہیں کر رہے۔ مگر وہ تو اس خوش قسمت نوجوان کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس سے فرخندہ محبت کر رہی تھی۔

پونے ایک بجے ایک چمکیلا طرح دار تانگہ چھن چھن کرتا مال روڈ پر سے گھوم کر چڑیا گھر کی طرف مڑا پچھلی نشست پر سفید بُش شرٹ اور بادامی رنگ کی پتلون میں ملبوس ایک خوش شکل نوجوان ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔ اور سفید رومال سے بار بار اپنی پیشانی اور گردن کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سگریٹ ہولڈر تھا جس میں پھنسا ہوا سگریٹ سلگ رہا تھا اور کلائی پر کپڑے کی سفید پٹی کے اوپر سنہری زنجیر والی گھڑی بندھی تھی ماسٹر جی پہلی ہی نظر میں سمجھ گئے کہ یہی مسعود ہے تانگہ چڑیا گھر کے دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ نوجوان نے تانگے میں سے اُتر کر کوچوان کو پیسے دیئے اور خود جنگلے کے پاس درختوں کے سائے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس روز گرمی اور حبس بے حد تھا۔ نوجوان بار بار رومال سے گردن، چہرے اور کہنیوں پر آیا ہوا پسینہ صاف کر رہا تھا۔ ماسٹر جی کو یقین ہو گیا کہ یہی مسعود ہے۔ وہ فٹ پاتھ والی کیاری میں بیٹھے درخت کی اوٹ میں سے اس نوجوان کو دیکھتے رہے۔ ان کے دل میں اپنے آپ ہی اس نوجوان کے لئے محبت کا جذبہ ابھر آیا۔ اور ان کا دل چاہا کہ وہ وہاں جا کر اپنے رومال سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھیں۔

اب ایک اور تانگہ چڑیا گھر کے طرف مڑا اس تانگے میں سیاہ برقعہ اوڑھے ایک لڑکی بیٹھی تھی ماسٹر جی کا رنگ زرد ہو گیا اور دل کمسن بچے کی طرح ان کے سینے کے اندر باہر آنے کو تڑپنے لگا۔ یہ فرخندہ تھی غیر شعوری طور پر ان کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ گردن موڑ کر کسی اور طرف دیکھنے لگے پھر انھوں نے چوری چوری دیکھا کہ تانگہ چڑیا گھر کے دروازے پر رک گیا۔ وہ نوجوان لڑکا آگے بڑھ کر تانگے میں پچھلی نشست پر فرخندہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور تانگہ واپس مال روڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ ماسٹر جی درخت کی اوٹ میں سمٹ کر چھپ کر بیٹھ گئے۔ تانگہ گزر گیا۔ اور مال روڈ پر ریگل کے چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب تک تانگہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ فرخندہ

تھوڑا سا نقاب الٹ کر اپنے محبوب سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ ماسٹر جی کتنی ہی دیر وہاں چپ چاپ دم بخود بیٹھے رہے۔ گیلی زمین پر اُگی ہوئی گھاس میں سے گرم گرم بھاپ کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی ان کی میلی سی پرانی قمیض پسینے میں بھر گئی تھی۔ درختوں پر سناٹا طاری تھا۔ چڑیا گھر کی طرف سے ایک بطخ کے بولنے کی بار بار آواز آ رہی تھی۔ ایک کتا کہیں سے بھاگ کر ماسٹر جی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور دم ہلانے لگا۔ ماسٹر جی نے اس کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو وہ ان کے گرد ایک چکر لگا کر باغ کی طرف بھاگ گیا۔ ایک دو منزلہ بس مال پر سے گزر گئی۔ دھوپ میں اس کی چھت تپ رہی تھی چھاؤنی کی طرف ایک فوجی ٹرک گیا جس پر برف کے تودے لدے ہوئے تھے ماسٹر جی اٹھے اور آہستہ آہستہ ریگل والے بس سٹاپ کی طرف چل پڑے اس وقت انہیں اپنا آپ بڑا ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ جی بھر کر روئے ہوں۔

ان پر مذہبی قسم کی پُرسکون افسردگی طاری تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کو ڈولی میں بٹھلا کر آ رہے ہوں۔ اس خیال سے انہیں ایک طرح کی خوشی اور فخر ہو رہا تھا کہ جس لڑکی کو وہ اپنے دل کا ٹکڑا سمجھتے ہیں اس پر کوئی اور شخص بھی فدا ہے اور اسے اپنی محبت بھری باتوں سے سکھ پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ انہیں مسعود سے بھی اتنی ہی محبت ہو گئی جتنی فرخندہ سے تھی۔ ایک پل کے لئے تو ماسٹر جی کو ان دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ ان دونوں کے لئے ایک ایسے خوبصورت کنج محبت کا اہتمام کریں جو پھولوں سے بھرا ہوا ہو اور جس کے در و دیوار پر عطر کی بوتلیں انڈھیلی گئی ہوں۔ پھر وہ ان دونوں کو ہاتھ جوڑ کر کہیں کہ وہ ان کی پیار بھری باتوں میں مخل نہیں ہوں گے۔ لیکن انہیں پردے کے پیچھے گھڑی دو گھڑی کے لئے پڑے رہنے دیا جائے تاکہ وہ اپنے پیاروں کی دو میٹھی باتیں ہی سن لیں۔ ماسٹر جی فٹ پاتھ کے درختوں کے سائے میں گزر رہے تھے انہیں اپنی شخصیت کی بھرپور اہمیت کا احساس ہوا۔ گویا کسی نے انہیں زمین پر سے اٹھا کر اونچی جگہ پر بٹھا دیا ہو اور سر میں کلغی لگا دی ہو۔ انہیں محسوس ہوا کہ زندگی ایک بیکار چیز نہیں ہے۔ یہ قافلہ بے منزل رواں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی ایک منزل ہے۔ ایک مقصد ہے اور اس منزل اس مقصد کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو اس روشنی کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ جو اس دنیا کے تاریک سمندر میں ایک سنہری قطرے کی

حیثیت رکھتی ہے۔ اور جو روز بروز ہر گھڑی ہر پل بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ انھیں اب یہ خیال ستانے لگا کہ وہ دونوں اس کڑکتی دوپہر میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ کاش وہ ان دونوں کو اپنے گھر لے جا سکتے۔

۱۲

مسعود آج کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر آیا تھا۔

وہ فرخندہ کو اپنے ساتھ تانگے میں بٹھلا کر اپنے ایک دوست کے مکان پر لے آیا یہ مکان یونیورسٹی کے آس پاس والی آبادی میں تھا اور یہاں مسعود کا ایک کلاس فیلو بالکل اکیلا رہتا تھا۔ مسعود نے مکان کا تالا کھولا اور فرخندہ کے ساتھ بیٹھک میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں صرف ایک کرسی، ایک تپائی، اور ایک پلنگ بچھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک کیلنڈر ٹنگا تھا جس میں ایک عورت کو نیم عریاں حالت میں بجلی کے پنکھے کے سامنے کھڑی دکھلایا گیا تھا۔ مسعود نے چھت کا پنکھا چلا دیا۔ فرخندہ نے برقعہ اتار دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دونوں بازوں کھول کر پنکھے کی ہوا پسینہ سکھانے لگی۔ کمرے کی فضاء میں خس کے عطر کی ٹھنڈی خوشبو پھیل گئی۔ مسعود نے پہلے ہی سے غسل خانے میں بئیر کی دو بوتلیں چھپا رکھی تھیں۔ یہ بوتلیں غسل خانے کے ایک طاق میں پڑی تھیں۔ جس کے آگے میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ مسعود جھٹ سے اندر آیا۔ بوتل کھول کر آدھی غٹا غٹ چڑھائی۔ جیب سے الائچی نکال کر منہ میں ڈالی اور فرخندہ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ آج اس نے ایک فرانسیسی ناول کے ترجمے کے پورے کے پورے عشقیہ مکالمے یاد کر رکھے تھے وہ صرف بیئر کے سرور کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ ناکام گھر واپس نہیں لوٹے گا۔ فرخندہ کو مسعود کے ان ارادوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اسی جذبے میں سرشار ہو کر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ مسعود کو محض دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے ہی خوشی سے نہال ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن گھر سے وہ بھی یہ سوچ کر نکلی تھی کہ آج مسعود سے شادی کے بارے میں اس کا آخری فیصلہ ضرور لے گی۔ کیونکہ ایک تو بدنامی سے ڈرتی تھی دوسرے اب اس سے اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

مسعود کے دماغ پر بئیر کی آدھی بوتل کے سرور کی ہلکی ہلکی تہہ چڑھنا شروع ہو گئی۔ وہ پیشاب کے بہانے پھر اندر گیا اور باقی نصف بوتل بھی پی آیا نشے نے رنگ دکھایا تو مسعود

کی زبان بھی چلنے لگی۔ جیب سے کاغذ میں لپٹے ہوئے اس نے دو پان نکالے ایک خود کھایا اور ایک فرخندہ کو کھلا دیا۔ ہولڈر میں سگریٹ جما کر وہ پلنگ پر دراز ہو گیا اور ٹانگیں پھیلا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اس نے فرخندہ کی طرف محبت کی گہری نظروں سے مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ کے بڑے فحش اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ فرخندہ کچھ شرما کر کچھ خوش ہو کر اس کے پاس پلنگ پر آبیٹھی۔ مسعود نے اسے اپنے اوپر کھینچ لیا اور اس کے بوسے لینے لگا۔ فرخندہ نے منہ سکوڑ کر کہا۔

"تمہارے منہ سے یہ کیسی بو آرہی ہے؟"

مسعود نے قہقہہ لگایا۔

"بو؟ اری یہ تو پان کی خوشبو ہے"۔

مسعود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شراب کی بو کو صرف وہی پہچان سکتا ہے جو خود شراب پی چکا ہو۔ اس لئے وہ بڑی بے فکری سے فرخندہ کا منہ چومے چلا جا رہا تھا۔ تیسری بار جب اس نے غسل خانے میں جا کر آدھی بوتل چڑھائی تو اس پر نشہ طاری ہو رہا تھا۔ اس نے بش شرٹ اتار کر کرسی پر پھینک دی۔ اور فرخندہ نے دیکھا کہ مسعود کی چھاتی کالے بالوں سے بھری ہوئی تھی۔ مسعود نے سلگتی ہوئی گرم آنکھوں سے فرخندہ کو دیکھا اور اسے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"فرخندہ میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

فرخندہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس کی حالت اس انسان کی مانند تھی جس کی خواہش ہاتھ ہلائے بغیر پوری ہو گئی ہو۔ اس نے مسعود کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟ مگر پچھلی بار تو تم خاموش ہو گئے تھے۔ تم نے ذرا سی بھی حامی نہیں بھری تھی"۔

مسعود نے فرخندہ کے بالوں کے چھلوں میں انگلیاں ڈال کر اس کے سینے کے ابھار کی گہری گھاٹیوں میں جھانکتے ہوئے کہا:

"میں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اب پوری طرح محسوس کر لیا ہے کہ تمہارے بغیر زندگی اکیلے نہیں گزار سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے سوا اور کوئی عورت مجھے زندگی کا سکھ نہیں پہنچا سکتی۔ بس میں تم سے اور صرف تم سے ہی شادی کروں گا"۔

فرخندہ کے سامنے گویا کسی نے اسم اعظم پڑھ دیا تھا اور جادو کے محلوں کے طلسماتی دروازے کھلنا شروع ہو گئے۔ تھے اس کا نکھرا ہوا دھلا دھلایا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔

"میں آج ہی اپنی والدہ سے اس کا ذکر کروں گا۔ اور بہت جلد تمہارے ہاں کوئی نہ

کوئی عورت شادی کا پیغام لے کر آجائے گی۔"

"میں کتنی خوش قسمت ہوں مسعود------- لیکن اگر میرے ماں باپ نے انکار کر دیا تو؟ تو کیا ہوگا؟"

فرخندہ غمگین ہو گئی۔ مسعود کو بئیر کے نشے میں وہ ایسی حالت میں بھی خوبصورت اور دلکش لگی۔ اس نے ہوا میں ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"کوئی پرواہ نہیں"

پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اس نے یہ کیا کہہ دیا فوراً آنکھیں جھپکائیں اور کہنے لگا۔

"فکر نہ کرو فرخندہ! وہ ضرور مان جائیں گے۔ میں ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ گھر میں روپے پیسے کی بھی کمی نہیں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ دو بھائی فوج میں ہیں۔ ایک بہن بہت بڑے تاجر کے ساتھ بیاہی گئی ہے اور وہ کوٹھی میں رہتی ہے۔ ان کے پاس کار بھی ہے۔ تم دیکھ لینا میری شادی پر موٹر کاروں کی پوری لین لگی ہوگی۔ باپ کی جائیداد میں سے بہت بڑا حصہ مجھے بھی ملنے والا ہے۔ شادی کی بعد ہم بھی ایک کار خرید لیں گے بلکہ ہنی مون یورپ میں جا کر منائیں گے۔ ذرا کان میں سنو۔

فرخندہ پر تو مسعود کی باتوں کا نشہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے منہ آگے کیا مسعود نے دیدے مٹکا کر اتنا کہا:

"امی جان نے میری شادی کے لئے پانچ ہزار روپیہ الگ رکھا ہے۔ ہم اس میں سے تین ہزار روپے لے کر یورپ کی سیر کو چلے جائیں گے۔"

اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے اس طرح ہنسنے سے اس کے منہ سے چھالیہ کے دو تین ریزے نکل کر فرخندہ کی گردن کے ساتھ چپکے گئے۔ مسعود نے اچانک انگلی کھڑی کر کے کہا۔

"ایک منٹ میں آیا"

اور غسل خانے میں جا کر بقیہ بئیر بھی چڑھا گیا وہ پہلے بھی نشے میں تھا اب جو بوتل منہ سے لگائی تو کچھ بئیر چھلک کر اس کے بنیائن پر گر پڑی۔ مسعود گردن ٹیڑھی کر کے ہنسنے لگا۔

"چھلک گئی ہو؟ مجھ سے بھی زیادہ بے قرار ہو۔"

پھر آئینے کے آگے منہ کر کے اپنی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی اور پان کھانے سے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے عکس کی طرف

جھک کر بڑی رازداری سے کہا۔

"پیارے! بس آج سب حسرتیں نکل جائیں۔ ذلیل انسان میری طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ چل باہر چل گوری سیج پر بیٹھی تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ لعنت! لعنت............"

خالی بوتل طاق میں پردے کے پیچھے رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا تو ذرا سا لڑکھڑا گیا۔ ایک پل کے لئے کھڑے ہو کر اس نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی اور جب اسے اپنے طور پر یقین آ گیا کہ وہ پوری طرح ہوش میں ہے تو دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

فرخندہ پلنگ پر نیم دراز شادی کے بعد کی زندگی کے خوش آئند خوابوں کے مزے لے رہی تھی۔ اس کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسعود کو مسکرا کر دیکھا۔ مسعود کے لئے گویا یہ ایک طرح کی دعوت تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ غسل خانے جاتے ہوئے فرخندہ کو اپنے خطرناک ارادے سے آگاہ کر گیا ہو اور اب وہ بالکل تیار بیٹھی ہو۔

باہر آتے ہی مسعود نے فرخندہ کو لپٹا لیا اور اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر فرانسیسی ناول کے رٹے ہوئے عشقیہ جملے سنانے لگا۔ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اس کا ضمیر بئیر کے نشے میں منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک گرم اور تازہ جسم والی لڑکی نیم دراز تھی جس کا کنوارا بدن جنسی لذت سے بیگانہ تھا۔ فرخندہ کو مسعود سے زیادہ نشہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ نشہ مسعود کے ساتھ شادی کی خوشی کا تھا۔ اب اسے اپنا مستقبل محفوظ اور مسعود کے ساتھ چوری چھپے کی ملاقاتیں اور محبت کی ہم آغوشیاں حق بجانب معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ مسعود کی جادو اثر باتوں کو سرخوشی اور سرور کے عالم میں سن رہی تھی۔ اور اس کے ہر بوسے اور ہم آغوشی کا جواب زیادہ شدّت سے دیتی مسعود تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا تو اسنے پہلے ہی روز فرخندہ سے شادی کا وعدہ کیوں نہ کر لیا؟ وہ فرخندہ کے حیوانی جذبات کو شریفانہ شہہ دینے کی غرض سے اسے بار بار "میری خوبصورت بیوی" "میری جیون ساتھی" ایسے القاب سے مخاطب کر رہا تھا۔

"میری پیاری بیوی فرخندہ! ہم ایک جان دو جسم ہیں۔ آج ہماری شادی کا دن ہے۔ تم میری بیوی ہو۔ میری دلہن ہو میں تمہارا خاوند ہوں۔ تمہارا دلہا ہوں۔ اب ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں۔ کوئی پردہ نہیں۔ ہم بہت جلد شادی کر لیں گے۔ ہنی مون یورپ میں ہو گا۔ مال کے ہوٹلوں میں دعوتیں ہوں گی۔ کار کی سیریں ہوں گی۔ پیاری دلہن! ذرا

گھونگھٹ تو اٹھاؤ ذرا مسکرا کر تو دیکھو اتنا نہ شرماؤ چلو اب شرم کو چھوڑ بھی۔ میری حسین ترین دلہن فرخندہ! میری ----------"

گویا فرخندہ کے کان ایک مدت سے ان الفاظ کو ترس رہے تھے۔ وہ مسعود کی دست درازیوں کو جائز سمجھ کر گوارا کئے جا رہی تھی۔ بلکہ اب اس سے لطف اندوز بھی ہونے لگی تھی۔ اس کے بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا۔ اور زلفیں ادھر اُدھر پریشان ہو رہی تھیں۔ کبھی بغل گیر ہوتے ہیں اور کبھی چہرے میں بیچ میں آجاتی تھیں۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی خس کے عطر کی ٹھنڈی مہک ختم ہو گئی تھی۔ اب وہاں ایک عورت کے پسینے کی گرم بو تھی جو مرد کے پسینے کی بو میں گھل مل گئی تھی۔ بیئر کا تلخ نشہ تھا۔ دو دہکتے ہوئے انگارہ بنے جسم تھے۔ گرم آہوں میں پگھلتے ہوئے عشقیہ جملے تھے۔ نا تمام الفاظ تھے۔ نہ وہاں فرخندہ تھی نہ مسعود تھا۔ گھنا، گہرا، گرم گیلی گھاس کی بو چھوڑتا جنگل تھا۔ اور ایک وحشی جوڑا تھا اور بس ----- نہ اوپر آسمان تھا نہ نیچے زمین تھی نہ اوپر کوئی خدا تھا نہ نیچے کوئی قانون تھا۔ ایک طاقت تھی جو دوسری طاقت سے برسرپیکار تھی ایک قوت تھی جو دوسری قوت سے دست و گریباں تھی۔ بادل بجلی سے لپٹ رہے تھے۔ بجلی بادل کا سینہ چاک کر رہی تھی جنگل تھا تاریک پر ہول جنگل بارش تھی، مسلسل اور ہیبت ناک بارش دلدل، کھولتے لاوے کا سمندر دھرتی کے سینے میں گڑھے عظیم الجثہ جانوروں کی دہشت انگیز چیخیں تڑختی چٹانیں، گہری گھاٹیوں میں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے پہاڑ دنیا تباہ ہو رہی تھی۔ دنیا تخلیق ہو رہی تھی۔ بادلوں کو برسنا، پرندوں کو چہچہانا، درختوں کو ہوا میں لہرانا اور پھولوں کو دھوپ میں مسکرانا سکھایا جا رہا تھا کچھ بن رہا تھا کچھ بگڑ رہا تھا۔ کچھ ہو رہا تھا کچھ ہو چکا تھا۔ فرخندہ نے لیٹے لیٹے کانپ کر ایک ہلکی سے لذت انگیز آہ بھری اور مسعود کا ہاتھ بے دلی سے پکڑ کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہاں اندھیرا چھا گیا۔ اندھا اور ہزار آنکھوں والا اندھیرا۔ ایسا اندھیرا جس کا سایہ سورج سے زیادہ روشن تھا اور خوشبو سے زیادہ خوشبودار تھا۔

گھر آکر فرخندہ نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو حیران رہ گئی یہ ایک بالکل مختلف عورت کا چہرہ تھا۔ اس عورت کا رنگ نکھر کر گلابی ہو رہا تھا۔ اور گہری تیز نگاہوں سے فرخندہ کو دیکھ رہی تھی فرخندہ ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکی اس نے آنکھیں جھکا لیں اور آئینے سے پرے ہٹ گئی جب تک وہ مسعود کے ساتھ رہی تھی اس اپنے جرم کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑی تساہل آمیز خوش وقتی سے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اور اس سے بار بار لپٹ جاتی تھی۔ ہر شریف عورت کی طرح وہ مسعود کے ساتھ ہم بستری کرنے کے بعد اسے اپنا خاوند سمجھنے لگی تھی۔ اور اپنی ساری زندگی اس کی خدمت میں بسر کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ اب وہ اس سے بڑی حیا کرنے لگی تھی۔ اس حیا میں بڑی تسکین اور باہمی مفاہمت تھی۔ اس نے مسعود کا سر بھی دبایا تھا اور ایک بار اس کے ہونٹوں سے باہر بہا ہوا پان کا پیک اپنے دوپٹے سے پونچھ دیا تھا۔ لیکن جونہی وہ مسعود سے الگ ہو کر اکیلی تانگے میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اس کی روح پر بے چینی کا ہلکا بادل چھا گیا۔ اسے اپنا آپ ہر راہ چلتی برقعہ پوش عورت سے گھٹیا اور پست لگنے لگا۔ بیتے ہوئے لذت انگیز لمحوں کی تہہ میں بیٹھا ہوا کیچڑ اس کے منہ کے پاس آکر تیرنے لگا۔

تانگے میں بیٹھے بیٹھے برقعے کے اندر اس نے دو تین بار کراہت کے عالم میں اپنے ہونٹ سکوڑ لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے چند گھنٹے پہلے کی فرخندہ اور اب کی فرخندہ میں ہزاروں میل کا فاصلہ نظر آنے لگا۔ وہ پہلے والی فرخندہ کی یاد میں تڑپنے لگی۔ اس نے پیٹ کے ساتھ لگے ہاتھ کی مٹھی بھینچ لی اور پھر گہرا سانس لے کر ہتھیلی کھول دی۔ اسے اپنے آپ پر ایک ایسی بلبل کا گمان ہوا جو زخمی ہو کر گندے نالے میں گر پڑی ہو اور جس کے اب دوبارہ آسمان کی پاکیزہ فضاؤں میں پرواز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے اپنی ساری نمازیں، روزے اور پرہیز گاری کی باتیں یاد آنے لگیں اور وہ بار بار خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ان ہوش ربا رومانی منظروں نے بھی سر نکالا جو اس نے رومانی ناولوں میں پڑھے تھے اور جن کے اس نے اکثر خواب دیکھے تھے۔ دن کو نماز پڑھتی تھی مگر رات کو خواب دیکھتی کہ اپنے کسی نامعلوم عاشق کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے باغ کی سیر کر رہی ہے اسے وہ سارے خواب یاد آگئے۔ پھر اس نے ذہنی طور پر ایک بار پھر اس لذت کا بھرپور تجربہ کیا جو اسے مسعود کی صحبت میں ملی تھی۔ اس کا جسم ایک دفعہ پھر گرم ہو کر گردن کٹی مرغی کی طرح پھڑپھڑانے لگا اس نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور خدا کے حضور جھک کر اپنی بخشش کی دعا مانگنے لگی۔

گھر پہنچ کر جب وہ ایک زیادہ وضع دار ماحول میں آئی تو اس کے احساس جرم میں اضافہ ہو گیا۔ اسے تو خود پر اس قاتل کا گمان ہونے لگا جو مقتول لاش کو کفنیوں میں چھپا کر آ رہا ہو۔ دن کے چار بج رہے تھے۔ اگرچہ سورج کی کرنیں کچھ ترچھی ہو گئی تھیں۔ لیکن گرمی اور حبس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی تھی۔ مصری شاہ کے بازار میں دکاندار دکانوں کے آگے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ بچے

کمیٹی کے نلکوں پر بیٹھے نہا رہے تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اسے اپنی بہن بلقیس ملی۔ اس نے اپنی بچی کو نالی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم نے بڑی دیر لگا دی فرخی ------ امی ناراض ہو رہی ہیں"۔

فرخندہ ڈر سے کانپ گئی حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ آج تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زناکاری کا شہر بھر میں ڈھنڈورا پٹ گیا ہے۔ اس نے برقعے کا اوپر والا حصہ اتار کر ہونٹوں پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور بظاہر بے نیازی سے بولی۔

"انارکلی میں اکثر دکانیں بند تھیں۔ گلابی رنگ کی لیس تو ملی ہی نہیں باجی" فرخندہ کی امی نے اسے دیر سے آنے پر تھوڑا سا جھڑکا اور پھر خاموش ہو گئیں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کی اکثر ماؤں کا دستور ہے۔ ان کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ فرخندہ ان کی عزت اور اپنا کنوارپن ایک پڑھے لکھے اوباش نوجوان کے ہاتھوں لٹوا آئی ہے۔ اگر انہیں علم بھی ہو جاتا تو وہ سوائے رونے پیٹنے اور فرخندہ کو گھر میں بند کر دینے یا اس کی جلد از جلد شادی کر دینے کے اور کیا کر سکتی تھیں؟ تیر کمان سے نکل کر نشانے پر لگ چکا تھا۔ پھل ٹہنی سے ٹوٹ کر زمین پر لگ چکا تھا۔ لوٹا ہوا مال، کھوئی ہوئی عزت واپس مل سکتی تھی لیکن کنواری لڑکی کی لٹی ہوئی عصمت کم از کم اسے اس جنم میں اس زندگی میں کبھی واپس نہیں مل سکتی۔ فرخندہ نے چارپائیاں آنگن میں بیری کی چھاؤں میں نکالیں۔ جھاڑو دے کر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ اسلم کے میلے رومال اور باپ کی میلی صدری کو دھو کر دھوپ میں ڈالا اور رسوئی میں جا کر حلوہ کدو چھیل کر کاٹنے لگی۔ وہ اپنی روح کے بوجھ کو ان چھوٹی چھوٹی خدمتوں سے ہلکا کرنا چاہتی تھی مگر ہر خدمت کے ساتھ اس بوجھ پر مزید بوجھ کی ایک اور تہہ چڑھ گئی تھی۔ جیسے جیسے وہ اچھی اچھی پاکیزہ باتیں سوچتی ویسے ویسے اسے اپنی برائی زیادہ مہیب اور گھناؤنی نظر آنے لگتی۔ وہ کسی سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی۔ اسے اپنی شخصیت بے اثر اور کمزور محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی اس جوہر تابدار سے محروم ہو گئی تھی جو اس کے خیال میں عورت کا طرۂ امتیاز تھا اور جس کی موجودگی ہی عورت کو عورت کا حقیقی مقام عطا کرتی ہے۔ انجم گلے کا ایک نمونہ لینے کے لئے ذرا کی ذرا آئی تو فرخندہ نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہ کی اسے اس خیال سے بڑی کوفت ہونے لگی تھی کہ انجم جسے وہ ہمیشہ ڈرپوک، بزدل اور ہلکی سطح کی لڑکی سمجھتی تھی آج اس کے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب اور بھرپور عورت تھی۔

ماسٹر جی پڑھانے آئے تو فرخندہ نے ان سے بھی زیادہ گفتگو نہ کی بس چپ چاپ

بیٹھی نظریں نیچی کئے سبق لیتی رہی۔ ماسٹر جی کو بڑی حیرت ہوئی ان کے خیال میں تو فرخندہ کو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ اپنے محبوب سے مل کر آئی تھی۔ وہ خود فرخندہ سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کہیں فرخندہ شرمندہ نہ ہو جائے۔ ان کے دل میں محبت کا وہی پرانا بے غرض اور معصوم جذبہ جاگ اٹھا تھا اور وہ فرخندہ کو اپنے محبوب، اپنے خاوند، اپنے کسی بھی پیارے کے ساتھ مسرور دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اگر اندیشہ تھا تو صرف اتنا کہ کہیں فرخندہ کسی کے دھوکے میں نہ آ جائے فرخندہ کے چہرے پر خلافِ توقع انہوں نے گہری خاموشی اور افسردگی دیکھی تو ان کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ کہیں اس نوجوان نے فرخندہ کو دھوکا تو نہیں دیا؟ کہیں اس نے فرخندہ کو مارا تو نہیں؟ پھر وہ اداس کیوں ہے؟ ماسٹر جی نے سوچا اگر مسعود نے فرخندہ کو دکھ پہنچایا ہے تو وہ اس کی گردن مروڑ دیں گے۔ ان کے کمزور ہاتھوں میں اتنی قوت ہمیشہ رہے گی کہ وہ فرخندہ کو ایذا پہنچانے والے کا گلا گھونٹ ڈالیں ان کا دل پریشان ہو گیا۔ کاش وہ فرخندہ سے اس کے دکھ کا حال دریافت کر سکتے۔ کاش فرخندہ انہیں اپنا ہمراز بنا لیتی۔ پھر وہ کتنی خوشی سے اس کی ہر خدمت بجا لاتے۔ کاش ایسے ہو سکتا۔ وہ تو فرخندہ کی خوشی کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتے تھے۔ ان کا جی اداس ہو گیا۔ کیونکہ ان کے پوچھنے پر فرخندہ سر درد کا کہہ کر ٹال گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ فرخندہ جھوٹ بول رہی ہے۔ در اصل اس کے دل کو کوئی گہرا صدمہ ہوا ہے۔ ہر وقت آزاد پرندے کی طرح چہچہانے والی لڑکی اچانک اس طرح ملول نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ کرید کر نہیں پوچھ سکتے تھے۔ وہ فرخندہ کے دل کی دہلیز پر بیٹھ کر اسے سجدہ کر سکتے تھے مگر اس کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتے تھے۔ وہ فرخندہ سے یہ تو پوچھ سکتے تھے کہ وہ اداس کیوں ہے لیکن یہ نہیں پوچھ سکتے تھے کہ کہیں مسعود نے اسے رنج تو نہیں دیا؟ ماسٹر جی کے پتلے دبلے چہرے پر دل شکستگی کی لطیف سی غمگینی طاری ہو گئی۔ انہوں نے بے دلی سے جانے پی پڑھائی ختم کر کے چپکے سے اٹھے اور فرخندہ کی امی کو سلام کر کے چلے گئے۔ گلی میں انہیں فرخندہ کے دونوں بھائی اکبر اور اسلم ملے۔ وہ سائیکل پر ایک ٹوکرا رکھے آ رہے تھے جس میں تربوز اور خربوزے تھے۔ اسلم نے ماسٹر جی کو سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔

"ماسٹر جی آپ خربوزے نہیں چکھیں گے کیا؟ منٹگمری کے ہیں بڑے میٹھے ہیں"۔

اکبر نے بھی انہیں دعوت دی۔ وہ مسکرا کر حسبِ عادت کچھ شرمائے اور شکریہ ادا کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج وہ بہت اداس تھے کل کی نسبت آج کی اداسی میں زمین و

آسمان کا فرق تھا۔ کل جب وہ فرخندہ کا مسعود کے نام لکھا ہوا خط پڑھ کر گھر سے نکلے تھے تو انہیں غیر شعوری طور پر اپنے آپ پر اس بد نصیب تباہ حال ادھیڑ عمر کے عاشق کا گمان ہو رہا تھا جس کی محبت اس کے سامنے لوٹی جا رہی ہو۔ اور وہ کچھ نہ کر سکتا ہو۔ لیکن آج وہ اس باپ کے روپ میں تھے جن کی بیٹی شادی کے دوسرے ہی روز گھر میں آ کر بیٹھ گئی ہو۔ پہلے والے غم میں اضطراب، پریشانی اور اذیت تھی۔ آج کے غم میں عاجزی، بے نوائی، ستم کشی، دل شکستگی اور دردمندی تھی۔ کل کا غم سمٹ کر ماسٹر جی کے سینے میں قیدی پرندہ بن کر آن بیٹھا تھا جس نے اپنے نوکیلے پنجوں سے انکا دل لہولہان کر دیا تھا۔ لیکن آج کا غم ایک درد بھری صدا بن کر ساری کائنات میں پھیل گیا تھا۔ کل انہیں ہر شئے اپنی تحقیر اور تذلیل کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر آج انہیں ماسوائے اپنے دنیا کی ہر چیز اپنے غم کی ہم نوا اور ہم زبان معلوم ہو رہی تھی۔ تاہم دکھ چاہے دل کا ہو چاہے ذہن کا وہ ہر حالت میں دکھ ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارے ماسٹر جی آج بھی بڑے دکھی تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرخندہ کے لئے کیا کریں۔

جیسا کہ رات کو بیمار کی تکلیف بڑھ جاتی ہے فرخندہ کے لئے رات گذارنا مشکل ہو گئی۔ اسے طرح طرح کے پریشان کن خیالات اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ انسانی نفسیات میں بعض جذبے صرف رات کو بیدار ہوتے ہیں دن کی روشنی میں وہ منہ چھپائے کہیں نہ کہیں پڑے رہتے ہیں۔ جونہی رات کا اندھیرا ہوتا ہے یہ چمگادڑوں کی طرح کونوں کھدروں سے چیختے چلاتے نکل آتے ہیں۔ دن بھر تو فرخندہ کسی نہ کسی طرح اس قسم کے خیالات سے بچتی پھرتی رہی لیکن رات ہوئی تو سوائے ان تکلیف دہ خیالات کے اس کے ذہن میں اور آنا ہی کچھ نہیں تھا۔ اسے اپنی بے عصمتی کا احساس کھائے جا رہا تھا۔ وہ تو ایسا جوہر کھو بیٹھی تھی جسے دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس نہیں دلا سکتی تھی۔ اب ایک اور خوف بیدار ہوا۔ جس نے فرخندہ کے جسم کو ٹھنڈا کر دیا۔ یہ خوف شادی سے پہلے ہی ماں بن جانے کا تھا۔ وہ اس جانکاہ تصور ہی سے کانپ گئی۔ وہ چھت پر لیٹی تھی۔ اس کی چارپائی کے پاس ہی اس کی بڑی بہن بلقیس اپنی بچی کو ساتھ لئے سو رہی تھی۔ پھر اسلم سو رہا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ اس کی امی مچھروں سے بچنے کے لئے باریک سی چادر اوڑھے سو رہی تھیں۔ رسوئی کے اوپر والے کوٹھے پر سے اکبر کے خراٹے لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اکبر کا بچہ رویا تو فرخندہ کو ایک دم پسینہ آ گیا۔ بھابی عذرا نیند میں ہی اسے چپ کرانے اور اس کے منہ میں

چوسنی دینے لگی۔ بلو چپ ہو گیا مگر فرخندہ کو ایک اور بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جس کے پیدا ہو جانے کا پورا پورا امکان موجود تھا۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسے اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کی عزت کا خیال آنے لگا۔ اسلم کو لڑکے کالج میں طعنے دیں گے محلے والیاں امی کے پاس آ آ کر باتیں بنائیں گیں۔ لوگ چہ میگوئیاں کریں گے اور شیخ فقیر دین کی برسوں کی وضعداری اور عزت پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ بھابی اپنے میکے جا کر پوار قصہ خوب نمک مرچ لگا کر سنائے گی۔ اس کے بھائی کا سر جھک جائے گا۔ بوڑھے باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ وہ تو ضرور ہی خودکشی کر لیں گے۔ ہائے اس گھر میں کبھی ایسا نہیں ہوا! یا اللہ معاف کر دے معاف کر دے۔ اب یہ غلطی کبھی نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں ہو گی۔

فرخندہ نے آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے۔ گرم آسمان پر بے شمار ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پر نم تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس مذہبی سہارے سے اس کے دل کو کچھ تسکین ہوئی۔ پھر اسے یاد آیا۔ مسعود نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے فرخندہ کا منہ چوم کر کہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں جانِ من-------- میں نے بڑی احتیاط برتی ہے۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہو گی"

اس وقت فرخندہ کو یقین آ گیا تھا اور اطمینان سے تھوڑا سا مسکرا کر شرما دی تھی۔ مگر اب اسے وہ سب کچھ جھوٹ اور جی کا بھلاوا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کو دریا میں دھکا دیا جائے اور اس کے کپڑے گیلے نہ ہوں۔ پھول ٹہنی سے ٹوٹے اور نیچے نہ گرے۔ اسے اپنی کئی سہیلیاں یاد تھیں جنھوں نے اسے کہا تھا کہ انہیں تو شادی کی پہلی ہی رات حمل ٹھہر گیا تھا۔ اب تو اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ اسے خدا معاف کر دے نہیں تو ہونے والی بات ہو کر ہی رہے گی۔ زمین کی تہہ میں چھپا ہوا بیج ہر گھڑی، ہر پل اندر ہی اندر پرورش پاتا رہے گا اور ایک دن اچانک دھرتی کا سینہ چاک کر کے باہر پھوٹ نکلے گا۔ فرخندہ کو یوں لگا گویا اس نے ایک ایسا مہلک زہر نگل لیا ہو جو ایک خاص مدت گذرنے کے بعد اسے ہلاک کر دے گا۔ ساری رات وہ بے چین اور مضطرب رہی اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر، رو رو کر خدا سے معافیاں مانگتی رہی۔ پھر اسے نیند آ گئی۔

صبح سو کر اٹھی تو اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ رات کی بے چینیاں اور اذیتیں

کہیں بہت دور جا چکی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ خدا نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور آنکھیں بند کئے دیر تک خدا کے حضور میں سجدہ ریزی رہی اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتی رہی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مسعود سے سیدھے سبھاؤ اب شادی کرے گی۔ اس کی اور کوئی بات نہیں مانے گی۔ اسی روز اس نے مسعود کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں سارا زور اس بات پر دیا کہ وہ جس طرح ہو سکے جتنی جلدی ہو سکے شادی کا پیام بھجوائے۔ اس کا جواب دینے کے لئے فرخندہ نے منع کر دیا کیونکہ انجم اتنی گھبرا رہی تھی کہ اس کے ہاتھوں راز کے فاش ہو جانے کا خطرہ تھا۔ فرخندہ نے لکھ دیا کہ وہ فلاں روز اس سے خود مل کر جواب وصول کرے گی۔

اس روز وہ مسعود کے پاس اپنے خط کا جواب وصول کرنے گئی تو ایک بار پھر مغلوب ہو گئی۔ پہلے تو وہ مسعود کے پاس بیٹھی اس سے گلے شکوے کرتی رہی کہ تم نے میرے ساتھ زیادتی کر دی ہے۔ مجھ سے میرا وہ موتی چھین لیا ہے جو میری عزت اور عصمت کا جوہر تھا۔ پھر کہنے لگی اگر تم نے جلد شادی نہ کی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے مسعود ٹانگ پر ٹانگ رکھے، منہ میں سگریٹ دبائے بڑے اطمینان سے اس کا باتیں سنتا رہا اور اس وقت کے تصور کے مزے لیتا رہا جب تھوڑی ہی دیر بعد وہ بالکل عریاں حالت میں اس کی آغوش میں دبکی لمبے لمبے سانس لے رہی ہو گی۔ وہ اپنے آپ کو اس فاتح کی جگہ محسوس کر رہا تھا جس نے قلعے پر فتح کے بعد اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہو اور اب کامرانی کے نشے میں سرشار قلعے کی فصیل کی سیر کر رہا ہو۔ اُس نے سوچا۔ میں اس سے شادی کروں گا؟ ہونہہ! یہ بات تو کبھی ہو سکتی ہی نہیں۔ میں ایسا احمق نہیں کہ جس سے محبت کروں اسی سے شادی بھی کر لوں۔ اور پھر شادی تو اپنے پاؤں میں زنجیر ڈال کر ایک جگہ بندھ جانے کا نام ہے۔ توبہ! مجھے تو یہ قید کبھی گوارا نہیں ہو گی۔

مگر اپنی گفتگو میں مسعود نے بڑے پر زور الفاظ میں فرخندہ کو یقین دلایا کہ وہ سوائے اس کے اور کسی سے شادی نہیں کرے گا اور پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کا منہ چوم لیا۔ فرخندہ پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا ماتھا گرم ہو گیا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ پہلے وہ ذہنی طور پر تو زنا کاری کی طرف مائل ہو جاتی تھی مگر جسم کو مسعود سے دور رکھتی تھی۔ اس روز کے بعد اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ اس کا ذہن مکروہ فعل کی مذمت کرتا تھا اور جسم زیادہ سے زیادہ ترغیب دینے لگا تھا۔ فرخندہ کے جسم نے بدن کی لذت کے ایک ایک

پور لمحے کا ادراک کیا اور لرزنے لگا۔ وہ پرے ہٹ گئی مسعود وحشی سا بن گیا اور اس کے سارے بدن پر بوسے دینے لگا۔ فرخندہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے اپنی ساری قسمیں اور خدا کے سامنے کئے گئے وعدے اور سجدے اور دعائیں تیز آندھی میں اڑتے پتوں کی طرح نظروں سے دور ہوتے دکھائی دیئے۔ وہ نیم جاں سی ہو کر مسعود کے پہلو میں گر پڑی اور اس نے اپنا آپ ایک بار پھر اپنے محبوب کے حوالے کر دیا۔

گھر آ کر وہ پھر پچھتانے لگی کہ یہ اس نے کیا کر لیا۔ اس نے پھر وہی غلطی دہرا ڈالی جس سے بچتے رہنے کی اس نے قسم کھائی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں مشرق میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک لڑکی جب ایک بار اپنی مرضی سے خراب ہو جاتی ہے تو پھر اس کا شادی سے پہلے پہلے سنبھل جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہم لوگ کنواری لڑکی کی عصمت کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں. قدرتی طور پر جب عصمت باقی نہیں رہتی تو اس کی اہمیت جاتی رہتی ہے اور وہ لڑکی بے عصمتی کے بحران میں اس وقت تک مبتلا رہتی ہے جب تک کہ ہمارا سماج اسے شادی شدہ عورت کا درجہ نہیں عطا کر دیتا. فرخندہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ دوسروں کی نظروں میں بے عزت ہونے سے پہلے وہ اپنی نظروں سے خود ہی گر گئی تھی۔ شروع میں اس نے مذہب کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن اب اسے خدا کا نام لیتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔ وہ سجدے میں گرتی تو اس کا ضمیر اسے معمول سے زیادہ لعن طعن کرتا۔ وہ نماز پڑھنے بیٹھتی تو اس کے دماغ کا آوارہ پہلو اسے فحش مناظر دکھاتا اور بڑی بڑی خوفناک جنسی ترغیبات دیتا۔ اس خیال سے کہ اس کی بد اعمالی کی وجہ سے نماز کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ فرخندہ نے نماز پڑھنا چھوڑ دی۔

اب اس کے لئے بد فعلی اور پاکبازی، بے عصمتی اور عفت انگیزی میں فرق قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ وہ اسی طرح سوچنے لگی جس طرح وہ عمل کرتی تھی۔ ایک ہی غلطی کا بار بار دہرانا اسے اتنا زیادہ نقصان دہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جب پچھتاوا اسے ایک ہی غلطی کا تھا تو پھر اس غلطی کے بار بار کرنے میں کیا حرج تھا؟ اور پھر جبکہ ہر غلطی میں ملال ایک سا تھا لیکن مزہ ہمیشہ نیا ملتا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرخندہ روز روز مسعود سے ملنے لگی۔ اور جس روز وہ اس سے ملنے جاتی تو خوب بنتی سنورتی۔ نئے نئے کپڑے پہنتی۔ اپنے سارے بدن کو خوشبودار صابن سے غسل دیتی۔ بازوؤں اور بغلوں میں اس خیال سے عطر کی شیشی انڈھیل ڈالتی کہ کہیں مسعود کو پسینے کی بو نہ آ جائے۔ مسعود کے سامنے بیٹھ کر وہ ترچھی نظروں سے

اسے دیکھا کرتی اور اس وقت کی منتظر رہتی جب وہ اسے اپنی آغوش میں دبوچ لے گا اور اسے اپنے ساتھ لپٹا کر بوسوں کی بارش کر دے گا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے مسعود کے منہ سے سگریٹ لے کر اپنے منہ سے لگا لیتی اور یونہی دھواں اڑانے لگتی۔ پھر اسے کھانسی آجاتی اور وہ جلدی سے سگریٹ مسعود کو دے دیتی۔ جنسی لذت سے محرومی کے ایک طویل دور کے بعد اس کا شدید ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ پہلے پہل اس کا رنگ نکھر گیا اور چہرے پر پورے کھلے ہوئے گلاب ایسی تازگی اور ترو تازگی آگئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی جلد پر ہلکی ہلکی چھائیاں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے۔ وہ کچھ دبلی اور بدمزاج ہو گئی۔ فرخندہ کی والدہ نے اس تبدیلی کو عورتوں کی بیماری سمجھ کر بلقیس کے ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ فرخندہ دوائی پینے کی بجائے اسے پیالی میں انڈھیل کر گلی میں پھینک دیتی۔ ماسٹرجی کو فرخندہ کی روز روز بگڑتی صحت کو دیکھ کر بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کئی بار فرخندہ کی مزاج پرسی کی اور پوچھا کہ وہ کیوں اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی؟ مگر فرخندہ ہر بار ٹال دیتی اور کتابوں کی باتیں کرنے لگتی۔ ویسے بھی وہ اب ماسٹرجی سے ہنس کر پہلے کی طرح باتیں نہیں کرتی تھی۔ اسے تو ہر اس انسان سے چڑ ہو گئی تھی جو اس کے نزدیک نیک اور پاک دامن تھا۔ اپنی ایک ہی سہیلی انجم سے اس نے ملنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کبھی اس کے ہاں آجائے تو آجائے۔ فرخندہ اس سے ملنے کبھی ان کے ہاں نہیں گئی تھی۔ ماسٹرجی بڑے اداس اداس رہتے۔ کبھی سوچتے شاید مسعود اسے دکھ دے رہا ہے۔ شاید وہ اسے بھلا بیٹھا۔ ایک بار تو وہ مسعود اور فرخندہ کے تعلقات کا پوچھتے پوچھتے رہ گئے۔ نہیں۔ نہیں یہ ان کا منصب نہیں۔ کیا خبر فرخندہ برا مان جائے اور پھر کبھی ان سے بات ہی نہ کرے۔ وہ اپنے غم کو دل ہی دل میں چھپائے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے تکلیفیں زندگی میں بڑی اٹھائی تھیں لیکن غم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ زندگی کے ہر نشیب میں خوش اور اپنی حالت پر مطمئن رہے تھے۔ مگر اب تو انہیں اندر ہی اندر ایک غم لگ گیا تھا۔ اس بات کا کہ فرخندہ خوش نہیں۔ فرخندہ اداس ہے۔ ان کا اپنا چہرہ بھی کمزور پڑ گیا۔ سر ہر وقت کسی گہری فکر میں رہنے لگا اور وہ پہلے سے بھی بوڑھے دکھائی دینے لگے۔

ادھر مسعود بے فکر اور بے غم ہو کر عیاشی اور شہوت پرستی کے گھوڑے پر سوار اڑا چلا جا رہا تھا۔ یہ بات کبھی اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ لڑکی جو اس سفر میں اس کے شانہ بشانہ رواں ہے ایک ناقابل بیان ذہنی خلفشار اور روحانی اذیت میں مبتلا ہے۔ اور پھر آج کل کے عیاش طبع عشرت پسند پڑھے لکھے نوجوانوں کو اتنی فرصت بھی نہیں کہ وہ اس قسم کے جھمیلوں میں پڑتے پھریں۔ کچھ وہ طبعاً" ایسے ہیں اور کچھ ان عورتوں نے انہیں ایسا بے حس بنا دیا

ہے جو پیشہ ور ہوتی ہیں اور بدمعاشی کے بعد اس طرح کے ذہنی تضاد کا شکار ہوتی ہی نہیں۔ ان پیشہ ور عورتوں کی بوئی ہوئی فصل فرخندہ ایسی لڑکیوں کاٹنی پڑتی ہے۔ فرخندہ ایسی لڑکیوں میں جنسی بھوک کا ادراک تو ان آوارہ مزاج عورتوں سے بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ مگر اس بوجھ کو اٹھانے کا حوصلہ ان عورتوں سے آدھا بھی نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلی قسم کی عورتیں زیادہ سے زیادہ خراب ہو کر بھی نسبتاً زیادہ صحت مند اور جوان رہتی ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی عورتیں صرف ایک بار کی ٹھوکر سے عمر بھر کے لئے اپنی ذہنی اور جسمانی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ مسعود فرخندہ کو آوارہ عورت تو بالکل نہیں سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس کا سلوک آوارہ عورتوں سے کم نہیں تھا۔ مرد کی یہ عجیب فطرت ہے کہ جب وہ کسی عورت کو پہلی بار خراب کر لیتا ہے تو پھر وہ اسے مزید خراب کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے اور مزید بر آں دل میں اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ وہ یہ باور کر لیتا ہے کہ جو عورت اس کے ساتھ بہک سکتی ہے وہ کسی دوسرے مرد سے بھی اپنی عزت نہیں بچا سکتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایسے جوڑوں کی شادیاں ہمارے معاشرے میں عام طور پر ناکام رہتی ہیں۔ ہمارے نزدیک تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ لڑکی جہاں تک ممکن ہو سکے شادی سے پہلے اپنی عصمت کو محفوظ رکھے اور محبت ہمیشہ شادی کے بعد کرے اور وہ بھی اپنے خاوند اور اپنے بچوں سے صرف اسی صورت میں ہماری لڑکیاں انسانی نسل کو ایسے بچے دے سکتی ہیں جو بعد میں اس دنیا کے لئے فخر اور مسرت کا باعث ہوں۔

مسعود کو تو ایک بڑا مزیدار شغل ہاتھ آگیا تھا۔ اسے مفت میں ہی ایک ایسی صحت مند جوان اور گداز جسم والی لڑکی کی صحبت مل رہی تھی جو اس کی محبت میں پاگل ہو کر اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی۔ سامنے آتے ہی وہ اس سے لپٹ جاتی اور اپنا پھول ایسا نازک اور خوشبودار بدن اس کی آغوش میں گرا دیتی۔ فرخندہ کو اب سوائے مسعود کی آغوش کے اور کہیں تسکین ہی نہیں ملتی تھی۔ اس نے اپنی گناہگاری کے احساس کا منہ یوں بند کر دیا تھا کہ مسعود کو اپنا خاوند سمجھنے لگی تھی اور اس کی بیوی بن کر اپنے بے حیائی کی زندگی کا جواز پیدا کر رہی تھی۔ مسعود کو صرف اتنی سی قیمت ادا کرنی پڑتی کہ وہ فرخندہ سے جلد شادی کر لینے کے وعدے کا پھر سے بھرپور لہجے میں اعادہ کرتا اور اسے یقین دلا دیتا کہ سوائے فرخندہ کے وہ نہ تو کسی عورت سے محبت کرتا ہے اور نہ کسی عورت سے شادی ہی کرے گا مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ مسعود ایسے کردار اور مزاج کا نوجوان نہ تو کسی عورت سے محبت کر سکتا تھا

اور نہ شادی۔ وہ تو محبت اور شادی کے پل کے نیچے خوش فکری اور آوارہ مزاجی کی جھیل کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ فرخندہ کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو ریل گاڑی میں سوار ہر سٹیشن پر کچھ نہ کچھ خرچ کئے چلا جاتا ہے اور مسعود اس ریلوے انجن سے مشابہہ تھا جو ہر سٹیشن پر کھڑے ہو کر کوئلے اور پانی کا ذخیرہ لیتا ہے اور تازہ دم ہو کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ دونوں کا سفر ایک لیکن منزلیں جدا جدا تھیں۔ ایک ہر قدم پر کچھ نہ کچھ کھو رہا تھا۔ اور خاک اڑاتے ویرانوں کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرا ہر قدم پر کچھ نہ کچھ حاصل کر رہا تھا۔ لیکن قدم دونوں کے ایک ساتھ اٹھ رہے تھے۔ شانے دونوں کے ملے ہوئے تھے۔

فرخندہ اب بالوں میں پھول لگا کر ملنے جاتی۔ مسعود گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کرتا۔ دونوں تانگے میں بیٹھ کر ہوٹلوں میں سیریں کرتے پھرتے۔ پہلے فرخندہ گھبرایا کرتی تھی کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ لیکن اب وہ بڑی بے پروائی سے تانگے میں بیٹھی ہوتی اور کبھی کبھی نقاب الٹ کر مسعود سے ہنس بھی لیتی اور اس کا ہاتھ بھی تھام لیا کرتی۔ بہت بڑی برائی میں گر کر انسان چھوٹی چھوٹی برائی کو پھر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ جس طرح اولوں سے بچ کر بیٹھا ہوا آدمی بارش میں بڑی آسانی سے چلنے لگتا ہے۔ لیکن مسعود کہیں ایک جگہ ٹک کر بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی طبیعت ہمیشہ نت نئے جزیروں کی تلاش کے لئے بے چین رہتی تھی۔ اس کا جی اب فرخندہ سے کچھ بھر گیا تھا۔ اس کی ہم آغوشی میں وہ پہلے ایسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ وہ فرخندہ کے جسم سے پوری طرح واقف ہو گیا تھا۔ اس پر یہ سارا بھید کھل گیا تھا کہ جب فرخندہ ایک پہلو لیٹتی ہے تو کیسی لگتی ہے۔ دوسرے پہلو لیٹتی ہے تو کیسی ہوتی ہے۔ کپڑے پہن رہی ہوتی ہے تو کیسی دکھائی دیتی ہے وہ تو اب آنکھیں بند کر کے بتا سکتا تھا کہ اگر فرخندہ آنکھوں پر بانہہ رکھ کر لیٹی ہے تو اس کا سینہ بازو سے کس زاویئے سے مس ہو رہا ہوگا۔ اور پیٹ پر بل کس جگہ پڑ رہا ہوگا یہ بات عورت کی دلکشی کی موت تھی۔ مسعود کو فرخندہ کے وہ بوسے اب پھیکے اور بے مزہ لگتے جن کے لئے کبھی وہ بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ وہ اس سے ملتا تو شروع ہی سے جنسی لذت کے ایک خاص لمحے کا انتظار شروع کر دیتا اس کے بعد تو مسعود کے لئے فرخندہ کا وجود ناقابل برداشت ہو جاتا۔ وہ چاہتا کہ جتنی جلدی ہو سکے فرخندہ سے پیچھا چھڑائے اور یونیورسٹی کی طرف جا کر نئی نئی لڑکیوں کے چہرے دیکھ کر ان سے جی بہلائے وہ اب فرخندہ سے کنی کترانے لگا تھا۔ اس کے کئی بار خط لکھنے اور بلانے پر صرف ایک بار ملتا۔ شادی کی بات ہوتی تو وہ کہتا۔

"والدہ کراچی سے آ جائیں تو فوراً پیغام بھجوا دوں۔ میں تو خود یہی چاہتا ہوں۔ مگر کراچی میں بڑی بہن علیل ہے اس کی بیماری لمبی ہو گئی ہے۔ فکر نہ کرو۔ اسی مہینے میں وہ آ جائیں

گی۔"

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ مگر مسعود کی امی کراچی سے لاہور نہ آ سکیں۔ محض اس لئے کہ وہ کراچی گئی ہی نہیں تھیں ادھر مسعود نے فرخندہ سے ملنا کم کر دیا اور ایک دوسری لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔

فرخندہ کی حالت اس بھوکی بلی ایسی ہو گئی تھی جس نے گھر میں گوشت کی بو سونگھ لی ہو اور اب بے چینی سے کمروں کے چکر کاٹ رہی ہو۔ جوں جوں اُسے اپنی بے حیائی اور بدکاری کی زندگی کا احساس ہو رہا تھا وہ اس دلدل میں زیادہ دھنستی چلی جا رہی تھی۔ مسعود کے بغیر اسے ایک پل چین نہ پڑتا تھا۔ اپنی پستی اور ذلت کے احساس کے ساتھ ہی ساتھ شہوت کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ مسعود سے ہر روز ملاقات ہو لیکن مسعود اسے ہفتے میں صرف ایک بار ہی ملتا وہ بے تاب ہو کر اس کے گلے سے لگ جاتی اور گال اس کے سینے پر رکھ کر روتی ہوئی کہتی۔

"اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی۔ تمہارا دل بدل گیا ہے تم مجھ سے دور بھاگنے لگے ہو۔ میں تمہیں بلا بلا کر تھک جاتی ہوں۔ پھر تم ملتے ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے مسعود؟ کیا مجھ میں پہلے کی سی دلکشی نہیں رہی؟ کیا میں اب ویسی نہیں ہوں؟ ابھی تمہارا یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا۔ مجھ میں تو کوئی کمی نہیں آئی۔ میں تو اسی طرح تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تو پہلے کی طرح تم پر جان دیتی ہوں۔ تم کیوں بدل گئے ہو؟"

یہ جملے مسعود کو پہلے بڑے اچھے لگا کرتے تھے وہ ان پر فتح مندی اور غرور کے ساتھ جھوم جایا کرتا تھا۔ مگر اب اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خیال ہی خیال میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ فرخندہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر بن کر اُسے اپنے سر پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم وہ بڑے صبر سے بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر چہرے پر فرضی حیرت اور پریشانی طاری کر کے کہنے لگا۔

یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں تم سے پہلے کی طرح پیار نہیں کرتا۔ نہیں نہیں فرخندہ---- اس طرح مت سوچا کرو۔ میں تم سے اُسی طرح محبت کرتا ہوں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میرے امتحان سر پر آ گئے ہیں۔ اور میں جی لگا کر محنت کرنے کے بعد پاس ہو جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ پھر تم سے شادی کر سکوں۔ اتنی سی بات پر تم پریشان ہو گئیں۔ لو اب

چہرہ اوپر اٹھاؤ اور اپنے نازک لب میرے لبوں پر رکھ دو"

فرخندہ مسعود کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ہی بول سے خوش ہو کر مطمئن ہو جاتی۔ اس کے لئے بے رحم روحانی انتشار کے طوفان میں اتنا سہارا ہی کافی تھا۔ وہ بڑے جذباتی اور پرجوش انداز میں مسعود کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر کے اُس کے ساتھ لگی لگی جھولنے لگتی۔ مسعود پہلے ہی سے اس گھڑی کا منتظر ہوتا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ پلنگ پر لیٹا لیتا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس منظر کا پردہ گر جاتا اور کھیل کی ساری دلچسپی ساری لطافت، سارا لطف ختم ہو جاتا اور سامنے سکرین پر وہی روز کی دیکھی بھالی بے رنگ و بو، بے لطف اور پھیکی پھیکی بیسنری لگنے لگتی۔ حقیقت میں مسعود کو اب فرخندہ سے صرف اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا گھر میں رہنے والے کو غسل خانے کے نل سے ہوتا ہے جہاں سے جب چاہے وہ ٹونٹی کھول کر پانی لے سکتا ہے۔

برسات گزر رہی تھی ایک روز فرخندہ مسعود سے ملنے دوپہر کو گھر سے نکلی تو آسمان کو بادلوں نے گھیرنا شروع کر رکھا تھا۔ اس روز ان کا پروگرام فلم دیکھنا تھا۔ مسعود نے بکس پہلے ہی سے محفوظ کروالیا تھا دراصل مسعود کی دوسری محبوبہ جس کے ساتھ اس کا عشق بڑے زوروں سے چل رہا تھا۔ اور جسے اُس نے فرخندہ کا دیا ہوا ریشمی رومال بھی تحفے کے طور پر دیا تھا۔ کراچی گئی ہوئی تھی اور مسعود بڑا اکیلا اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ وہ دو ڈھائی بجے تک ایک جگہ اپنے دوستوں میں بیٹھا بیئر پیتا رہا پھر اُس نے چڑیا گھر کے دروازے سے فرخندہ کو لیا جو حسب سابق بڑی بن سنور کر آئی ہوئی تھی۔ کیسنو ہوٹل میں بیٹھ کر اُس نے کھانا کھایا اور فرخندہ کو لے کر سینما کی طرف چل پڑا وہ بیئر کے ٹھنڈے ٹھنڈے، سلگتے سلگتے نشے میں تھا اور بڑی خود پرستی اور خود شناسی کے احساس کے ساتھ محتاط قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ بکس میں بیٹھے تو فرخندہ نے اپنا سر مسعود کے کندھے سے لگا دیا اور بتانے لگی کہ اُس نے مسعود سے ملے بغیر دن کیسی تکلیف اور اُداسی میں گزارے۔ مسعود بے دلی اور بے نیازی سے اسی طرح سنتا رہا جس طرح وہ نیچے ہال سودا سلف بیچنے والے لڑکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سن رہا تھا۔ اس دوران وہ اپنا بازو فرخندہ کی کرسی کے اوپر رکھے آہستہ آہستہ اُس کا گداز باز تھپتھپاتا رہا۔ ہال کی بتیاں گل ہو گئیں۔ فلم شروع ہو گئی تو مسعود نے فرخندہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اُسے ساتھ لپٹا کر لمبے لمبے بوسے لینے لگا۔ فرخندہ نے شراب کی بو سونگھ لی۔ اب

اسے اس بو کی پہچان ہو گئی تھی۔ ایک بار تو مسعود نے اُسے تھوڑی سی پلا بھی دی تھی۔ اس نے مسعود کے بازوؤں میں کہیں منہ چھپائے چھپائے سرگوشی میں کہا۔

"تم نے پھر پی رکھی ہے؟"

مسعود نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ سینما ہال سے باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ فرخندہ نے بادلوں کے گرجنے کی آواز بکس میں بیٹھے بیٹھے اندر سن لی تھی ایک دو بار اسے سینما کی چھت پر بارش کی بوچھاڑ کے پڑنے کا شور بھی سنائی دیا تھا اب جو باہر آئے تو چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ وہ دونوں سینما کی لابی میں ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اچانک فرخندہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کے بالکل سامنے ٹکٹ والی کھڑکی کے باہر خالد کھڑا اُسے گھور رہا تھا۔ خالد کو پہلے تو یقین نہ آیا۔ پھر وہ آہستہ سے چلتا فرخندہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بظاہر لاپرواہی سے فلم کی تصویریں دیکھنے لگا۔ فرخندہ نے منہ پھیر لیا مگر اس کی روح خشک ہو رہی تھی پھر خالد پرے جا کر کھڑا ہو گیا اور بار بار فرخندہ اور مسعود کو گھورتا رہا۔ بارش ذرا تھمی تو فرخندہ مسعود کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر بجائے اپنے گھر کے کسی دوسری طرف چل پڑی۔ اُس نے مسعود کو بتایا دیا کہ اُس کا خالہ زاد بھائی ان کا پیچھا کر رہا ہے اور واقعی خالد سائیکل پر کچھ دور تانگے کے پیچھے پیچھے آیا پھر ایک طرف کو مڑ گیا فرخندہ کی جان میں جان آئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ خالد اب ایک طوفان ضرور اٹھائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جب وہ گھر پہنچی تو خالد پہلے سے ہی اس کی امی کے پاس بیٹھا تھا۔

۱۳

فرخندہ اگرچہ تانگے میں بیٹھ کر آئی تھی۔ لیکن تانگہ بازار میں رک گیا تھا اور کچھ بازار کا حصہ اور ساری گلی اسے طے کرنی پڑی تھی۔ اس کی سینڈل کی جھریوں میں سے کیچڑ اندر آ گیا تھا اور ایڑی کی طرف کیچڑ اڑ اڑ کر شلوار پر جم گیا تھا۔ خالد کو امی کے پاس بیٹھا جھک کر باتیں کرتا دیکھ کر فرخندہ سہم گئی۔ بارش تھم گئی تھی۔ آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ فرخندہ نے برقعہ اتار کر الگنی پر لٹکایا اور غسل خانے میں جا کر سینڈل سمیت پاؤں دھونے لگی۔ خالد نشست گاہ والے کمرے سے باہر نکلا فرخندہ کی طرف دیکھ کر بڑی ریاکاری سے مسکرایا اور سلام کر کے باہر نکل گیا۔ فرخندہ سمجھ گئی کہ سانپ اپنا کام کر گیا ہے اب وہ اس زہر کو زائل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ اتنے میں فرخندہ کی امی نے اسے آواز دی۔ فرخندہ نے "آئی امی" کہا اور پاؤں جھاڑ کر نشست گاہ میں آ گئی۔

فرخندہ تجھے میں نے ہزار بار منع کیا ہے کہ اتنی دیر گھر سے باہر مت رہا کرو۔ تمہارا یہ روز روز سہیلیوں کے پاس جا کر کتابیں لانا ٹھیک نہیں۔ "تمہارے باپ کو اس کا علم ہو گیا تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی"۔

فرخندہ تو حیران رہ گئی۔ اس کی جان میں جان آ گئی تو گویا خالد نے چغلی نہیں کی تھی۔ لیکن وہ کیا سوچ کر چپ رہا۔ فرخندہ نے جانے کیا کیا جوابات سوچ رکھے تھے۔ اب جبکہ میدان بالکل ہی صاف ملا تو اس نے امی سے معافی مانگی اور صرف اتنا کہا۔

"امی ان سہیلیوں نے تمام مشکل سوالات پہلے ہی سے کاپیوں پر حل کر رکھے ہیں اگر ان سے مدد نہ لوں تو کیا فیل ہو جاؤں میں تو وہاں دو گھنٹے بیٹھی سوالات کا حل اپنی کاپی پر نقل کرتی رہی"۔

والدہ نے اٹھ کر رسوئی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹی۔ مگر جوان لڑکی کا اتنی دیر گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ تم ایک ہی بار سوال نقل کرلاؤ"...... چلو اب چاول تسلے میں ڈال کر بھگو دو۔ سوا تین گلاس ڈالنا"۔

اُوپر گیلری سے عذرا بھابی نے آواز دی۔

"امی جی بلو کی چوسنی نیچے تو نہیں رہ گئی؟ فرخندہ ذرا دیکھنا تو۔"

فرخندہ کمرے میں گئی تو جالی دار دروازہ کھلا اور اسلم کتابیں بغل میں دبائے اندر داخل ہوا۔

"آپی آج ہمارے کالج میں فلم شو تھا۔ جاپان کے قدرتی نظاروں پر فلم تھی سچ مزہ آ گیا۔ آج کیا پک رہا ہے؟"

فرخندہ اوپر چوسنی دینے گئی اس کا بڑا بھائی اکبر میز کے آگے عینک لگائے کرسی پر بیٹھا دفتر کی فائلوں پر کام کر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بلقیس کی بچی اٹھ کر رونے لگی۔ بلقیس کمرے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اس نے وہیں سے اُسے پکارنا شروع کر دیا۔ فرخندہ نے نیچے آ کر ماں کے ساتھ رسوئی کا سارا کام کیا چاول اُبالے روٹیاں پکائیں بلقیس نے برتن مانجھے مٹکوں میں پانی بھرا برسات کی وجہ سے مٹکوں کے باہر سبز سبز کائی جمنے لگی تھی اور پانی کا ذائقہ پھیکا ہو گیا تھا دوپہر کے پکائے ہوئے کریلے بھی ہنڈیا میں پڑے تھے۔ شام کو ٹینڈے گوشت پکایا گیا۔ شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے جلدی ہی چھا گیا۔ بادل پھر گرجنے لگے۔ بجلی چمکنا شروع ہو گئی۔ اب مینہ برسنے لگا۔ ہوا تیز ہو گئی۔ مرطوب ہوا کے جھونکے آنگن والی بیری کی گھنیری شاخوں کو جھولا جھلانے لگے۔ فرخندہ کے والد شیخ فقیر دین جلدی گھر آ گئے رسوئی میں آ کر انہوں نے گیلی چھتری کونے میں رکھ دی چھتری میں سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ کیچڑ بھرے جوتے اُتار کر وہ بید کی پیڑھی پر بیٹھ گئے۔

اور صدری کی جیب سے گندا رومال نکال کر ناک صاف کرنے لگے۔ یہ ان کی عادت سی ہو گئی تھی۔ کہ شام کا کھانا اپنی بیوی کے پاس رسوئی میں بیٹھ کر کھایا کرتے۔ انہوں نے بتایا کہ اکبری منڈی میں پانی کھڑا ہے اور مصری شاہ کے بازار میں بھی بارش کا پانی گندی نالیوں سے اچھل پڑا ہے۔

"کارپوریشن والوں کے کان پر تو جوں تک نہیں رینگتی۔"

پھر انہوں نے باورچی خانے کی جالیوں میں سے باہر گرتی بارش کی تیز بوچھاڑ کی طرف دیکھ کر ناک سیکڑ کر دوبارہ سوں سوں کیا اور بولے۔

"گھنٹہ بھر بارش اسی طرح ہوئی تو سارا محلہ ڈوب جائے گا۔ آج کیا پکا ہے فرخندہ کی ماں؟"

"ٹینڈے گوشت"

"دوپہر کے کریلے کہاں چلے گئے؟"

"وہ بھی ہیں۔"

"وہ بھی تھے تو ٹھنڈے گوشت کیوں پکا لئے۔ اتنی عمر ہوگئی ہے تیری مگر گھر چلانا تمہیں ابھی تک نہ آیا۔ فرخندہ کی ماں آدمی دنیا میں کھانے کے لئے نہیں آیا۔ کمانے کے لئے آیا ہے تمہیں ایک دن دکان پر صبح سے شام کرنی پڑے تو نانی یاد آجائے۔"

فرخندہ کی ماں اس قسم کی باتوں کی عادی تھی۔ شیخ صاحب بڑبڑ کرتے رہے اور اس نے چوکی آگے رکھ کر کھانا لگا دیا۔ عذرا اپنا اور اپنے خاوند کا کھانا طشت میں اوپر لے گئی تھی۔ بلقیس، اسلم اور فرخندہ گلی والے کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ اسلم جاپانی فلم کی باتیں سنا رہا تھا۔ بلقیس خود بھی کھا رہی تھی اور اپنی بچی کے منہ میں بھی چاول ڈال رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسلم کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن بھی رہی تھی۔ فرخندہ اسلم کی باتیں برائے نام سن رہی تھی۔ اس کے دماغ میں مسعود سے دوپہر والی ملاقات کی ساری باتیں ساری تصویریں گھوم رہی تھیں۔ اسے خالد کی تیز اور عیار آنکھیں دکھائی دیں۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر پانی کا ایک گھونٹ پی لیا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خالد نے اس کی شکایت کیوں نہیں کی۔ اس نے یہ سنہری موقع کیوں کھو دیا۔ وہ ایسی خصلت کا انسان تو تھا ہی نہیں کہ فرخندہ کو معاف کر دے۔ وہ ضرور امی سے بات کرے گا۔ مگر جانے کیا سوچ کر ابھی خاموش تھا۔ پھر فرخندہ نے اپنی بزدلی اور کمزوری کو جھٹک کر پرے کر دیا۔ آخر وہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ ایک بار نہیں ہزار بار شکایتیں کرتا پھرے۔ میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میں صاف مکر جاؤں گی۔ آخر اس کے پاس ثبوت کیا ہے؟ یہی ناں کہ اس نے مجھے تانگے میں یا سینما میں ایک مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں کہوں گی وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔ اسلم کہہ رہا تھا۔

"ہنوجی یاما پہاڑ پر برف ہی برف پڑی تھی۔ پھر انہوں نے ایک ننھا مصور دکھایا۔ برش سیاہی میں ڈبو کر وہ کاغذ پر یونہی پھیرتا جاتا اور بانس کے درخت بنتے جاتے۔ سمندر میں غوطہ لگا کر موتی چننے والی لڑکیوں نے تو کمال کے کرتب دکھائے۔"

بلقیس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا وہ سمندر میں غوطہ لگاتی تھی؟"

"ہاں ہاں بھئی ------ اور کیا کہہ رہا ہوں۔ تم سن کیا رہی ہو۔"

"پھر تو کمال ہے"

بلقیس کی بچی نے پانی کا گلاس الٹ دیا۔ بلقیس نے اسے ایک دھپ ماری۔

"مرن جوگی تجھ سے نچلے نہیں بیٹھا جاتا۔"

بچی رونے لگی۔ فرخندہ اسے چپ کراتے ہوئی بولی۔

"باجی تم بڑی ہتھ چھٹ ہو گئی ہو۔"

اسلم دیاسلائی سے دانتوں میں خلال کرتا اٹھا۔ جالی دار کھڑکی کے پاس منہ لے جا کر باہر اندھیری گلی میں جھانکا اور اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بارش ابھی تک ہو رہی ہے۔ صبح کالج لنگوٹی باندھ کر جانا پڑے گا۔"

دونوں بہنیں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ فرخندہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ بلقیس اپنی بچی کو وہیں صوفے پر تھپک کر سلانے لگی۔ شیخ صاحب کھانے سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھڑی میں جا چکے تھے جہاں اس وقت اپنے پلنگ پر تجوری کی طرف منہ کئے بیٹھے کھاتہ زانو پر رکھے پرانا حساب دیکھ رہے تھے۔ ان کی بیوی رسوئی میں تھی۔ فرخندہ اور بلقیس نے مل کر سارے جھوٹے برتن غسل خانے میں ڈھیر کر دئے۔ بلقیس انہیں مانجھنے لگی تو امی نے کہا۔

"بالی بارش ہو رہی ہے انہیں رہنے دے۔ سویرے سہی۔

فرخندہ اوپر دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آگئی۔ بھابی عذرا کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بالکونی کے فرش پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں آکر وہ ٹیبل لیمپ جلا کر پلنگ پر چادر اوڑھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اور کتاب پڑھنے لگی۔ جلد ہی وہ کتاب سے تنگ آگئی۔ اس نے مسعود کے تمام خط نکال کر پاس رکھ لئے اور انہیں ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کر دیا اس کا دل مسرت اور رومانی تصورات سے لبریز ہو گیا۔ شروع شروع کے خط پڑھ کر جن میں مسعود نے اسے "آپ" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ فرخندہ اداس ہو گئی۔ اسے یہ غم انگیز خیال آنے لگا کہ کس طرح اس نے آہستہ آہستہ مسعود کے سامنے اپنی آبرو کو بتدریج گھٹا دیا۔ جب وہ ان خطوں پر آئی جن میں اس کے محبوب نے بڑے کھلے اور فحش انداز میں جنسی تجربوں کو مزے لے لے کر بیان کیا تھا۔ تو اس کا نازک دل دھڑکنے لگا اور اسے خود سپردگی اور لذت کشی کے سارے لمحات یاد آگئے۔ پھر اس پر ملال اور بے لطفی کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے خط تہہ کر کے رکھ دیئے اور ٹیبل لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ گلی کی طرف سے بارش کی آواز آرہی تھی۔ صاف

معلوم ہورہا تھا کہ گلی میں پانی کھڑا ہوگیا ہے اور بارش کی بوندیں پانی میں گر رہی ہیں۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا جو کھلی کھڑکی کی راہ سے اندر آرہی تھی۔ پردے کو ادھر ادھر اڑا رہی تھی۔ سٹیشن کی جانب سے ایک شنٹ کرتے انجن کی سیٹی اور بھاپ چھوڑنے کی گیلی گیلی آوازیں آرہی تھیں۔ اس وقت فرخندہ کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ اور مسعود اس کے اوپر جھکا محبت کی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ فرخندہ اس وقت اپنے بستر کے بجائے سینما والے بکس میں مسعود کی آغوش میں تھی اور ان لمحات کا ایک بار پھر مزہ لے رہی تھی جو گذر چکے تھے پھر اسے نیند آگئی۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ اس کا نصف دھڑ بھینس کا ہے اور ایک کالا سانپ اس کی ٹانگوں سے لپٹا اس کا دودھ پی رہا ہے۔ اس نے زور لگا کر چیخنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز جیسے منوں پتھروں تلے دب کر رہ گئی تھی۔ پھر اپنے آپ ہی یہ بوجھ اٹھ گیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور ماتھے پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ٹانگوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ اطمینان کا گہرا سانس لیا اور پھر سو گئی۔

صبح مینہ تھم چکا تھا۔ بادل ویسے ہی جھکے ہوئے تھے۔ وسن پورے کی گلیوں بازاروں میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا تھا۔ کھلنڈرے بچے، تانگے، موٹریں اور بسیں گدلے گدلے پانی کے چھینٹے اڑاتی جا رہی تھیں۔ مکانوں کی دیواریں گیلی ہو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ فرخندہ کے سامنے والے زیر تعمیر مکان کا گڑھا پانی سے لبریز ہوگیا تھا۔ اور اس میں میلی کچیلی بطخیں تیر رہی تھیں اکبر پتلون رانوں تک چڑھا، بوٹ سائیکل کے ہینڈل سے باندھ کر پانی میں سے پیدل گذر کر دفتر گیا۔ اسلم کو بھی اسی طرح گلی اور بازار عبور کر کے کالج جانا پڑا۔ دس گیارہ بجے کے قریب پانی کچھ کم ہوا تو شیخ صاحب بھی گھر سے دکان پر جانے کے لئے گھر سے باہر نکلے۔ چھتری ان کے ہاتھ میں تھی اور جھکے ہوئے کمزور کندھوں پر میلی ٹوپی والا سر مرطوب موسم میں سکڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ تھیلہ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جس میں اردو کا تازہ اخبار اور روٹی کا ڈبہ تھا۔ قدم قدم گلی کے کیچڑ میں سے گذر کر وہ بازار میں آئے اور حسب عادت ایک سواریوں والے تانگے پر سوار ہو کر اکبری منڈی کی طرف روانہ ہوگئے۔

دوپہر کے بعد پانی اتر گیا۔ ہر طرف کیچڑ، مکھیاں اور بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ گلی کی نالیوں میں کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ اور کنارے کنارے مٹی کی موٹی تہہ جمی تھی جس کی سطح پر پانی کی لہروں کا نشان رہ گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر بلقیس اور عذرا تو اوپر چلی گئیں فرخندہ کی امی اپنے خاوند کے پلنگ پر پڑ گئیں۔ اور فرخندہ نشست گاہ میں صوفے پر آکر

لیٹ گئی۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ گدیوں پر سر رکھے دونوں ٹانگیں صوفے کے بازو پر پھیلائے انگریزی نظموں کی کتاب کا خلاصہ پڑھ رہی تھی۔ کہ اسے گلی میں سائیکل کی گھنٹی اور پھر دروازہ کھول کر سائیکل ڈیوڑھی میں رکھنے کی آواز آئی۔ اس وقت کون ہوسکتا ہے سب لوگ کام پر گئے ہوئے ہیں۔ اتنے میں اسے خالد کی آواز سنائی دی۔ وہ امی کو سلام کرنے کے بعد ان سے باتیں کر رہا تھا۔

فرخندہ کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر دوپٹہ لے کر بیٹھ گئی اور کان لگا کر دوسرے کمرے سے آتی ہوئی خالد کے باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آواز سننے لگی۔ وہ بارش کی زیادتی، کیچڑ، سمن آباد والے نالے کے ٹوٹ جانے اور اپنی والدہ کے زکام کی باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے فرخندہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ فرخندہ کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اب یہ کمینہ اس طرف آرہا ہے وہ ادھر کس غرض سے آرہا ہے؟ وہ صاف صاف امی سے کیوں نہیں کہہ دیتا کہ فرخندہ آوارہ ہوگئی ہے؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ فرخندہ ابھی قسم کے پریشان خیالات کی لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی کہ دروازے کا پردہ ہٹا اور خالد اندر داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس کا دبلا پتلا منحنی سا بدن مزید دبلا پتلا اور سکڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے اونچی اور خوش باش آواز میں فرخندہ کو سلام کیا اور صوفے کے بازو پر بیٹھ کر بولا۔

" تمہارے وسن پورے سے تو ہمارا سمن آباد ایک جنت ہے۔ یہاں تو معلوم ہوتا ہے کیچڑ اور مکھیوں کی بارش ہوتی ہے۔ کیا پڑھ رہی ہو؟"

" پوئٹری۔"

" پوئٹری؟ واہ واہ!"

خالد نے بڑی بے تکلفی سے فرخندہ کے ہاتھ سے خلاصہ لے لیا اور اپنی چوہیا جیسی بے رس آنکھیں سکوڑ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ سونف چبا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے ہونٹوں کی ایک طرف ہلکے سبز رنگ کا تھوڑا سا جھاگ جمع ہوگیا تھا۔ فرخندہ کو اپنے اوپر ایک ایسے چور کا گمان ہونے لگا جس سے تھانے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہو۔ ادھر خالد بڑے اعتماد اور بے تکلفی سے کتاب الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کے بشرے سے یہ بات صاف عیاں تھی کہ اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ فرخندہ سوچ رہی تھی کہ وہاں سے دفع کیوں

نہیں ہو رہا اور خالد سوچ رہا تھا کہ وہ بات کس طرح شروع کرے۔ اس نے فرخندہ کی چوری تو پکڑلی تھی لیکن اب اس کے اظہار کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اس خاموش بالمقابل کی ذہنی رسہ کشی اور تنا تنی میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا۔ جب غیر ارادی طور پر دونوں کی نگاہیں چار ہوگئیں۔ فرخندہ نے ایک دم آنکھیں جھکالیں اور اسے پسینہ آگیا خالد کی آنکھوں کی تیز تیز مکاری اور عیاری کی وہ تاب نہ لاسکی۔ اب خاموشی ناقابل برداشت ہوگئی۔ خالد نے سوچا اس طرح وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ اسے گفتگو کا سلسلہ منقطع نہیں کرنا چاہیئے۔

"تو پھر آج کل پوئٹری پڑھی جارہی ہے۔"

"ہاں۔" فرخندہ نے ایک کاپی پر اپنے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو انگریزی شاعروں میں شیلے بہت پسند ہے۔ اس نے محبت کا ایک بالکل ہی انوکھا نظریہ پیش کیا ہے۔ کیا تمہیں بھی پسند ہے۔ شیلے فرخندہ؟"

فرخندہ نے بظاہر اس طرح جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو مسکرا کر کہا۔

"میں تو ابھی پڑھ رہی ہوں۔"

"کیا ماسٹر جی تمہیں سمجھاتے نہیں؟ میرا خیال ہے انہیں انگریزی بہت کم آتی ہے۔ بھلا تم ایسے استاد کی شاگردی میں کیسے کامیاب ہوگی؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں۔ ماسٹر جی تو بڑی محنت سے پڑھاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن تمہیں شیلے کی شاعری کے موضوع کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے مثلاً تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس نے اپنی ساری شاعری میں آزاد جنسی محبت پر زور دیا ہے۔ چاہے جس سے ملو۔ محبت کرتے پھرو۔ باغوں اور سینماؤں میں گھومتے پھرو۔"

فرخندہ کانپ گئی۔ یہ ذلیل آدمی کس طریقہ سے حملہ کر رہا ہے۔

"وہ تو محبت میں کسی پابندی کا قائل ہی نہیں۔ اس لئے میں شیلے کو پسند کرتا ہوں۔ تمہیں بھی یقیناً یہ شخص پسند آئے گا۔" فرخندہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہی تھی کہ یہ بدفطرت شخص کس بے رحمی سے اس پر آہستہ آہستہ نشتر زنی کر رہا ہے۔ خالد نے سگریٹ جلائی اور چل کر گلی والے جالی دار دروازے تک گیا۔ پھر واپس آکر آتشدان کے پاس کھڑا ہوگیا اور شیشے کے گلدان کے باسی پھولوں کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے یک دم کہنے لگا۔

"فلم پسند آئی تھی کیا؟"

فرخندہ اس لمحے کا پہلے ہی سے انتظار کر رہی تھی۔ پہلے تو اس پر گویا بجلی ہی گر پڑی۔ لیکن لڑکی چونکہ خود پسند اور خود سر تھی فوراً سنبھل گئی اور بولی۔

"کون سی فلم"

خالد مسکرایا اور آتش دان سے ہٹ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر فرخندہ پر اپنی گہری گہری نظریں گاڑ کر بولا۔

"کل والی----- ویسے میں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں فرخندہ لڑکا خوبصورت ہے۔"

فرخندہ کا چہرہ غصہ میں لال پیلا ہوگیا۔ بات بالکل سچی تھی مگر خالد کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ فرخندہ پر طنز کرے۔

"کون لڑکا؟ تمہارا دماغ تو ٹھکانے ہے؟ کیا کہہ رہے ہو؟"

خالد کو بھی پسینہ آگیا اپنی طبیعت اور ارادے کی کمزوری کے باعث اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے واقعی وہ فرخندہ پر بہتان لگا رہا تھا۔ پھر اُسے کل کا سارا منظر یاد آگیا۔ یقیناً وہ فرخندہ ہی تھی۔ اس کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ سینڈل، وہی برقعہ، وہی ان میں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور چلنے کا وہی انداز------

"میں کہہ رہا ہوں فرخندہ کہ کل تم جس لڑکے سے ملنے گئی تھیں اور جس کے ساتھ بکس میں بیٹھ کر تم نے فلم دیکھی میں اسے جانتا ہوں۔ وہ ایک آوارہ اور اوباش نوجوان ہے وہ تمہاری زندگی برباد کر کے رکھ دے گا-----"

فرخندہ نے غصے میں کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں کسی سے ملنے نہیں گئی۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔ تمہیں مجھ پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی؟"

خالد زیر لب مسکرا دیا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ اس کے کردار کی ساری کمینگی، ریاکاری اور بدصورتی سمٹ کر اس کے سکڑے ہوئے چہرے پر آگئی اور وہ فرخندہ کو جھک کر کہنے لگا۔

"اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو فرخندہ۔ میں نے تم دونوں کو اور تم نے

مجھے سینما ہال کی لابی میں دیکھ لیا تھا۔ میں اس لڑکے کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں اس کا نام مسعود ہے اور وہ اورینٹل کالج میں اردو کا ایم۔اے کر رہا ہے۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری ایک رشتہ دار لڑکی ایک غیر مرد کے ساتھ بازاروں میں گھومتی پھرے۔ اس کے ساتھ بکس میں بیٹھ کر سینما دیکھے۔ اس میں صرف میری ہی نہیں ہمارے سارے خاندان کی بےعزتی ہے۔ خالو اور خالہ جان کو یہ بری خبر سنانے سے پہلے میں تمہیں سمجھانا چاہتا تھا۔ تاکہ تم ایسی باتوں سے توبہ کر لو اور آئندہ کبھی اس لڑکے سے نہ ملو۔ لیکن اگر تم اپنے آپ کو نہیں روک سکتیں تو مجھے مجبوراً تمہارے ماں باپ کو یہ بات بتانی پڑے گی۔ کیونکہ پھر یہ میرا فرض ہو جاتا ہے اور میں اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ بولو! اب تم کیا کہتی ہو!"

فرخندہ ایک پل کے لئے تو بالکل منجمد سی ہو کر رہ گئی اسے یوں لگا گویا سارے شہر میں اس کی گنہگار زندگی کا ڈھنڈورا پٹ گیا ہو۔ وہ نظریں فرش میں گاڑے دوپٹے کے کونے کو چرمر کر رہی تھی۔ اس کے گال زرد پڑ گئے تھے۔ اور حلق بدنامی کے خوف سے خشک ہو گیا تھا۔ اسے تو یہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ خالد کو تمام باتوں کا علم ہو چکا تھا۔ وہ تو یہ جان گیا ہے کہ فرخندہ کے مسعود کے ساتھ ناجائز تعلقات بھی ہیں۔ زندگی کی اس بہت بڑی غلطی نے اس کے کردار کی ساری جرأت اور دلیری سلب کر لی تھی فرخندہ کے سامنے جب پورے کا پورا اعمال نامہ کھل گیا تو وہ بھیگی بلی بن کر رہ گئی اور اسے یوں لگا گویا وہ کانچ کی گڑیا ہے اور ذرا ہلی تو ٹوٹ کر بکھر جائے گی لیکن اس لڑکی نے ہمیشہ من مانی کی تھی۔ اور سہیلیوں پر حکم چلانا ہی سیکھا تھا۔ وہ شکست کا اعتراف کر سکتی تھی۔ مگر دشمن کے پاؤں پر گر کر معافی کی طلبگار نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ شیر بھوک سے مر جائے گا مگر گھاس کبھی نہیں کھائے گا۔ فرخندہ نے اپنی ہار تسلیم کر لی تھی۔ اپنی بدنامی ماں باپ کی آنکھوں میں اپنی تذلیل اور بھائی بہنوں کے سامنے اپنی بےعزتی اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر خالد کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

"اگر میں وعدہ کر لوں کہ آئندہ کسی سے نہ ملوں گی تو کیا تم بھی وعدہ کرتے ہو کہ اس کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کرو گے؟"

خالد کا چہرہ فتح مندی کی خوشی سے کھل اٹھا۔

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"تو پھر آج کے بعد میں اُس سے نہیں ملوں گی۔"

فرخندہ نے اتنا کہا اور جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ خالد کچھ دیر وہاں یونہی بیٹھا خلا میں گھورتا اور سگریٹ پیتا رہا۔ اُسے اتنی جلدی میدان مار لینے کا یقین نہ تھا۔ اُس کے تو ذرا سے ہلانے سے پھل شاخ سے ٹوٹ کر اُس کی جھولی میں آن گرا تھا لیکن چالاک آدمی کو چونکہ ساری دنیا چالاک نظر آتی ہے اس لیے خالد کو فرخندہ پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے فی الحال نہیں ملے گی مگر کچھ روز گزر گئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے گا۔ خالد نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فرخندہ کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہنا ہوگا۔ یہ حقیقت تو اس پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ فرخندہ اسے اچھا نہیں سمجھتی اور اپنی باتوں سے اس پر طنز ہی نہیں کرتی بلکہ نیچا دکھانے کی بھی کوشش کیا کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی عورت کے ہاتھوں اپنی بےعزتی برداشت نہیں کر سکتا تھا جو اس کی رشتہ دار ہو۔ جو اس سے کم پڑھی لکھی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو اس کی بجائے کسی دوسرے مرد سے محبت کر رہی ہو۔ مردوں کی طرح سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی خالد میں ہمت نہ تھی۔ وہ چھپ کر دشمن پر پیچھے سے حملہ کرنا چاہتا تھا اور ایسا کر رہا تھا۔ اسے فرخندہ کی ایک کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ ایک روز اسے ثبوت بھی مل جائے گا۔ وہ فرخندہ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ تو اسے دوسرے مرد سے چھین کر اپنے قابو میں لانا چاہتا تھا۔ اس جنگ میں وہ تمام منفی حربے استعمال کر رہا تھا۔ وہ ایک عورت کے ساتھ عورتوں کی سی لڑائی سے بھی گھٹیا لڑائی لڑ رہا تھا۔ فرخندہ اس کی تمام کمینگیوں اور منافقتوں کی کسوٹی بن گئی تھی۔ وہ تو ایسا آدمی تھا جسے کسی بھی عورت کا اپنے سوا کسی دوسرے مرد کے ساتھ محبت کرنا گوارا نہیں تھا۔ چہ جائیکہ ایک ایسی عورت اس کے ہاتھ سے نکل جائے جو اس کی خالہ زاد بہن ہو۔ جس سے وہ جتنی دیر چاہے بیٹھ کر باتیں کر سکتا ہو اور جو اس کی باتیں سننے پر مجبور ہو۔

فرخندہ کی ایک بہت بڑی کمزوری ہاتھ لگ جانے سے خالد نے یونہی فرخندہ سے بےتکلف ہونا شروع کر دیا۔ اب وہ دوسرے تیسرے دن ان کے ہاں آتا تو ماسٹرجی کے سامنے اسے کہتا۔

"فرخندہ پانی تو پلاؤ۔"

"فرخندہ ذرا باورچی خانے سے چاقو تو اٹھالاؤ۔"

"فرخندہ ڈیوڑھی میں میرا سائیکل کھڑا ہے دیکھو تو کہیں اس کی ہوا تو نہیں نکل گئی؟"

خالد کو ان باتوں سے بڑی تسکین ملتی تھی۔ ایک تو ایسا کرنے سے خالد کے خیال میں فرخندہ ماسٹر جی کے سامنے ذلیل ہو رہی تھی جن سے وہ مسکرا کر بات کرتی تھی اور جن کا وہ بے حد احترام کرتی تھی۔ دوسرے وہ ماسٹر جی پر یہ ثابت کرنا بھی چاہتا تھا کہ اس کا فرخندہ پر زیادہ حق ہے۔ دیکھا وہ کیسے اس کا ہر حکم بجالا رہی ہے۔ ذرا کوئی اسے کہئے تو کہ وہ خالد کی بات نہ مانے ----- ادھ موا عقاب اگر گیدڑ کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے کھاتا کم اور گھسیٹتا زیادہ ہے ایسا کرنے سے اس کے سفلی جذبات کی بڑی تسلی ہوتی ہے۔ وہ عقاب کے شانہ بشانہ بلند فضاؤں میں تو نہیں اڑ سکتا مگر موقع ملنے پر اسے ذلیل ضرور کرے گا۔ فرخندہ اس بے عزتی کو سہنے پر مجبور تھی۔ وہ خالد کا منہ توڑ سکتی تھی مگر اسے یہ کبھی گوارا نہیں تھا کہ اس کے گھر والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کسی غیر مرد سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ محبت کرنے میں وہ شیرنی ایسا کلیجہ رکھتی تھی۔ لیکن بدنامی کا نام سن کر ہی وہ ڈرپوک بلی کی طرح دبک گئی تھی۔ اس نے مسعود سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ ہفتہ بھر سے وہ گھر میں بیٹھی اس کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔ کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ جونہی وہ گھر سے باہر نکلی خالد سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ جائے گا اور اپنے ذلیل ہتھکنڈوں سے اس کا جینا محال کر دے گا۔ اس نے مسعود کو خط لکھ کر ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ مسعود نے تو گویا اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں اس کا دوسری لڑکی سے عشق بڑے زوروں پر تھا اور وہ اسے سبز باغ دکھلانے میں مشغول تھا۔ فرخندہ اس کی یاد میں تڑپ رہی تھی۔ ہر دوسرے روز اسے ایک نہ ایک خط لکھ دیتی اور جواب سے محروم رہتی۔ وہ مسعود کا جواب کس پتے پر منگواتی؟ دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ رہی تھی۔ اسے خالد کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور خالد اس کی اس بے بسی کا مزہ لے رہا تھا۔ گویا اس نے تو شیر کو پنجرے میں بند کر دیا تھا اور خود باہر بیٹھا اسے روڑے مار رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

لیکن خالد ایسا آدمی نہیں تھا کہ دشمن کے محاذ کو خاموش پا کر لمبی تان کر سو جائے۔ وہ جانتا تھا فرخندہ مسعود سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ وہ خوبصورت اور سمارٹ نوجوان ہے۔

اس سے تو ہر لڑکی جسے وہ اپنی محبت کا یقین دلا دے محبت کرے گی۔ وہ فرخندہ کی فطرت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ وہ یونہی کسی پر گرنے والی لڑکی نہیں۔ وہ جس نوجوان کے ساتھ بکس میں بیٹھ کر سینما دیکھ سکتی ہے اور بارش میں اس سے ملنے گھر سے نکل سکتی ہے تو وہ اس سے شادی بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ خالد نے اپنی مسمی صورت، چاپلوسی اور مکارانہ باتوں سے اپنی بہنوں کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنی والدہ کو قائل کر لیا کہ وہ فرخندہ کے ہاں اس کی شادی کا پیغام لے کر جائے۔ والدہ کو آخر کہیں نہ کہیں اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہی تھی۔ اس نے سوچا اگر بہن کے ہاں یہ رشتہ ہو جائے تو وہ فائدے میں ہی رہے گی۔ ایک تو لڑکی گھر کی ہو گی۔ ہمیشہ ادب لحاظ کرے گی۔ دب کر رہے گی اور پھر جہیز بھی خوب لائے گی اور اس کے بچے کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ اس نے خالد کے والد سے بات کی۔ انہوں نے کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے پہلے خالد کو امتحان تو پاس کر لینے دو"

خالد کی والدہ بولیں۔

"امتحان کیا ہے۔ اس میں کونسی دیر ہے۔ اور پھر ابھی تو صرف نکاح ہو گا۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی"

گھر میں بات طے ہو گئی۔ ایک روز خالد کی امی اور بہنیں اندرسوں اور خرموں کا ٹوکرا لے کر شیخ فقیر دین کے گھر وس پورے پہنچ گئیں گھر میں مرد کوئی نہیں تھا۔ صرف عورتیں ہی تھیں۔ شیرینی کا ٹوکرا دیکھتے ہی فرخندہ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ غسل خانے کی دہلیز پر بیٹھی میلے کپڑے ڈنڈے سے کوٹ رہی تھی۔ کافی دیر تک ادھر ادھر کی بے معنی مگر ایسے موقعوں پر بڑی ضروری باتوں کے بعد جب اصل مقصد زبان پر لایا گیا۔ تو فرخندہ کی والدہ خاموش ہو گئیں اور کھنے لگیں۔

"فرخندہ میری ہی نہیں تمہاری بھی بیٹی ہے بہن۔ اسے ایک نہ ایک دن بیاہنا ہی ہو گا۔ لیکن اس معاملے میں میں اس کے باپ سے مشورہ کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی"

خالد کی والدہ نے کہا۔

"بہن ہمیں کوئی ایسی جلدی تو نہیں۔ تم ضرور ان سے مشورہ کر لو۔ ویسے یہ گھر کی گھر ہی والی بات ہے۔ وہ گھر تم سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اور پھر فرخندہ میری بچی ہے اور خالد تم

پہ ہے۔ میں تو کہتی ہوں سالوں بعد دونوں گھروں کا ملاپ ہو گا۔ بہن پانی میں لاٹھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے ہاں بھی اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ فرخندہ راج کرے گی"

ان عورتوں کی خوب خاطر مدارات ہوئی۔ بلقیس اور بھابھی عذرا ان کے بیچ میں بیٹھی تھیں۔ میزبان عورتوں نے خالص دنیا داروں ایسے سطحی انداز میں بلقیس کے گھر کے اجڑنے پر افسوس کا اظہار کیا اور اس کے بچھڑے ہوئے شرابی خاوند کو خوب خوب برا بھلا کہا جو بلقیس کو اچھا نہ لگا۔ فرخندہ ویسے تو خوشی خوشی اپنی خالہ زاد بہنوں اور خالہ کے آگے چائے اور مٹھائی رکھ رہی تھی لیکن دل میں وہ ان سب کو کوسنے دے رہی تھی اور خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ یہ رشتہ کبھی طے نہ ہو۔ اگرچہ اس نے پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ وہ خالد سے کبھی شادی نہیں کرے گی اور اپنی والدہ سے صاف صاف کہہ دے گی کہ اسے یہ شادی منظور نہیں پھر بھی اس طبقے کی عام لڑکیوں کی طرح وہ ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں اسے زبردستی ڈولی میں بٹھا کر خاوند کے ساتھ روانہ نہ کر دیا جائے۔

جب سب عورتیں رخصت ہو گئیں تو وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی اور خوب روئی۔ جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو مسعود کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اس نے مسعود کو ایک زبردست خط لکھا جس میں اس نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ اب تاخیر سے کام نہ لے اور فوراً شادی کا پیغام بھجوا دے۔

"۔۔۔۔۔ باقی ساری بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ تم صرف پیغام بھجواؤ۔ مسعود پانی سر تک آن پہنچا ہے۔ اگر تم مجھ سے بچھڑ گئے تو میں زہر کھا لوں گی۔ پھر زندگی میرے لئے کسی کام کی ہو گی۔ میں کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں مگر تم سے جدا ہو کر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی خدا کے لئے جلدی کرو۔ اب دیر سے کام نہ لو۔ وقت گزر گیا تو دونوں ہاتھ ملتے رہ جائیں گے پھر نہ تمہیں میری خبر ہو گی اور نہ مجھے تمہارا کچھ پتہ ہو گا۔ دونوں جدائی کے صحراؤں میں بھٹک کر تباہ ہو جائیں گے۔ بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ مجھے اس خط کا جواب فوراً دینا۔ لیکن ہائے اس کا جواب تم سے کس طرح منگواؤں ؟ ۔۔۔۔۔"

فرخندہ نے قلم میز پر رکھ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی یہ خط کس کے ہاتھ بھیجے؟ وہ کس پر بھروسہ کرے۔ اس کا کون اتنا ہمدرد ہے جو یہ خط مسعود کے پاس لے جائے اور اس کا جواب لا کر دے۔ اور پھر کسی سے اس کا ذکر بھی نہ کرے۔ اس نے چاروں

طرف نگاہ دوڑائی۔ سوائے انجم کے اور کوئی شخص اس کے اتنا قریب نہیں تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکے۔ لیکن انجم بے حد بزدل تھی اور ایک بار خط لے جانے سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر انکار کر چکی تھی۔ پھر کون جائے؟ کون ؟ فرخندہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔ گلی میں بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور انھوں نے شور مچا رکھا تھا۔ بکائن کی گھنی شاخوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ اچانک فرخندہ کو ایک خیال آیا اور اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

"ٹھیک ہے۔ ماسڑجی میرا یہ کام ضرور کر دیں گے۔۔۔۔۔"

جلدی سے واپس آ کر اس نے مسعود کو لکھا کہ وہ جس شخص کے ہاتھ خط بھجوا رہی ہے اس پر وہ بھروسہ رکھتی ہے اور وہ اسی شخص کے ہاتھ خط کا جواب فوری طور پر روانہ کر دے اور یہ بات ضرور لکھے کہ وہ کس روز شادی کا پیغام بھجوا رہا ہے ؟

اب فرخندہ بے تابی سے ماسڑجی کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اتنی بے قراری اور بے چینی سے ماسڑجی کی راہ نہیں دیکھی تھی۔ اگر ماسڑجی بے چارے کو علم ہو جاتا کہ فرخندہ ہمہ تن نگاہ ہو کر ان کی آمد کی گھڑیاں گن رہی ہے تو گویا ان پر شادیٔ مرگ کا عالم طاری ہو جاتا اور یا وہ اڑ کر فرخندہ کے قدموں میں پہنچ جاتے۔ لیکن ہم جس صدی میں سانس لے رہے ہیں اس میں اگرچہ ہوا میں لاسلکی اور برقی پیغامات کا جال بچھا ہے اور ہزاروں میلوں سے آواز ایک پل میں پہنچ جاتی ہے لیکن ایک دل کی آواز دوسرے دل تک ہزاروں سالوں میں بھی نہیں پہنچ پاتی احساسات مردہ ہو گئے ہیں۔ جذبات زنگ آلودہ ہیں۔ ہر خیال کسی نہ کسی ضرورت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ہاتھ کسی نہ کسی مطلب کے لئے ملتے ہیں۔ دل کسی نہ کسی غرض کے لئے دوسرے دل کو آواز دیتا ہے۔ انسان من کے کواڑ بند کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ یہاں تو صرف مقصد مقصد سے ہم آغوش ہوتا ہے ضرورت ضرورت سے گلے ملتی ہے۔ اور مصلحت مصلحت سے مصافحہ کرتی ہے۔ اگر فرخندہ صرف محبت اور پریم ایسے پاکیزہ بے لوث جذبات کے ساتھ ماسڑجی کی راہ دیکھنے بیٹھتی تو فرخندہ کے دل سے نکلتی ہوئی مخلصی اور گہری لگن کی شعائیں ماسڑجی پر جہاں بھی وہ ہوتے اثر کرتیں اور وہ فوراً اس کے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مگر یہاں تو ایک ضرورت اور مقصد کا انتظار تھا۔

چنانچہ ماسڑجی روز کی طرح ٹھیک اپنے وقت پر فرخندہ کو پڑھانے گھر میں داخل ہوئے اور نچلے کمرے میں آ کر چپ چاپ بیٹھ گئے فرخندہ بڑی خوش خوش اندر آئی اور سلام کر کے

ماسٹر جی کے ہاتھ سے مٹی کے کوزے میں رکھے ہوئے گلاب جامن لے کر انہیں پلیٹ میں ڈال کر وہیں ان کے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔

"کھائیے ناں ماسٹر جی"

ماسٹر جی کچھ شرما کر مسکرائے۔ بلکہ جھینپ گئے۔ کچھ گھبرا سے گئے اور اس گھبراہٹ میں ان کا ہاتھ عینک پر جا پڑا اور وہ ناک سے پھسل کر نیچے آ گئی۔ انہوں نے جلدی سے عینک کو پھر سے جمایا اور بولے۔

"نہیں بیٹی تم کھاؤ۔ یہ تمہارے لئے ہیں۔"

فرخندہ نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔

"جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں نہیں کھاؤں گی"

ماسٹر جی بڑے خوش ہوئے۔ ان کا دبلا پتلا سا ادھیڑ عمر کا لاغر بدن اتنی بے پایاں مسرت کا متحمل نہ ہو سکا اور کانپنے لگا۔ جس طرح صبح کی تازہ ہوا میں دریا کے پانی پر جھکا ہوا گھاس کانپنے لگتا ہے انہوں نے کتنے ہی دنوں کے بعد آج فرخندہ کو خوش و خرم اور مسکراتے دیکھا تھا۔ ان کی تو جان میں جان آ گئی تھی۔ فرخندہ کی اداسی نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے گلاب جامن اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور میلا سا رومال منہ کے آگے رکھ کر سر جھکا لیا اور بچوں کی طرح کھانے لگے۔ فرخندہ نے بھی ایک گلاب جامن اٹھایا اور پلیٹ والے گلاب جامن عذرا بھابی اور بلقیس کے بچوں کو اوپر بھجوا دیئے۔ مسعود کے نام لکھا ہوا خط اس نے پہلے ہی سے اپنی کاپی میں رکھ چھوڑا تھا۔ آدھ پون گھنٹہ وہ بڑے انہماک سے ماسٹر جی سے پڑھتی رہی۔ پھر امی نے چائے کے لئے آواز دی فرخندہ ٹرے اٹھا کر اندر لائی اور ماسٹر جی کو چائے بنا کر دی۔ برسات اگرچہ تقریباً گزر چکی تھی لیکن ان دنوں سیلاب کی بڑی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ فرخندہ نے سیلاب کی باتیں شروع کر دیں۔

"ماسٹر جی اب کے اگر سیلاب آ گیا تو ہمارا اباجی والے کمرے کا فرش تو تباہ ہو جائے گا۔ اس پر تو نیا نیا سیمنٹ ہوا ہے۔ سچ سیلاب نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ آپ لوگ اچھے ہیں جو شہر کے اندر رہتے ہیں۔ ماسٹر جی کیا گورنمنٹ سیلاب کو روک نہیں سکتی؟"

ماسٹر جی تو آج فرخندہ کی ہر بات پر مسکرا رہے تھے اور خوشی خوشی جواب دے رہے تھے۔ وہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فرخندہ کو سمجھانے لگے کہ سیلاب کیوں آتے ہیں اور ان کا علاج کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر فرخندہ ان کی بات سننے کی بجائے یہ سوچ رہی تھی کہ ان سے

مطلب کی بات کیسے کرے؟ حرف مطلب زبان پر کیونکر لائے؟ اپنے معاشقے کا ذکر کرتے ہوئے اسے حیا بھی دامن گیر تھی اور یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ماسٹر جی اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ وہ تو اسے بڑی شریف اور نیک لڑکی سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ اسی لئے ادھر ادھر کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ذرا خاموش ہوئی تو ماسٹر جی سے وہ بات کہہ دے گی جسے وہ ہر حالت میں کہنا بھی چاہتی تھی اور کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا فرخندہ کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب کیا ہوا کہ فرخندہ کی امی آ کر اندر بیٹھ گئیں اور ماسٹر جی سے فرخندہ کی پڑھائی اور سیلاب کی افواہوں پر باتیں شروع کر دیں۔ فرخندہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ وقت کے لئے اسے اپنی ذہنی کشمکش سے نجات مل گئی تھی۔ اس نے سر پر رکھا ہوا بوجھ اتار کر نیچے رکھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ والدہ کی موجودگی سے پریشان بھی ہو گئی اور چاہنے لگی کہ اس کی والدہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے چلی جائے۔ وہ بے قراری سے صوفے پر پہلو بدلنے لگی۔ کاپی پر پنسل سے لکیریں کھینچ کھینچ کر فال نکالنے لگی۔ اگر اب کے ایک لکیر فالتو بچ رہی تو میں ضرور ماسٹر جی سے بات کر دوں گی۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ماسٹر جی کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ وہ میرے استاد ہیں۔ میں اپنی زندگی کے ہر مسئلے میں ان کا مشورہ لے سکتی ہوں۔ جو بات میں اپنے والد سے نہیں کہہ سکتی ان کے سامنے اس کا بلا تامل اظہار کر سکتی ہوں۔ استاد کا درجہ تو باپ سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ استاد تو ایک طرح کا ساتھی ہوتا ہے جو اپنے شاگرد کی انگلی پکڑ کر زندگی کے نشیب و فراز میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ پھر میں کیوں جھجک رہی ہوں؟ مجھے اب فضول سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے ------ ادھر جب وہ ایک ساتھ کھینچی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکیروں کے جوڑے کاٹ چکی تو ایک لکیر بچ رہی۔ بس ٹھیک ہے۔ خدا کی مرضی بھی یہی ہے۔ اور پھر میں کوئی عشق بازی کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ماسٹر جی کو استعمال نہیں کر رہی۔ میں تو مسعود کو شادی کا پیغام بھجوانے کے لئے لکھ رہی ہوں۔ فرخندہ نے بڑے اعتماد اور سبک دلی سے یوں ماسٹر جی کی طرف دیکھا جیسے ابھی ان سے سب کچھ کہہ دے گی۔ اتنے میں اس کی والدہ اٹھ کر واپس رسوئی میں چلی گئیں۔ ماسٹر جی نے سگریٹ راکھدان میں انگلیوں سے دبا کر بجھایا اور چھتری اٹھا کر بولے۔

"میں چلتا ہوں"

فرخندہ بے تاب سی ہو کر اٹھی۔ دوسرے کمرے میں جھانک کر آنگن والے درخت

تک دیکھا کہ کوئی نہیں۔ پھر جلدی سے واپس آکر صوفے پر بیٹھ گئی اور دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر کہنے لگی۔

"ذرا ٹھہر جائیے۔ مجھ آپ سے کام ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے کتاب کھول کر آگے رکھ لی اور سر جھکا لیا۔ ماسٹر جی اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے۔ وہ تو اس خیال ہی سے نہال ہو گئے کہ اب وہ فرخندہ کا ایک کام کریں گے۔ جس طرح بھوکا یہ پوچھے کہ کھانا کہاں ہے؟ اسی طرح ماسٹر جی نے پوچھا۔

"کیا کام ہے فرخی؟ بتاؤ ناں؟"

فرخندہ نے قفل توڑ دیا تھا۔ اب کواڑ کھولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آخر اس نے ایک پل میں ہزار طرح سے اپنے آپ کو تقویت دے کر راضی کر لیا اور نظریں جھکاتے جھکاتے بولی۔

"ماسٹر جی اگر میں آپ کو کسی جگہ پہنچانے کے لئے کوئی شئے دوں تو آپ اسے پہنچا دیں گے؟" اس کا جواب بھی لانا ہوگا۔۔۔۔"

ماسٹر جی نے جلدی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ کیا پہنچانا ہے؟"

فرخندہ نے ہونٹوں پر خشک زبان پھر کر آہستہ سے کہا۔

"ایک خط"

اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ اگرچہ گلی میں بچے کھیل کود میں شور مچا رہے تھے۔ اور باہر آنگن میں بلقیس چارپائیاں گھسیٹ گھسیٹ کر بچھا رہی تھی لیکن ماسٹر جی اور فرخندہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے کانوں میں "ایک خط" "ایک خط" "ایک خط" کے الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ ماسٹر جی پوری طرح جان گئے تھے کہ انہیں وہ خط کسے دینا ہوگا۔ انہیں ایک دم دھکا سا لگا۔ جیسے کسی نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر پیچھے ہٹا دیا ہو اور ان کی عینک سڑک پر گر پڑی ہو اور چھتری ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو اور وہ درد کرتے سینے پر ہاتھ رکھے ہکے بکے ہو کر دھکا دینے والے کا منہ تک رہے ہوں۔ ان کے چہرے کی لکیریں ایک ایک کر کے گہری ہوتی گئیں۔ ان کا لاغر دبلا پتلا چہرہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک نامعلوم دھبہ سا نظر آنے لگا۔ پھیکی بے رس آنکھیں عینک کے پیچھے ساکت سی ہو گئیں اور بے رنگ ہونٹوں کے کنارے بڑی ہی عاجزی، بے بسی اور محرومی کے احساس کے ساتھ ایک طرف کو سمٹ سے

گئے۔ انہوں نے ہاتھ میں دبائی ہوئی چھتری پہلے کی طرح میز کے ساتھ لگا دی اور بے جان ہاتھ صوفے کے بازو پر ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کی طرح ڈال دیئے۔ فرخندہ نے چپکے سے کاپی میں سے بند لفافہ نکالا اور ماسٹر جی کے ہاتھ کے پاس رکھ کر باہر نکل گئی۔ نیلے رنگ کا بند لفافہ جس پر مسعود کے کالج کا پورا پتہ لکھا تھا ماسٹر جی کے ہاتھ کی انگلیوں کے پاس ہی صوفے کے چوڑے بازو پر پڑا تھا۔ گویا ایک سانپ تھا جو اپنا پھن اٹھائے ماسٹر جی کو سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے ڈر رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں اکبر کی آواز سنائی دی۔ ماسٹر جی نے جلدی سے لفافہ اٹھا کر قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔ اکبر نے اندر آکر ماسٹر جی کی خیر و عافیت پوچھی اور الماری کھول کر کوئی شئے تلاش کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑبڑاتے بھی جا رہا تھا۔

"اس گھر میں ذرا کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے پھر بھلا کہاں مل سکتی ہے۔ کمال ہے میرے کمرے سے کلاک کا ٹوٹا ہوا سپرنگ نیچے بیٹھک میں آ گیا اور اب وہ بھی نہیں مل رہا۔"

ماسٹر جی آہستہ سے اٹھے انہوں نے حسب عادت سلام کیا اور جالی دار دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گئے۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ بکائن کے درختوں میں شام کا بسیرا لینے سے پہلے چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ بچے ٹریلو کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان کی بھاگ دوڑ سے گلی میں مٹی اڑ رہی تھی۔ گلی کے سرے پر جہاں بازار شروع ہوتا تھا۔ ایک دھندلا سا بلب کھمبے کے اوپر جل رہا تھا۔ اگرچہ فضا میں گرمی نہیں تھی تاہم ہوا بند تھی اور کھیتوں کی طرف سے مرطوب بو آ رہی تھی اور مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ ماسٹر جی کے ایک ہاتھ میں چھتری تھی۔ دوسرا ہاتھ لفافے والی جیب پر رکھا تھا۔ اور ذرا جھک کر قدم قدم چل رہے تھے۔ ایک جگہ اندھیرے میں انہیں ٹھوکر لگی اور گرتے گرتے بچے۔ ان کی آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ گئے انہوں نے جیب پر رکھا ہوا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ اپنے پہلوٹھی کے بچے کی لاش دفنانے جا رہے ہوں۔ بازار میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور تانگے سائیکل پر لوگ آ جا رہے تھے۔ فضا گرد آلود تھی۔ گوالوں کے باڑے میں ایک بھینس ڈکرا رہی تھی ایک فیشنی تانگہ زناٹے سے گزر گیا۔ کوچوان سانٹا پہیے میں اڑائے تراتڑ مشین گن سی چلا رہا تھا۔ ماسٹر جی کو گندے نالے کے پل پر سے گزرتے ہوئے اپنے جسم میں

کمزوری اور نقاہت محسوس ہوئی انھیں یوں لگا جیسے سانپ نے اپنے کام کر دیا ہو اور اب زہر ان کی رگ وپے میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہو۔

ساری رات فرخندہ کا محبت نامہ ماسٹرجی کے ٹرنک میں پڑا رہا۔

ماسٹرجی کا دل بجھ سا گیا تھا۔ انھیں رات بھر نیند نہ آئی۔ بیوی کے سر میں درد تو نہیں تھا۔ البتہ گردن کا پٹھا اکڑ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہائے کر بیٹھتی تھی۔ ماسٹرجی اس کے پہلو میں کھاٹ پر پڑے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ آدھی رات کو بیوی کی تکلیف بڑھ گئی۔ انھوں نے اٹھ کر بیوی کی گردن پر تیل کی مالش کر کے گرم روئی کی ٹکور کی اور کپڑا باندھ دیا۔ بیوی کو نیند آگئی مگر ہمارے ماسٹرجی جاگتے رہے ان کا خیال کبھی فرخندہ کی طرف جاتا جو اپنے وسن پورے والے مکان کی چھت پر سو رہی ہوگی۔ اس کا بازو آنکھوں پر ہوگا۔ منہ تھوڑا سا کھلا ہوگا۔ کبھی وہ اس خوش نصیب نوجوان کا خیال کرتے جس سے فرخندہ محبت کرتی تھی اور جس کے نام لکھا ہوا محبت بھرا خط ماسٹرجی صبح اسے دینے جارہے تھے۔ وہ بھی اپنی گھر میں آرام سے سو رہا ہوگا۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔ پھر انہیں نیند کیوں نہیں آرہی؟ انھوں نے سوچا کاش وہ مسعود کی جگہ سو رہے ہوتے اور صبح ایک ادھیڑ عمر کا پریشان حال آدمی فرخندہ کا خط لے کر ان کے پاس آتا اس خیال کے آتے ہی ماسٹرجی کا سارا جسم چارپائی پر پڑے پڑے بے حس اور منجمد ہوگیا۔ انہیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور جسم کے کسی حصے کا احساس ہی نہ رہا۔ جیسے وہ مرگئے ہوں۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں پتھرا سی گئیں یہ انتہائی مایوسی اور بے کسی کا عالم تھا۔ انھیں اپنے آپ پر قبرستان میں پڑے ہوئے ایک بنچ کا گمان ہوا جس پر بیٹھا کوئی نوعمر جوڑا بوس وکنار میں مشغول ہو انھوں نے ایک جھرجھری لی اور کانپتی ہوئی پلکیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کا گرم پانی پھیل گیا۔ ماسٹرجی کے منہ سے ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ انھوں نے بازو ماتھے پر رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگے پھر جیسے اچانک اس اندھیرے کی کسی جھری میں سے روشنی کی ایک کرن پھوٹ نکلی۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ فرخندہ کی خوشی کے لئے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ فرخندہ نے ان پر بھروسہ کر کے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ وہ تو ایک پُل ہے جو دریا کے دونوں کناروں کو آپس میں ملا رہا ہے۔ ان کا دل ایثار، قربانی اور محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کے عظیم جذبات سے لبریز ہوگیا۔

پہلے انھیں اپنا سینہ بالکل خالی اور کھڑکھڑ کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اب ایک دم انھیں یوں معلوم ہوا گویا ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ اور پرجوش خون گردش کرنے لگا ہو۔ فرخندہ کا ہنستا ہوا دلفریب اور معصوم چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انھوں نے اسے اپنے لئے چائے کی پیالی بناتے دیکھا۔ فرخندہ نے اپنے جوڑے میں سے کھلا ہوا گلاب اتار کر ماسٹرجی کے کوٹ پر لگا دیا ہے۔ انھوں نے خیال ہی خیال میں فرخندہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور یوں مسکرا دیئے جس طرح کوئی بچہ سوتے میں اپنے آپ ہی مسکرا دیتا ہے۔ اس کے بعد انھیں نیند آگئی۔

اگلے روز وہ خط لے کر مسعود کے کالج پہنچ گئے۔ مسعود کلاس میں تھا ماسٹرجی کالج کے باغ میں ایک جگہ گھاس پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں گھاس کا ٹوٹا ہوا خوشہ مروڑ رہے تھے۔ کلاس ختم ہوئی لڑکے کتابیں اٹھائے برآمدے میں سے گزرنے لگے۔ ماسٹرجی باغ میں سے اٹھ کر برآمدے میں آگئے۔ انھوں نے مسعود کو سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے صاف پہچان لیا۔ یہی وہ لڑکا تھا جسے انھوں نے اس روز چڑیا گھر کے باہر فرخندہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ خوش باش خوش شکل زندگی کی مسرتوں اور ہماہمی سے بھرپور اس سے مذاق کرتا، اس پر ہنستا، اس پر پھبتی کستا۔۔۔۔۔ زندہ و پرخون۔ رواں، دواں ۔۔۔۔۔ ماسٹرجی برآمدے میں ایک ستون کے پاس کھڑے اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ تو فرخندہ اس سے محبت کرتی ہے۔ واقعی یہ فرخندہ کی محبت کا مستحق ہے ماسٹرجی کو مسعود پر پیار آنے لگا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیں۔ اس کی کتابیں اٹھا کر پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جائیں۔ اس کی خدمت کریں۔ اس کے کپڑے دھوئیں۔ جوتے پالش کریں۔ اسے اپنے ہاتھ سے نہلایا کریں۔ اور جب وہ فرخندہ سے ملاقات کرنے جائے تو دور رہ کر اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی شخص شور مچا کر ان کی باتوں میں مخل تو نہیں ہو رہا۔

مسعود اپنے دوستوں میں کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کتابیں اٹھائے ایک طرف کو چل دیا۔ ماسٹرجی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ برآمدہ جہاں ختم ہوگیا تھا وہاں دو تین سیڑھیاں اترنے کے بعد گھاس کا چھوٹا سا قطعہ آجاتا تھا۔ جب مسعود اس قطعے کو عبور کرنے لگا تو ماسٹرجی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مسعود نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

ماسٹرجی اس گورے گورے چہرے پر کھلے ہوئے ہونٹوں، چمکیلی آنکھوں اور ناک کے پاس والے تل کو دیکھ رہے تھے- یہ فرخندہ کے محبوب کا چہرہ ہے- یہ فرخندہ کے خوابوں کا شہزادہ ہے- ماسٹرجی نے بچوں کی طرح چاروں طرف دیکھا اور پھر جیب سے لفافہ نکال کر مسعود کو دے دیا- مسعود نے لفافے پر لکھی ہوئی فرخندہ کی تحریر پہچان لی- وہ سمجھ گیا کہ کوئی نئی مصیبت اس کے خیر مقدم کو آگے بڑھ رہی ہے- لیکن وہ اس قسم کی مصیبتوں کا عادی تھا- اس نے چٹکی مار کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور لفافہ چاک کر کے خط پڑھنے لگا- وہ ماسٹرجی کے وجود سے بے خبر خط پڑھ رہا تھا- اور ماسٹرجی مسعود کے چہرے کو غور سے دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ خط میں کیا لکھا ہے؟ ایک دو بار مسعود نے ہونٹ سکیڑ لیے اور انھیں افسوس ہوا کہ فرخندہ نے ایسی بات کیوں لکھ دی جسے پڑھ کر مسعود کو رنج ہوا- ایک بار مسعود ہولے سے مسکرایا ماسٹرجی بھی مسکرانے لگے اور یوں شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا جیسے وہ فقرہ فرخندہ کی بجائے انھوں نے ہی لکھا ہو- خط پڑھ کر مسعود نے لفافے میں ڈال کر نیلی بش شرٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ماسٹرجی کی طرف گہری نظر سے دیکھ کر بولا-

"بابا! تم یہاں باغ میں بیٹھو میں ابھی اس کا جواب لکھے دیتا ہوں-"

"ماسٹرجی وہیں ایک طرف ہو کر انار کے ایک درخت کے سائے میں گھاس پر بیٹھ گئے- انار کی ٹہنیوں پر کچے کچے انار لٹک رہے تھا- نچلی شاخوں میں مکڑے نے بڑا سا گول گول جال بُن رکھا تھا اور خود ایک طرف ہو کر بیٹھا اپنے شکار کا انتظار کر رہا تھا- مسعود لائبریری میں جا کر بیٹھ گیا اور فرخندہ کو خط کا جواب لکھنے لگا- اس نے اب کے بھی حسب معمول ٹال مٹول سے کام لیا- اس نے لکھا-

"----- تمھیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالکل نہیں گھبرانا چاہیے- ایسے واقعات تو محبت میں ہوتے ہی رہتے ہیں- شادی کی بات چیت ہو رہی ہے تو پھر کیا ہوا- کوئی شادی تو نہیں ہو رہی- میں تو ہر وقت تیار ہوں -مگر اس کا علاج کیونکر ہو کہ والدہ ابھی تک کراچی میں ہیں- واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہیں - اگر وہ یہاں ہوتیں تو میں ان سے بات کر کے انھیں تمھارے گھر بھیج سکتا تھا- لیکن ان کی عدم موجودگی میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا- دیکھو تم حوصلہ مت ہارو اور پھر تم فی الحال گھر والوں سے کہہ دو کہ ابھی تم شادی نہیں کرنا چاہتیں کیونکہ ابھی تمھیں پڑھنا ہے- سو طرح کے بہانوں سے کام چلایا جا سکتا ہے- جہاں تک میرا

تعلق ہے- میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا-----"

اس کے بعد ضروری تھا کہ کچھ محبت کے مزیدار جملے لکھے جائیں مگر مسعود کو اس وقت ایک بھی یاد نہیں آ رہا تھا- اس نے قریب ہی پڑا ہوا اردو کا ایک رسالہ کھولا- اس میں کوئی افسانہ تھا جس میں ایک عورت اپنے عاشق سے پریم بھری باتیں کر رہی تھی- مسعود نے اس میں سے کئی ایک چلبلے سے فقرے نقل کر کے فرخندہ کو لکھ دیئے اور آخر میں اس کے ہونٹوں پر پیار کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے خط بند کر دیا- اس نے لائبریرین سے خالی لفافہ لیا- خط اس میں ڈال کر لفافہ بند کیا اور باہر آ گیا- ماسٹرجی اسی طرح انار کے درخت کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور جال میں پھنسی ہوئی مکھی کو تنکے کی مدد سے باہر نکالنے میں مصروف تھے ___ ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھا ہوا پریشان مکڑا غصے کے عالم میں ماسٹرجی کو تک رہا تھا- انھوں نے مسعود کو برآمدے میں دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے- مسعود نے قریب آ کر لفافہ ماسٹرجی کو دیا اور مسکرانے لگا-

"اپنی بی بی جی سے ہمارا زبانی سلام بھی کہنا-"

وہ ماسٹرجی کو ان کا گھریلو ملازم سمجھ بیٹھا تھا- شائد یہی وجہ تھی کہ جب ماسٹرجی خط جیب میں محفوظ کر کے جانے لگے تو اس نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر ماسٹرجی کی مٹھی میں پکڑا دیا- اسی سے پیشتر کہ ماسٹرجی کچھ سمجھ سکیں مسعود جا چکا تھا- روپے کا نوٹ ماسٹرجی کی ہتھیلی میں تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اس نوٹ کو دیکھ رہے تھے اور کبھی مسعود کو جو سڑک پر کالج کی دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا- ماسٹرجی ہکا بکا ہو کر رہ گئے- بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ بھاگ کر سڑک پر آئے اور دوڑتے ہوئے مسعود کے پاس پہنچے- انھوں نے پیچھے سے آواز دے کر مسعود کو کھڑا کر لیا- جب وہ قریب آئے تو ان کا دم پھول رہا تھا- چہرہ زرد ہو گیا تھا- انھوں نے روپے کا نوٹ مسعود کو واپس کرتے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا-

"میں فرخندہ کا ماسٹر ہوں - میں اسے پڑھایا کرتا ہوں- اس کی ضرورت نہیں-" اتنا کہا اور گھوم کر پہلے سڑک کی بائیں جانب چلنے لگے، پھر دائیں طرف مڑ گئے مسعود شرمندہ سا ہو کر کچھ دیر رکا رہا- پھر ہنسا اور نوٹ کو پتلون کی چھوٹی جیب میں ٹھونس کر سیٹی بجاتا کافی ہاؤس کی طرف چل پڑا-

تیسرے پہر جب ماسٹرجی فرخندہ کو پڑھانے گئے تو محبت کی ماری پاگل لڑکی ان کے انتظار میں اپنے محبوب کے خط کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی۔ جب اس نے ماسٹرجی کو گلی میں مڑتے دیکھا تو دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا اور دوپٹہ لے کر بھاگتی ہوئی بیٹھک میں آگئی۔ جلدی جلدی کتابیں میز پر رکھ کر وہ صوفے پر کاپی کھول کر پہلے ہی سے مودّب ہو کر بیٹھ گئی۔ گویا اب کے امتحان میں اوّل نمبر پاس ہونے کا عہد کیے ہوئے ہو۔ ماسٹرجی بیٹھک میں داخل ہوئے تو فرخندہ نے سلام کیا اور خاموش ہو کر نظریں جھکائے رکھیں۔ اسے شرم بھی بہت آرہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ فوراً ماسٹرجی سے خط کا جواب مانگ لے شرم نے ہونٹوں پر تالا ڈال رکھا تھا۔ ماسٹرجی اس کی طرف دیکھ کر خوشی سے مسکرائے۔ اس باپ کی طرح جو اپنے بچے کے لئے تھیلے میں سی بہت سے کھلونے لے کر آیا ہوں اور اب بچے کی بے تابی کا مزہ لے رہا ہو۔ اس وقت انھیں اپنا آپ بڑا اہم محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ انھوں نے فرخندہ کے لیے ایک ایسا کام کیا تھا جو اس کے گھر میں اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر یہ بات ان کے لیے کیا کم تھی کہ فرخندہ ان کی راہ دیکھ رہی تھی اور دن بھر اس کا خیال ماسٹرجی کی طرف ہی لگا رہا تھا۔ انھیں تو گویا اپنی منزل کا نشان مل گیا تھا۔ ماسٹرجی نے پڑھائی کی دو ایک باتوں کے بعد ادھر ادھر غور سے دیکھا اور جیب سے خط نکال کر فرخندہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ فرخندہ نے جھٹ اسے اپنے دوپٹے میں چھپا لیا۔

ماسٹرجی کو یوں لگا جیسے انھوں نے ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ ان کی حالت تو اس بچے سے ملتی جلتی تھی جس نے پہلی بار باغ میں گھس کر پھل چرایا ہو۔ وہ بڑے خوش خوش تھے اور جوش کا یہ عالم تھا کہ عینک کے پیچھے آنکھیں بڑی ہوشیاری سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی تھیں کہ کہیں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا فرخندہ نے غسل خانے میں جا کر خط پڑھا۔ ماسٹرجی اکیلے بیٹھک میں بیٹھے رہے اب وہ پھر ایک دم اداس سے ہو گئے تھے۔ انھیں اپنا آپ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کمرہ جہاں ایک رات پہلے لڑکیاں بیٹھی ڈھولک پر شادی کے گیت گا رہی ہوں۔ لیکن اب سوائے الٹی پڑی دری اور باسی پھولوں اور ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کانچ کے اور کچھ نہ ہو۔ یا جیسے وہ ریل کا ڈبہ جس میں کچھ ہی دیر پہلے زندہ دل ہنس مکھ سواریاں سفر کر رہی تھیں۔ لیکن جواب بالکل ویرانی کے عالم میں ریلوے شیڈ میں ایک طرف دھوپ میں کھڑا سنسنا رہا ہو۔ جب فرخندہ واپس کمرے میں آئی تو اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر

ماسٹرجی کی اداسی میں پریشانی کا اضافہ بھی ہو گیا۔ فرخندہ افسردہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نا امیدیوں کے سائے اتر آئے تھے۔ وہ سر پر دوپٹہ لے کر خاموشی سے اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور کتاب کھول کر ماسٹرجی کو سبق سنانے لگی۔ اس کی آواز بوجھل اور پژمردہ تھی۔ ماسٹرجی کا دل خون ہو گیا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ اداسی کیوں؟ کیا اس نے کوئی بری خبر لکھ دی ہے؟"

فرخندہ نے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسو روک کر صرف اتنا ہی کہا۔

"نہیں"

اور پھر کتاب پر نظریں جھکا دیں۔ ماسٹرجی نے اس کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی سرد آہ سن لی تھی۔ وہ بے چین ہو گئے۔ انھوں نے دو تین بار بے قراری سے صوفے پر پہلو بدلا۔ بے معنی انداز میں کبھی دیواروں کو کبھی چھت کو دیکھا پھر رکتے رکتے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں کہا۔

"مجھ سے کوئی بات چھپاؤ نہیں میری بچی۔ میں تمھارا دوست بھی ہوں اور صلاح کار بھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جسے لوگ کارنامہ کہہ کر یاد رکھ سکیں۔ کبھی کسی پنچایت کا صدر نہیں بنا۔ مجھ سے کبھی کسی نے اپنے معاملے میں مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ میں کسی کو مشورہ دے ہی نہیں سکتا۔ تم یوں سمجھ لو کہ دوسروں کے مسئلے کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میں کسی بھٹکے ہوئے کو شاید راستہ کبھی نہیں دکھا سکتا۔ کیونکہ سیدھے راستے کا مجھے بھی علم نہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے۔ کہ اس کے ساتھ بھٹک کر اس کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہوں۔ تمھیں غمزدہ دیکھ کر میرا دل پریشان ہو گیا ہے۔ میں شاید تمھارے غم کا علاج نہ کر سکوں۔ لیکن تمھارا دُکھ درد ضرور بٹا سکتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے غم میں شریک نہیں کرو گی؟"

فرخندہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ لیں۔ اور مٹھی میں دبایا ہوا مڑا تڑا خط ماسٹرجی کو دے دیا۔

"اسے پڑھ لیجیے۔"

چُرمُرا کاغذ فرخندہ کی مٹھی کی حرارت سے گرم ہو رہا تھا۔ اگر ماسٹرجی اکیلے ہوتے اور اس خط کو ہونٹوں کے پاس لے جاتے تو اس میں سے ضرور حنا کی خوشبو آ رہی ہوتی۔ کیونکہ

اس روز فرخندہ کے ہاتھوں پر مہندی کا تیز رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ماسٹرجی نے کاپی میں رکھ کر سارا خط پڑھ ڈالا۔ وہ اتنے زیادہ معاملہ فہم اور زیرک نہیں تھے۔ لیکن مسعود کا خط پڑھ کر وہ بات کی تہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے خط واپس فرخندہ کو دے دیا اور سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔ تو گویا فرخندہ اس نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہے اور ادھر خالد نے بھی شادی کا پیغام بھجوا رکھا ہے۔ انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ بات یہاں تک پہنچ گئی ہوگی یہ تو بڑا سنجیدہ مسئلہ ہو گیا تھا۔ اس پر تو بڑی محتاط سوچ بچار کی ضرورت تھی پہلے تو وہ مسعود کی خوش بختی پر رشک کرتے رہے۔ پھر انھیں حیرت ہوئی کہ مسعود ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ کیونکہ خط کے مضمون سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی تھی۔ اگرچہ مسعود نے اصل بات کو چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس وجہ سے فرخندہ افسردہ تھی اور ماسٹرجی متفکر تھے۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ کیسا نوجوان ہے جو گھر پر دستک دیتی خوش نصیبی کا اٹھ کر خیر مقدم نہیں کر رہا۔ بلکہ الٹا اس سے بچنے کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ پھر انھوں نے سوچا ہو سکتا ہے اس کی والدہ سچ مچ ہی کراچی میں ہو۔ کیونکہ جس شخص سے فرخندہ محبت کرتی ہو اسے اور کیا چاہیے۔ انھوں نے کہا۔

"کیا تمھیں یقین ہے فرخندہ کہ مسعود کی امی کراچی میں نہیں؟"

"فرخندہ نے گہرا سانس کھینچ کر کہا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ یہیں ہیں۔ مسعود کو اب مجھ سے پہلے ایسی محبت نہیں رہی۔ وہ مجھ سے دور بھاگنا چاہتا ہے۔ اب اس کا دل بھر گیا ہے۔"

ماسٹرجی جیسے خود بخود بڑبڑائے۔

بد نصیب ہے۔ اور نہیں تو کیا؟

پھر انھوں نے ہوا میں جیسے کسی شیشے کو پرے ہٹاتے ہوئے ہاتھ لہرایا اور انگلیاں ماتھے پر رکھ کر سر ایک طرف کو جھکا دیا۔ کمزور و ناتواں سینے میں تھکا ہارا زخمی دل بوجھل ہو کر لٹک سا گیا۔ یہ ایک بڑی ہی غم ناک محویت تھی جس کی گہری تہ میں چھپے ہوئے، سلگتے ہوئے ارمانوں کے سسکیاں لینے کی درد بھری آوازیں ابھر رہی تھی۔ فرخندہ کاپی پر ایک نظم کا ملخص لکھ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں چل رہی تھیں اور ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اسے اپنے ماسٹر سے پہلے سے بڑھ کر محبت ہو گئی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ ماسٹرجی تو اسے اپنے باپ سے بھی

بڑھ کر چاہتے ہیں۔ جب اس نے ماسٹرجی کو ماتھے پر ہاتھ رکھے ایک طرف سر جھکائے آنکھیں بند کیے پڑے دیکھا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔ ایک اعتبار سے اس کی خود پسندی کی تسکین بھی ہوئی کہ اس کے غم سے کوئی دوسرا شخص بھی نڈھال ہے۔ مگر وہ ماسٹرجی کو کبھی دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اب اس کے دل میں ماسٹرجی کی قدر دگنی ہو گئی تھی اور وہ ان کا بے حد احترام کرنے لگی تھی اس نے کاپی بند کر کے کہا۔

آپ پریشان نہ ہوں ماسٹرجی آپ کیوں غمگین ہو گئے۔ مجھے تو یہ دکھ سہنا ہی ہوگا۔"

ماسٹرجی نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے متورم معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے جیب سے سگریٹ نکال کر اسے دیا سلائی سے جلایا اور آہستہ آہستہ پیتے ہوئے بولے۔

"سوچتا ہوں میری زندگی کس کام کی اگر میں تمھارے کام نہ آسکا۔ میں تو ویرانے میں ایک کنواں ہوں جس پر رہٹ نہ لگا ہو۔ میری ذات سے کبھی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا۔ کبھی کسی نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ جیسا دس سال پہلے تھا ویسا ہی آج ہوں اور ایسا ہی دس سال بعد رہوں گا۔ میں پیدا ہوا تھا تو آسمان پر کسی نئے ستارے نے جنم نہیں لیا تھا۔ کہیں آتش بازی کے گولے نہیں چھوٹے تھے۔ جب مر جاؤں گا تو کہیں کوئی آنکھ نمناک نہیں ہوگی۔ کیونکہ میرا کوئی ہے ہی نہیں جو مجھے روئے۔ میرے لئے غمگین ہو۔ لوگ بھول جائیں گے کسی قبر پر میرے نام کا کتبہ نہ ہوگا۔ کسی عمارت کے پتھر پر میرا نام کندہ نہ ہو گا۔ تاریخ مجھے کبھی یاد نہیں رکھے گی۔ پھر میں کس لئے آیا تھا۔ بھلا کیا میرے بغیر اس دنیا کا کام نہیں چل سکتا؟ کیوں فرخندہ میں سچ ہی کہہ رہا ہوں نا؟"

فرخندہ کا دل ماسٹرجی کے احترام سے بھر گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو جھلکنے والے تھے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ماسٹرجی! آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ آپ نہ ہوتے تو مجھے کون پڑھانے آیا کرتا؟ پھر میں کس کے لیے چائے بناتی؟ پھر گلاب جامن پھول میرے لئے کون لایا کرتا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میرا خط لے کر کون جاتا؟

ماسٹرجی کا دل بھر آیا۔ انھیں زندگی میں پہلی بار اپنی بے مائیگی اور بے حقیقی کا شدید احساس ہوا۔ انھیں اپنا ایک ایک داغ، ایک ایک غم، ایک ایک چوٹ یاد آنے لگی۔ عمر میں صرف ایک بار قدرت نے انھیں یہ توفیق دی تھی کہ وہ ایک ایسی ہستی کے لئے کچھ

کریں جس کی خاطر وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتے تھے اور اس میں بھی ناکام رہے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ منہ اٹھا کر اکیلے کسی اجنبی سرزمین کی طرف نکل جائیں اور پھر کبھی فرخندہ کو اپنی صورت نہ دکھائیں۔

"اگر-----------" ماسٹر جی کو اچانک ایک بات سوجھی۔ "اگر میں تمھارے والد صاحب سے اس بیاہ کی بات کروں تو کیسا رہے گا۔ وہ میری بات کو کبھی رد نہیں کریں گے۔"

فرخندہ نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ میری قسمت میں اگر مصیبت کی ٹھوکریں ہی لکھی ہیں تو انھیں کون ٹال سکتا ہے؟"

ماسٹر جی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ فرخندہ کی امی اندر آگئیں۔

"فرخی! بیٹی آج ماسٹر جی کو چائے نہیں دو گی کیا؟ چل جا کر اٹھا لا۔ رسوئی میں تیار پڑی ہے۔"

"اچھا امی"

فرخندہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کی والدہ ایک آدھ منٹ ماسٹر جی سے باتیں کرنے کے بعد اسلم کے کمرے میں جا کر اس کی میز کی جھاڑ پونچھ کرنے لگیں ماسٹر جی کمرے میں بالکل اکیلے رہ گئے۔ گلی میں شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ بچے روز کی طرح کھیلتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ ماسٹر جی کو ایک دم چکر سا آگیا۔ بیٹھے بیٹھے ان کا دماغ چکرایا۔ گویا تیزی سے گھومنے والے بھنور میں الجھ گئے ہوں اور نیچے ہی نیچے جا رہے ہوں۔ انھوں نے سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کیں تو چکروں کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اتنے میں فرخندہ چائے لے کر آگئی۔ انھوں نے اس سے پانی منگوا کر پیا تو کچھ حالت سنبھلی۔

۱۵

ایک روز شیخ صاحب شام کو دکان بند کر کے گھر آئے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ باورچی خانے میں کھانا کھانے بیٹھے تو فرخندہ کی والدہ نے اس کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ شیخ صاحب چپکے سے روٹی کھاتے اور اپنی بیوی کی گفتگو سنتے رہے۔ پھر جھولی میں گرے ہوئے روٹی کے بھوروں کو اٹھا کر چنگیر میں ڈال کر بولے۔

"یہ خرچ تو ایک نہ ایک روز پڑے گا ہی۔ ابھی جلدی کیا۔ لڑکی پہلے پڑھ تو لے۔"

فرخندہ کی ماں تیل والے چولھے کی کمانی گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

"سمن آباد والے آئے تھے۔ خالد کے لیے کہہ گئے ہیں۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" شیخ صاحب نے تشویش سے پوچھا۔

"میں نے کہا لڑکی کے باپ سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"اچھا کیا۔"

شیخ صاحب پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک ایک نوالے کو اس طرح جانفشانی سے چبا چبا کر کھا رہے تھے جیسے اس کا دودھ نکال دینا چاہتے ہوں حالانکہ ان کی کئی ایک داڑھیں اکھڑ چکی تھیں۔ ان کے بینگے ٹیڑھے گندے دانت نوالہ چبانے میں اور تیز فہم دماغ کاروباری نقطۂ نظر سے اس رشتے کا تجزیہ کرنے میں محو تھا۔ انھوں نے منٹوں میں پورے کا پورا حساب لگا لیا کہ اس شادی میں کہاں منافع ہوگا اور کہاں نقصان رہے گا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سمن آباد والے گھرانے میں بیٹی کی شادی کرنے سے انھیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ رہے گا۔ ایک وہ لوگ رشتے دار ہیں۔ ناک رکھنے کے لئے انھیں لڑکی کو جہیز زیادہ دینا پڑے گا۔ پھر ان کے ہاں شادی کے بعد دوہری رشتے داری ہو جائے گی اور وہ لوگ دونوں حیثیتوں سے شیخ صاحب کے گھر آیا کریں گے اور اپنی برتری کے لئے زیادہ خرچ کریں گے جس کے جواب میں انھیں بھی زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ علاوہ بریں خالد کا والد شیخ صاحب سے کم مالدار تھا۔ کیا تعجب ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ بے دھڑک شیخ صاحب سے قرض مانگ لے۔ اپنی بیٹی کے سکھ کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں قرض دینا ہی پڑے گا۔ فائدہ اگر

ہو گا تو صرف اتنا ہی فرخندہ اس گھر میں اجنبیت محسوس نہیں کرے گی۔ تو یہ تو بیٹی کے فائدے کی بات تھی۔ باپ کو اس سے کیا غرض؟ باپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

بیوی نے گلاس میں تازہ پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"لڑکا شریف ہے۔ ایم۔ اے میں پڑھ رہا ہے۔ چار پانچ سو سے کم کی ملازمت کیا ملے گی۔ اور پھر خاندان بھی اپنا ہے۔ اگر آپ کی بھی مرضی ہو تو ان کو ہاں کر دوں۔ فی الحال نکاح کر دیں گے۔ شادی دو ایک سال بعد ہو جائے گی۔"

شیخ صاحب گلے میں لٹکا ہوا خلال دانتوں میں پھیرنے لگے۔" بیوی! ابھی انھیں کوئی جواب نہ دو۔ کاروبار کا بڑا مندا ہے۔ شادی پر خرچ کہاں سے اٹھے گا؟۔

"لیکن فرخندہ کے لئے تو آپ نے رقم بنک میں جمع کروا رکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر کاروبار کا اتار چڑھاؤ بھی تو ہوتا رہتا ہے۔ میں نے پچھلے برس پانچ ہزار نکلوا کر اس کی باسمتی اور کالی مرچ خرید لی تھی۔ خیال تھا اب کے برس دونوں اجناس مہنگے داموں بکیں گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔"

"اور باقی تین ہزار کہاں گئے؟"

شیخ صاحب نے ذرا ترش ہو کر کہا۔

"تم تو انکم ٹیکس والوں کی طرح پوچھ گچھ کر رہی ہو۔ باقی تین ہزار کے میں نے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید رکھے ہیں۔ پانچ سال بعد رقم دگنی ہو جائے گی دگنی۔ آخر یہ سارے جتن اس گھر کے لوگوں کے پیٹ بھرنے کے لئے ہی تو کر رہا ہوں۔ پہلی بچی کی شادی کر کے کیا پا لیا ہے؟ وہ بھی سر پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ پانچ روپے روز تو ان دونوں ماں بیٹیوں کا خرچ ہے۔ تمہیں کیا خبر کمائی کس طرح کی جاتی ہے۔ خون پسینہ ایک ہوتا ہے تو کہیں جا کر تانبے کے پیسے کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ میں تو اپنی نوٹ بک پر پائی پائی کا حساب درج کرتا ہوں۔ کبھی اسے کھول کر دیکھو تو ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ یاد ہے چھ روز ہوئے کہ دو من لکڑیاں منگوائی تھیں اور صبح تم کہہ رہی تھیں کہ لکڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ فرخندہ کی ماں میں کوئی جادوگر نہیں۔ میرے پاس الہ دین کا جن نہیں ہے۔ غریب مزدور ہوں۔ جو دن بھر کماتا ہوں اسی سے بال بچوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ کیا سمجھی ہو؟"

انہوں نے بڑا سا ڈکار مارا اور یا اللہ فضل یا اللہ فضل کا ورد کرتے اپنی کوٹھڑی میں چلے

گئے۔ بھلا بیوی سے زیادہ ان کی خصلت کو اور کون جانتا تھا۔ فرخندہ کی امی کو بخوبی علم تھا کہ شیخ صاحب نے تین چار بنکوں میں اپنا حساب کھول رکھا ہے اور وقت پڑنے پر وہ جس وقت چاہیں ان بنکوں سے قرض لے سکتے ہیں۔ اور ان سے قرض لیتے رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شیخ صاحب مسجد کو سو روپے چندہ دے دیں گے مگر کسی فقیر کو ایک آنے کی روٹی لے کر کبھی نہیں دیں گے۔ کیونکہ چندے کی رقم کا چرچا اسی وقت سارے محلے میں ہو جائے گا اور فقیر کو کھلائی ہوئی روٹی کا سوائے ان کے، فقیر کے اور خدا کے اور کسی کو علم نہیں ہو گا۔ خدا نے انہیں دولت تو دے رکھی تھی۔ لیکن دولت خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں دیا تھا۔ یہ تو ایسی ہی بات تھی جیسے خدا کسی کو کھانے پینے کا سارا سامان تو مہیا کر دے مگر اس کے معدے سے بھوک چھین لے۔

سمن آباد والوں نے جب رشتے کے بارے میں دوسرا پھیرا مارا تو فرخندہ کی امی نے انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیا۔ وہ لوگ کچھ ناامید سے ہو کر واپس چلے گئے۔ یہ صورت حال فرخندہ کے لئے تو بڑی امید افزا تھی مگر خالد کے لئے پریشان کن اور ناقابل برداشت تھی۔ چونکہ خالد ایسے آدمی کو اپنے آپ پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا اس لئے اس کو یہی گمان گذرا کہ فرخندہ نے اس رشتے کی مخالفت کی ہو گی کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔ بلکہ مسعود سے محبت کرتی ہے اور اسی سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ تو گویا سیدھی انگلی گھی نہیں نکلے گا۔ خالد کو تو گویا ایک ہلکا سا اشارہ چاہئیے تھا۔ وہ فوراً منفی حربوں پر اتر آیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فرخندہ کو اب کچھ اس طرح اپنے قابو میں کرے گا کہ دوبارہ جب رشتے کی بات ہو گی تو وہ لوگ انکار نہ کر سکیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ خود شادی کا پیغام لے کر آ جائیں۔

خالد نے اب اپنا معمول بنا لیا کہ یونیورسٹی میں جاتے آتے اور سینٹرل کالج کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ وہ بڑی آسانی سے مسعود کے ساتھ دوستی گانٹھ سکتا تھا۔ لیکن اس طرح مسعود کے زیادہ محتاط ہو جانے کا احتمال تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ خالد فرخندہ کا خالہ زاد بھائی ہے۔ خالد نے مسعود کے ایک قریبی دوست کو اپنے اعتماد میں لے کر اسے اس کام پر لگا دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مسعود سے فرخندہ کا کوئی خط یا تصویر حاصل کر کے اسے لا دے۔ اس کے علاوہ وہ مسعود کی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیتا رہا۔ اور اس ٹوہ میں رہتا کہ کس روز فرخندہ سے ملتا ہے۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اتنی جلدی اور بغیر کوئی ٹھوس ثبوت ہاتھ آئے۔

فرخندہ کے سامنے اس کی خفیہ محبت کا بھید کیوں کھول دیا اور اسے مسعود سے ملنے سے کیوں روکا۔ یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ فرخندہ بڑی محتاط ہو گئی تھی اور مسعود سے ملنے کبھی نکلی ہی نہیں تھی۔ خالد کو ہمیشہ مسعود کے ساتھ ایک اور لڑکی نظر آتی۔ فرخندہ اب کبھی دکھائی نہیں دیتی۔ اب اس نے وسن پورے فرخندہ کے ہاں جانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ وہ تو اب اس گھر میں کوئی ٹھوس ثبوت جیب میں ڈالے فاتح کی حیثیت میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

دس پندرہ روز مسعود کو ملے بغیر گزر گئے تو فرخندہ کو بے چینی سی لگ گئی اس کا دل اداس ہو کر بوجھل ہو گیا۔ بدن ٹوٹ ٹوٹ کر درد کرنے لگا۔ اس کا مزاج چڑچڑا ہو گیا اور وہ بات بات پر لڑائی شروع کر دیتی۔ رات کو کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو پہروں تاروں کو تکا کرتی۔ پھر اس کا گلا خشک ہو جاتا۔ وہ اٹھ کر پانی پیتی۔ مٹھیاں بھینچ کر سینے سے لگا لیتی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے وہ دل میں طے کر لیتی کہ صبح پہلی فرصت میں مسعود سے ملنے جائے گی۔ صبح ہوتی تو یہ خدشہ اسے ڈرانے لگتا کہ اگر خالد راستے میں مل گیا تو کیا ہو گا؟ اسے کچھ وہم ہو گیا تھا کہ کمینہ فطرت خالد ہر وقت اس کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اگر اب کے اس نے فرخندہ کو مسعود کے ساتھ دیکھ لیا تو بڑا ہنگامہ ہو گا۔ لیکن ایک دن اس سے مسعود کی جدائی بالکل ہی برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے اپنی سہیلی انجم کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے ساتھ لیا اور انار کلی میں آ گئی۔ نیلے گنبد میں اس نے انجم کو اپنی ایک سہیلی کے ہاں بٹھلایا اور خود مسعود کے کالج کی چل پڑی۔ وہ ابھی یونیورسٹی لائبریری کے پاس ہی پہنچی تھی کہ اسے مسعود سائیکل پر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ گیٹ کے ذرا سا اندر ہو کر رک گئی۔ مسعود نے بھی اس کو دیکھ لیا تھا۔ وہی سیاہ برقعہ اور ذرا سا نقاب ایک پہلو کو اٹھا ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور آنکھوں میں شہوت انگیز منظر گھوم گئے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج کی دوپہر ایک جوان اور گل بدن لڑکی کے پہلو میں گزرے گی۔ مزا آجائے گا۔ اس نے سوچا اگر فرخندہ اسی طرح دس دس پندرہ پندرہ دنوں کے بعد ملنے آجایا کرے اور شادی وغیرہ کی بک بک کا کبھی ذکر نہ کرے تو وہ اس سے ساری عمر محبت کر سکتا ہے۔ اگر ہر عورت اسی طرح مرد کو ملے تو دنیا میں عورت مرد کا جھگڑا کبھی نہ ہوا کرے اور کوئی گھر برباد نہ ہو۔ مگر کیا کیا جائے صاحب----- یہاں تو کسی عورت کے سامنے محبت کا نام لو تو وہ آپ کے سر پر سوار ہو جاتی ہے اور ناک میں نکیل ڈال کر اچھے خاصے سمارٹ آدمی کو بار بردار جانور بنا دیتی ہے۔

مسعود نے سائیکل فرخندہ کے بالکل قریب لا کر کھڑی کر دی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے جھک کر اسے سلام کیا اور پرانے روایتی عاشقوں ایسے انداز میں بولا۔

"آج حسن بے پرواہ کو اپنے خانماں برباد عاشق کا کیسے خیال آ گیا؟"

دونوں گیٹ کے اندر دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف سے خوب گلے شکوے ہوئے۔ فرخندہ کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ مسعود نے بھی مصنوعی طور پر اداس ہو کر چہرہ لٹکا لیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی محبت کی قسمیں کھا کھا کر فرخندہ کو یقین دلایا کہ وہ اتنے دن اس کی یاد میں تڑپتا رہا ہے۔

"خدا کی قسم والدہ نے تو مجھے بے بس و لاچار کر کے رکھ دیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ جب تک وہ یہاں نہ آئیں میں کس کے ہاتھوں تمہارے ہاں شادی کا پیغام بھجواتا؟ والد صاحب نے تو عرصہ ہوا مجھ سے سلام دعا بھی چھوڑ رکھی ہے۔ ایک امی ہیں جو میری غمگسار ہیں۔ اور وہ دو ماہ سے کراچی میں پڑی ہیں۔"

"تم ان خط لکھ کر بلوا کیوں نہیں لیتے؟"

"تمہیں کیا معلوم میں چار خط لکھ چکا ہوں۔ ہر خط کے جواب میں یہی کہتی ہیں کہ بس اس اتوار کو گاڑی میں سوار ہو جائیں گے۔"

"آخر انہوں نے وہاں اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

مسعود ایک دم ٹھٹک گیا۔ وہ کیا جواب دے؟ کچھ نہ کچھ جلدی اور بڑی تیزی سے سوچنا چاہیے۔ اس نے پہلے کیا بہانہ بنایا تھا؟ اس کا حافظہ جواب دے رہا تھا۔ پھر فوراً ہی خیال آ گیا کہ بڑی بہن کی علالت کا بہانہ بنایا گیا تھا۔

"بس باجی کی بیماری نے ہمیں مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بیماری نے کچھ ایسا طول کھینچا ہے کہ والدہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ خیر اس پندرھواڑے میں تو ضرور ہی لاہور پہنچ جائیں گی۔ ان کے پہنچتے ہی میں اپنے بیاہ کی بات شروع کر دوں گا۔ تم بالکل نہ گھبراؤ-----"

فرخندہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"چلو چھوڑو----- تم صرف باتیں بناتے ہو۔ تمہیں اب مجھ سے وہ پہلی سی محبت نہیں رہی۔ تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ تم اب کسی دوسری محبت کی تلاش میں رہنے لگے

ہو۔ کاش مجھے تم سے اتنی محبت نہ ہوتی۔ میں بھی کسی دوسری جگہ اپنا دل لگا سکتی۔ لیکن اس دل کو کس طرح سمجھاؤں جو سوائے تمہارے اور کسی کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ جو ہر گھڑی تمہارا ہی نام لیتا ہے۔"

"مسعود نے بڑی خوش فکری کے انداز میں سگریٹ کے دھوئیں کا چھلا سا بنا کر منہ سے باہر پھینکا اور فرخندہ کو ساتھ لے کر لائبریری کے عقبی دروازے سے ہو کر یونیورسٹی کے باغ میں سے گزرتا مال روڈ پر آ گیا۔ فرخندہ نے ڈر کر کہا۔

"کہیں وہ کمینہ خالد نہ دیکھ لے۔"

مسعود ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"اس کی جرأت ہے کہ میرے سامنے آئے۔ میں نے اسے کئی بار یہاں دیکھا ہے۔ وہ بڑا مریل سا لڑکا ہے۔"

"اس سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔"

مسعود نے سائیکل کافی ہاؤس کے باہر رکھا اور ایک خالی تانگے والے کو آواز دی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے ابھی واپس جانا ہے۔"

"میری جان یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں جی بھر کر پیار بھی نہ کروں اور تم چلی جاؤ۔"

"نہیں نہیں مسعود مجھے جلدی ہے۔ میں تو انجم کو نیلے گنبد میں ٹھہرا کر آئی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

"گھبراؤ نہیں میری جان! بس کرشن نگر تک سیر کریں گے اور ابھی واپس آ جائیں گے۔"

"لیکن تمہیں کہنا کیا ہے۔"

"محبت کی باتیں۔"

"میں نہیں سنتی۔"

"مجھے تو کہہ لینے دو۔"

"تم بے وفا ہو۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

"تم صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔"

"ہاہاہا۔۔۔۔ میں کیک بھی بنا لیتا ہوں۔ کسی روز تمہیں کھلا دوں گا۔"

تانگہ آ گیا۔ گھوڑے کی گردن تنی ہوئی تھی اور ساز چمک رہا تھا۔ کوچوان نے نوجوان جوڑے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ گھوڑے کو پچکارا اور ایک ہاتھ پچھلی سیٹ کی گدی پر مار کر بولا۔

"بیٹھئے جناب۔"

دونوں تانگے میں سوار ہو گئے۔ مسعود نے کرشن نگر چلنے کو کہا اور گھوڑا دلکی چلتا مال روڈ پر چلنے لگا۔ کرشن نگر میں مسعود کا ایک دوست اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ مسعود اپنی دوسری محبوبہ کو لے کر دو ایک بار اس گھر میں جا چکا تھا۔ یہ مکان آبادی کے اخیر میں جا کر تھا۔ مسعود نے دستک دی۔ مسعود کا دوست گھر پر نہیں تھا۔ دروازہ اس کی بہن نے کھولا۔ مسعود نے اسے کہا کہ ذرا بیٹھک کھول دے۔

"شاپنگ کرنے گھر سے نکلے تھے۔ سوچا رشید کو بھی ملتے چلیں۔"

رشید یعنی مسعود کے دوست کی بہن اگرچہ نوعمر تھی لیکن وہ اس قسم کی تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کون سی شاپنگ کو نکلے ہیں اور کس غرض کے لیے اس کے بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ اس نے بیٹھک کھول دی اور اپنی طرف والے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ چھوٹے بھائی کو اس نے برف لانے کے لیے بھیج دیا اور خود کیواڑ کی جھری کے ساتھ لگ کر اندر کا تماشہ دیکھنے لگی۔

بیٹھک میں ایک پلنگ، کونے والا بڑا میز ایک کرسی اور زمین پر دری بچھی تھی۔ میز پر کتابیں اور ایک کھلا ہوا ریڈیو پڑا تھا۔ مسعود نے پہلے نمبر پر پنکھا لگا دیا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ فرخندہ کو اپنی کمزوری پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ کیوں ایک مخصوص جذبے سے متاثر ہو کر یہاں چلی آئی اور خوشی بھی ہو رہی تھی کہ وہ آخر مسعود کے پاس آ ہی گئی۔ اس نے برقعہ اتار کر کرسی پر رکھ دیا اور مسعود کے پاس پلنگ پر جا بیٹھی۔ مسعود نے فرخندہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبا لیا اور اسے چومنے لگا۔ فرخندہ آنے والی گھڑی کی کرب انگیز لذت سے کانپ اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ مسعود کا ہاتھ جھٹک کر وہاں سے بھاگ جائے اور پھر کبھی اس سے ملنے نہ آئے۔ بے چاری انجم اس کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔ وہ کیا کہے گی؟ وہ تو بہت پریشان ہو گئی ہو گی۔ مجھے فوراً بھاگ جانا چاہیئے۔ یہ سب کچھ بیچ میں چھوڑ کر ہی بھاگ جانا چاہیئے۔ کیا میں

ایسی ہی گئی گزری ہوں؟ آخر میں کیوں بار بار کی ذلت اٹھا کر بدنامی کا خطرہ مول لے کر اس شخص سے ملنے آجاتی ہوں؟ کیا سچ مچ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی؟ فرخندہ نے کرسی پر لٹکے ہوئے برقعہ کو دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک لڑکی تیزی سے پلنگ پر سے اٹھی ہے اس نے برقع پہنا ہے اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ہے۔ مسعود اب اس کے دائیں رخسار پر اپنی انگلی کی پوریں مس کر رہا تھا اور فرخندہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ مسعود نے اسے گرم جوشی سے آغوش میں دبوچا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دیئے۔ فرخندہ نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ آنکھ کے گوشے سے کرسی پر پڑے ہوئے برقعہ کو دیکھا اور پھر اپنے آپ کو اپنے محبوب کے، اپنے مرد کے حوالے کر دیا۔ اب اسے انجم، وسن پورے والا گھر، گھر کے ذمہ دار، عزت دار لوگ اور خالد اور ماسٹر جی اور اپنے سواد نیا کی ہر چیز گھیرے بادلوں کی دبیز تہوں میں گم ہوتے، گڈمڈ ہوتے دکھائی دیئے اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مدہوشی اور خود سپردگی کے عروجی لمحات میں مسعود نے پتلون کی جیب سے کوئی چیز نکالی۔ فرخندہ نے لیٹے لیٹے منہ دوسری طرف کر لیا اور پھر پردہ گر گیا۔ جو قوس و قزح کے خوشنما رنگوں سے زیادہ دلفریب اور نیاگرا آبشار سے زیادہ شوریدہ سر اور پرشور تھا۔ جس کی ایک جانب تلاطم خیز سمندر تھا اور دوسری طرف چیختے، چلاتے، چکراتے وحشت انگیز بگولوں سے بھرا ہو ویرانہ تھا۔ اس ویرانے میں کہیں کھنڈروں کے شکستہ محرابوں کے سایوں میں عریاں عورتوں کے خون آلود لاشے پڑے تھے اور کہیں سال خوردہ پتھروں سے چمٹی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ جن میں پھنسے ہوئے بڑے بڑے سرخ پھولوں کے نازک سینے چھلنی ہو رہے تھے۔

محبت کی طویل اور گرم جوش ہم آغوشیوں میں ایک بار پھر عہد و پیمان کئے گئے۔ ایک دوسرے کی نشانیاں لی گئیں۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی گئیں۔ جھوٹ سچ ایک دوسرے کی اشک شوئی کی گئی۔ بار بار منہ چومے گئے۔ ہتھیلیوں کے والہانہ انداز میں بوسے لیے گئے۔ گالوں کو سیب اور ہونٹوں کو گلاب کے نام سے پکارا گیا۔ جب گھڑی پل کا کھیل ختم ہو گیا تو فرخندہ بے دم سی ہو کر پلنگ پر پڑی رہی اور مسعود جیب سے کنگھی نکال کر بال درست کرنے اور کونے میں بار بار تھوکنے لگا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولا۔

"میرا خیال ہے اب واپس چلنا چاہیئے۔ تمہاری سہیلی کا تو دم نکلا جا رہا ہو گا۔"

فرخندہ کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ یوں سمٹے ہوئے تھے جیسے اس نے کوئی بڑی ہی بدذائقہ دوائی پی لی ہو۔ اسے انجم کا خیال آیا اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور برقعہ پہننے لگی۔ دوسری جانب دروازے کی جھری سے لگی ہوئی نوعمر لڑکی کا ناپختہ کچے انار ایسا بدن گرم ہو کر انگارہ ہو رہا تھا۔ ہونٹ جل رہے تھے اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ وہ ان لوگوں کو کپڑے وغیرہ پہن کر دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر جلدی سے پرے ہٹ گئی اور چارپائی پر بیٹھ کر چھوٹے بھائی کا سویٹر بننے لگی۔ مسعود نے دروازہ کھولا اور لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بھیا سے کہنا ہم نے بڑی دیر انتظار کیا تھا۔"

دونوں اس مکان سے باہر نکل آئے۔ فرخندہ بس پر بیٹھ کر واپس جانا چاہتی تھی مگر مسعود تانگے میں سیر کرتے ہوئے جانا چاہتا تھا۔ آخر وہ تانگے میں بیٹھ کر کافی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

اب ایسا ہوا کہ جس وقت فرخندہ مسعود کے ساتھ کرشن نگر کی طرف گئی اسی وقت خالد اورینٹل کالج کا چکر لگانے گیا تو اسے اپنے رازدار دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ اس نے مسعود کو ایک برقعہ پوش لڑکی کے ساتھ تانگے میں ٹاؤن ہال کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے کافی ہاؤس کے باہر جا کر سائیکل سٹینڈ پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ مسعود کا سائیکل وہاں کھڑا تھا۔ دونوں دوست کافی ہاؤس کے سامنے والے باغ میں گلاب کی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مسعود تانگے میں آیا تو اس کے ساتھ ایک برقعہ پوش لڑکی بھی تھی۔ خالد نے فرخندہ کو فوراً پہچان لیا۔ اس کا خون گرم ہو کر کھول اٹھا اور کمزور اعصاب کانپنے لگے مسعود چوک میں ہی تانگے پر سے اتر گیا۔ تانگہ فرخندہ کو لے کر نیلے گنبد کی طرف مڑ گیا۔ جتنی دیر میں خالد باغ میں سے اٹھ کر نیلے گنبد والی سڑک پر آیا تانگہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اپنے دوست کے ساتھ اس نے کچھ دیر نیلے گنبد کے علاقے میں گھوم پھر کر فرخندہ کا سراغ لگانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ خالد نے اپنے دوست کو تو وہیں چھوڑا اور خود ایک تانگے میں سوار ہو کر وسن پورے فرخندہ کے گھر کی جانب چل پڑا۔ آج اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ فرخندہ کے ماں باپ کو ساری بات بتا دے گا۔

۱۶

وسن پورے والی خالہ کے ہاں پہنچ کر خالد نے دیکھا کہ فرخندہ کی امی باہر صحن میں بیری کے پیڑ تلے صف پر لحاف بچھائے اسے ٹانک رہی ہے۔ خالد نے مصنوعی انداز میں مسکرا کر خالہ کو سلام کیا اور ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد فرخندہ کا پوچھا۔ خالہ نے کہا۔۔۔۔

"اوپر گئی ہے ابھی ابھی۔۔۔۔ کیوں خیر تو ہے؟"

خالد نے ہنس کر کہا۔

"خالہ جان ایک جگہ سے امتحان کا گیس مل گیا تھا وہ فرخندہ کو بتانے آیا ہوں۔ اگرچہ وہ خوب محنت کر رہی ہے۔ لیکن گیس بڑی چیز ہوتی ہے خالہ جان!"

اتنا کہ کر خالد بظاہر بڑے لا ابالی اور گھریلو سبھاؤ سے سیٹی بجاتا اوپر گیلری میں چڑھ گیا۔ پہلے کمرے میں منہ ڈال کر عذرا بھابی کو سلام کیا جو مشین لئے بیٹھی اپنے بلو کے فراک سی رہی تھی۔ ذرا آگے جا کر وہ بڑے چور قدموں سے سکڑتا ہوا فرخندہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"میں سلام عرض کر سکتا ہوں؟"

فرخندہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ کپڑے بدلنے کے بعد آئینے کے آگے کھڑی دوپٹے کے پلو سے ہونٹوں کی سرخی پونچھ رہی تھی۔ وہ جلدی سے پرے ہٹ گئی اور میز پر رکھی ہوئی کتابیں ٹھیک کرنے لگی۔ اس کا برقع پلنگ پر پڑا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی کسی سے مل کر آ رہی ہے۔ خالد نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔۔۔۔

"ایک جگہ سے تمہارے انگریزی کے پرچے کا گیس معلوم ہوا تھا۔ میں نے کہا تمہیں چل کر بتا دوں۔"

پھر برقعے کا ایک پلو جو فرش پر گرا ہوا تھا اٹھا کر بولا۔۔۔۔

"تم کہیں باہر گئی تھیں کیا؟"

فرخندہ نے گھبراہٹ پر قابو پا کر کہا۔۔۔۔

"نہیں تو۔۔۔۔ ہاں ہاں ذرا انار کلی گئی تھی، انجم کے ساتھ۔ اسے اون خریدنی تھی۔ اور مجھے۔۔۔۔"

خالد نے جملے کاٹ کر کہا۔۔۔۔

"تمہیں مسعود سے ملنا تھا۔"

فرخندہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ اسے اس اچانک حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ سہم سی گئی۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا اور یوں لگا گویا اب گری کہ گری۔ فوراً ہی اس نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور خالد کی طرف گھورتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کسی پر جھوٹا الزام لگاتے ہوئے ذرا دریغ نہیں ہوتا۔ آخر تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ تم کیا چاہتے ہو۔"

فرخندہ نے اپنے جسم میں جرأت کی ایک نئی لہر ابھرتی محسوس کی جس نے اسے بڑی تقویت دی اور وہ میز پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیٹھ گئی۔ آج وہ خالد سے دو ٹوک باتیں کرنا چاہتی تھی۔ خالد پہلے تو دب گیا۔ پھر تنک کر بولا۔

"میں تو تم سے کھری کھری بات کر رہا ہوں۔ میں کسی سے ڈرتا تھوڑے ہوں۔ سچی بات تو سب کے سامنے کر دوں گا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم مسعود سے مل کر آئی ہو۔ میں نے تمہیں ٹاؤن ہال کی طرف اس کے ساتھ تانگے میں جاتے دیکھا ہے۔"

"تو پھر تم نے وہیں مجھے کیوں نہ روک دیا؟"

"بس یہی غلطی ہو گئی مجھ سے۔"

"آئندہ ایسی غلطی مت کرنا۔"

خالد نے اپنی تھوڑی بہت مردانگی کو جمع کیا اور اپنی چھوٹی سی چھاتی پھلا کر کہنے لگا۔

"آئندہ تمہیں ایسا موقع ہی نہیں دیا جائے گا۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ مجھے تمہیں غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر خاموش بیٹھے رہنا چاہئیے؟ کیا تم میری رشتہ دار نہیں ہو؟ کیا تم میری خالہ کی بیٹی نہیں ہو؟ کیا تم مجھے بے غیرت تصور کرتی ہو؟ میں تو اس وقت غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اس کمینے مسعود کی گردن مار دوں۔"

فرخندہ نے چمک کر کہا۔

"تو پھر جرأت کیوں نہ ہوئی؟"

خالد کو غصہ آ گیا۔ اس کی پے در پے بے عزتی کی جا رہی تھی۔

"اس کا مزہ بھی چکھا دیا جائے گا۔ اگر تم اپنی ہٹ پر ہی اڑی رہی تو مجھے یہ بھانڈا چوراہے میں پھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں اپنے خاندان کی بے عزتی نہیں سہہ سکتا۔"

فرخندہ نے طنزیہ حقارت سے کہا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم کسی دوسرے کو محبت کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ تمہیں کسی کی محبت نصیب نہیں۔ تم دوسروں کو ہنستے دیکھ کر جل بھن جاتے ہو۔"

خالد کا چھوٹا سا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی تذلیل ایسی عورت کے منہ سے ہو رہی تھی جس کو وہ اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ یعنی مشرقی روایات کے مطابق وہ جس عورت کو اپنی فرمانبرداری میں لا کر اس سے اپنی خدمت کروانا چاہتا تھا۔ اس کا کمزور اور مکروہ جسم اپنی بے عزتی کے احساس سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ باتوں میں فرخندہ کو مات نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے ترکش میں صرف ایک ہی تیر تھا۔ اس نے اسی تیر کو چلے پر چڑھا کر فرخندہ کی طرف اچھال دیا۔

"اس کا فیصلہ تمہارے والد کریں گے۔ تمہارے بھائی جان اکبر کریں گے۔ میں آج ہی انہیں سب حالات سے باخبر کئے دیتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی لٹتی ہوئی عزت کو بچاؤں اور انہیں آگاہ کروں کہ جس ناموس کو انہوں نے کوڑی کوڑی جوڑ کر اپنے پسینے سے کمایا ہے۔ اسے ان کی لاڈلی بیٹی ایک ہی داؤ میں ہارنے والی ہے یا ہار چکی ہے۔"

فرخندہ کے تو ہوش اڑ گئے۔ بدنامی اور بدافعالی کا اژدہا اس کے سامنے منہ پھاڑ کر پھنکارنے لگا۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اسے ایک ایک کر کے اپنی بے حیائی کے سارے لمحے یاد آنے لگے۔ اس میں بولنے کی سکت نہ رہی وہ زرد پڑ گئی اور اس کے ہونٹوں کے پاس زخم کا نشان گہرا ہو کر روحانی اذیت کی لکیر بن گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ کسی نے سن لیا تو کیا ہوگا؟ تمہیں کسی کی عزت کا بھی خیال نہیں؟"

خالد نے جب فرخندہ کو اپنی اصلی تہ پر واپس آتے دیکھا تو فتح مندی کے احساس میں

مسکرا دیا۔ جیب سے نیا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ بڑی نفاست سے گریبان کا کھلا ہوا بٹن بند کیا اور کہنے لگا۔

"میں تمہاری بھلائی ہی چاہتا ہوں فرخندہ! ذرا خیال کرو۔ تمہیں غیر مرد کے ساتھ سیریں کرتے دیکھ مجھے کتنا دکھ نہیں ہوتا ہوگا۔ میں جو تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ تم سے شادی کر کے ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دینے کا خواہشمند ہوں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم نے پھوٹے منہ کبھی مجھ سے ہمدردی کے دو بول نہیں کہے۔ کبھی میری دلجوئی نہیں کی۔ کبھی میرے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی بے تاب دھڑکنوں کو سننے کی کوشش نہیں کی۔ یاد ہے تم اتنی سی تھیں کہ ہم دونوں کھیتوں میں کھیلا کرتے تھے۔ مجھے تو بچپنے ہی سے تم سے پیار ہے۔ میرے پیار کا مقابلہ تم ان لوگوں سے کر رہی ہو جو صرف چند روز کے عاشق ہیں اور تمہیں خراب کرنا چاہتے ہیں۔"

فرخندہ سر جھکائے میز پر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس شخص سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ خالد کرسی سے اٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور تسلی کر لینے کے بعد فرخندہ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ اپنے مردہ اور ٹھنڈے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

"مجھے تم سے بے غرض محبت ہے پیاری۔ تم کہو تو میں تمہاری خاطر آسمان سے تارے توڑ کے لادوں۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے۔ یہی ناں کہ میں خوبصورت نہیں مگر اصلی خوبصورتی تو دل کی ہوتی ہے۔ میں ایم اے کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی انگریزی کا۔ دنیا کی مشکل سے مشکل اور موٹی سے موٹی انگریزی کی کتاب پڑھ سکتا ہوں۔ میرے پاس گرم سوٹ بھی ہیں اور ٹھنڈے بھی۔ میں کافی ہاؤس میں بیٹھتا ہوں۔ شیزان بھی جاتا ہوں۔ مال روڈ سے کپڑے سلواتا ہوں۔ پھر تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتیں۔ یقیناً تم مجھ سے شرما رہی ہو ورنہ تمہارا دل میری محبت سے لبریز ہے۔ دراصل تم پہلے میری طرف سے اظہار عشق کی خواہشمند تھیں۔ بس یہی غلطی ہو گئی کہ میں نے اپنی محبت کا اظہار دیر سے کیا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ تم اب اپنا دل میرے سامنے کھول سکتی ہو۔ میں نے تو اپنا آپ تمہارے حوالے کر دیا ہے ----"

فرخندہ کے نتھنوں میں خالد کے میلے کچیلے کالر میں سے اٹھتی ہوئی بد بو گھس رہی تھی۔

اس بد بو میں، گھوڑے کے پسینے کی بکراہند تھی۔ جب خالد نے مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور خود کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"برائے مہربانی خالد یہاں سے چلے جاؤ۔"

خالد شرمندہ ہو کر وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔" اب فرخندہ اپنے اصلی روپ میں آ گئی تھی۔ "میں نے ہمیشہ تمہیں حقارت سے دیکھا ہے۔ کبھی تمہیں اتنی وقعت نہیں دی کہ تم سے بات کروں۔ تم مجھے انسان کی بجائے ہمیشہ ایک مکار لومڑ کے روپ میں دکھائی دیئے ہو۔ محبت تو بڑی دور کی چیز ہے، میں تمہیں اپنی نفرت کے لائق بھی نہیں سمجھتی۔ تم خیال کر کے آئے ہو گے کہ میں تمہارے پاؤں میں گر پڑوں گی۔ تمہارے ہاتھوں پر بوسے دے کر تم سے محبت کا اظہار کروں گی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاؤں گی۔ یہ تمہاری بھول تھی۔ میرا خمیر اس مٹی سے نہیں اٹھایا گیا۔"

خالد نے تیز تیز آنکھوں سے گھور کر کہا۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"

فرخندہ نے نفرت سے منہ اٹھا کر کہا۔

"تمہارے من میں جو آتا ہے کر کے دیکھ لو۔ میں اسے اپنی جوتی پر لکھتی ہوں زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا ناں کہ میرا گھر سے نکلنا بند ہو جائے گا۔ مجھے مارا پیٹا جائے گا۔ میری بلا سے۔ میں سب سہہ لوں گی، مگر اتنا ضرور کہے دیتی ہوں کہ تم ایک چیچک رو لومڑ ہو اور میں تمہیں آج کے بعد پھر کبھی اپنے کمرے میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

خالد کھسیانا سا ہو کر مسکرایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ فرخندہ کو اتنا ضرور کہہ گیا۔

"ایک دن تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

فرخندہ نے زور سے دروازہ بند کر لیا اور پلنگ پر گر کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

شام کو ماسٹر جی آئے تو اس نے رندھی ہوئی آواز میں انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ماسٹر جی نے اپنی شاگرد کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بڑی توجہ اور غور سے سنا۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ان کی شاگرد پریشان ہے۔ اور روحانی کوفت میں مبتلا ہے۔ کیوں اور کس کی

وجہ سے مبتلا ہے؟ اس سے ماسٹر جی کو کوئی سروکار نہ تھا۔ سورج مکھی کا پھول تو اپنا منہ ہمیشہ سورج کی طرف رکھتا ہے۔ اسے کوئی خبر نہیں ہوتی کہ سورج کدھر سے طلوع ہو کر کہاں غروب ہوتا ہے۔ ماسٹر جی بڑے آزردہ ہو گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی ہتھیلی پر سر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے ہولے سے آنکھیں کھول کر فرخندہ کے بھورے بالوں کو دیکھا جو ماتھے پر اڑے اڑے سے تھے۔ اس کے اداس چہرے کو دیکھا اور بوڑھے سر کو دو ایک بار دائیں بائیں بے معنی انداز میں ہلا کر کہنے لگے۔

"لوگ کہتے ہیں زمانہ بڑا خراب جا رہا ہے بیٹی ----- میں تمہیں کوئی نصیحت یا مشورہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ مجھے زمانے کے نشیب و فراز سے واقفیت نہیں۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا۔ تم بڑی جذباتی لڑکی ہو۔ محبت کے جوش میں کہیں ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا جس کی وجہ سے تمہارے ماں باپ کی بدنامی ہو۔ جگ ہنسائی ہو اور تمہیں ساری عمر پچھتانا پڑے۔ ویسے تم سیانی ہو۔ برا بھلا سوچ سمجھ سکتی ہو۔ لیکن سنا ہے محبت میں تو انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اچھا! بھلا یہ بتاؤ۔ کیا وہ لڑکا سچ مچ تم سے بہت محبت کرتا ہے؟ کہیں وہ تم سے جھوٹ موٹ کا پیار تو نہیں جتا رہا؟ اگر تم دونوں کی شادی ہو گئی تو کیا وہ تمہارے ساتھ نباہ کر سکے گا؟ بیٹی شادی کے دروازے میں سے گزر کر ہر محبت کا حلیہ بدل جاتا ہے۔ وہ کچھ کی کچھ بن جاتی ہے۔"

فرخندہ نے نظریں جھکائے آہستہ سے کہا۔

"مسعود ایسا نہیں ہے ماسٹر جی۔ وہ ایسا نہیں ہے۔"

"خدا کرے کہ وہ ایسا نہ ہو۔ خدا کرے تم اس کے ساتھ سکھی رہو۔ سدا سکھی رہو۔ مگر کیا شادی ان حالات میں ہو سکے گی؟"

"کیوں نہیں ہو گی ماسٹر جی؟ محبت کرنے والوں کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔"

ماسٹر جی نے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کے پیچھے لگا دیا۔ انہیں وہ تمام شکستیں یاد آ گئی تھیں جو انہوں نے محبت میں اٹھائی تھیں اور اٹھا رہے تھے۔ انہیں پھر وہی چکر سا آ گیا۔ انہوں نے سر جھٹک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کبھی کبھی یہ کس قسم کی باتیں سوچنا شروع کر دیتے ہیں؟ ان کے ذہن کا یہ جہنمی حصہ کب تک ان کی روح کو اس آگ میں جلاتا رہے گا؟ ٹھیک ہے۔ محبت کرنے والوں کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ وہ بھی جیت میں ہیں۔ وہ ہمیشہ جیت میں رہیں گے۔ کیا یہ ان کی فتح نہیں کہ جس ہستی کے گرد ان کی زندگی کا سیارہ گردش

رہا ہے وہ ہمیشہ ان کی پیاسی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ ان کے لئے چائے بناتی ہے۔ ان سے اپنے دکھ سکھ کا حال بیان کرنے کے لئے پہروں ان کی راہ دیکھتی ہے۔ اس سے زیادہ انہیں اور کیا چاہئیے تھا۔ اس سے زیادہ انہیں اور کیا مل سکتا تھا۔

خالد نے شیخ صاحب یا اکبر سے فرخندہ کے معاشقے کا ذکر کرنے کی بجائے اپنے ایک دوست سے مل کر فرخندہ کی تصویر اور خط برآمد کروانے کی مہم تیز کر دی۔ خالد کا سراغ رساں دوست مسعود کا اتنا گہرا دوست نہیں تھا۔ لیکن اس نے مسعود سے دنوں میں دوستی پیدا کر لی اور اس کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ مسعود ایسے نوجوان دوسرے لوگوں کو اپنے معاشقے سنانے اور لڑکیوں کے خطوط اور تصویریں دکھلانے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر معاشقہ کرتے ہی اس لئے ہیں کہ دوسرے لوگ انہیں نازک اندام گوری گوری کلائیوں والی لڑکیوں کے ساتھ سیر کرتے دیکھ کر ان کی قسمت پر رشک کریں اور ایک دوسرے سے کہتے پھریں کہ یار یہ نوجوان تو بڑا خوش نصیب ہے۔ لڑکیاں اس کی دیوانی ہیں۔ ہر روز نئی سے نئی لڑکی کو ساتھ لے کر کافی ہاؤس میں داخل ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ذرا کسی سے بے تکلف ہوتے ہی الف سے یاء تک اپنے سارے رومان اور عشق بازیوں کی داستانیں ایک ہی سانس میں سنا ڈالتے ہیں۔

خالد کا سراغ رساں دوست دو چار روز ہی مسعود کے ساتھ شیزان وغیرہ میں گھوما تھا کہ مسعود نے فرخندہ اور اس کے علاوہ دو تین اور لڑکیوں کے فرضی قصے اس سے بیان کر ڈالے۔ سراغ رساں نے فرخندہ کے بارے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا۔

"میں نے اس لڑکی کو اکثر تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ مگر یار وہ تو بڑی مغرور لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بشرے سے تو یہ بات صاف عیاں ہے کہ وہ کبھی کسی کو محبت نامہ نہیں لکھ سکتی۔"

مسعود نے قہقہہ لگایا۔

"تو پیارے کل میرے ساتھ چلنا۔ تمہیں اس کے خطوں کا پورا پلندہ دکھلاؤں گا۔"

دنیا میں دوسرے کو زیر کرنے کے لئے اس کی تعریف کرنے سے بڑھ کر کوئی کامیاب ہتھیار ابھی تک ایجاد نہیں ہو سکا۔ اس میدان میں بڑے سے بڑا دلاور اور شہ زور سپاہی منہ کے بل آن گرتا ہے۔ اگلے روز مسعود خالد کے سراغ رساں دوست کو اپنے گھر لے گیا۔

دیوان خانے میں جا کر اس نے فرخندہ کے خطوں سے بھرا ہوا ڈبہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس ڈبے میں فرخندہ کی چھ سات تصویریں بھی تھیں۔ مسعود ذرا کی ذرا غسل خانے میں گیا تو سراغ رساں نے جھٹ سے ایک محبت نامہ اور ایک تصویر جس کی پشت پر فرخندہ کے ہاتھ کی تحریر تھی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔

شام کو اس نے تصویر اور خط خالد کے حوالے کر دیا۔ خالد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ اسے یوں لگا گویا اس کے ہاتھ مٹی کو سونے کی دھات میں تبدیل کرنے کا نسخہ آ گیا ہے۔ وہ فرخندہ کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس تصویر میں فرخندہ دوپٹہ گلے میں لٹکائے کہنی میز پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ چہرے پر خفیف سی داد طلب مسکراہٹ تھی اور بالوں کا ایک چھلا پھسل کر ماتھے پر آیا ہوا تھا۔ تصویر کے پیچھے اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

جان سے پیارے مسعود کے لئے۔۔۔۔۔ اس کی سجنی

فرخندہ کی طرف سے۔"

یہ کسی بڑے ہی سستے رومانی ناول جملہ معلوم ہو رہا تھا۔ خالد نے خط کھول کر پڑھا۔ یہ خط چھوٹے سائز کے نیلے پیڈ کے چار صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ لکھائی بڑی گنجان تھی اور جگہ جگہ مسعود کے نام کے نیچے خط کھینچا گیا تھا۔ اس میں سے حنا کی ہلکی ہلکی خوشبو ابھی تک آ رہی تھی۔ یہ خط شروع کے زمانے کا تھا۔ اور صرف محبت کے لطیف اور شدید جذبات سے بھرپور تھا۔ خط کے اخیر میں فرخندہ کے اپنے پورے دستخط تھے اور وسن پورہ بھی لکھا ہوا تھا۔ خالد نے خط اور تصویر اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لی اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گویا فرخندہ اس کی جیب میں آ گئی ہو۔ کمینے آدمی کو جب کسی شریف آدمی کی کمزوری ہاتھ لگ جاتی ہے وہ پہلے سے زیادہ کمینہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح پانی کو ڈھلان مل جائے تو وہ زیادہ تیزی سے بہنے لگتا ہے۔ خالد کو ساری رات نیند نہ آ سکی۔ بار بار اس کا جی چاہا کہ وہ خط اور تصویر لے کر ابھی وسن پورے جائے اور ان لوگوں کی نیند حرام کر دے۔ لیکن وہ رات قدرت نے شیخ فقیر دین کے کنبے کے آرام کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ خالد اپنی خطرناک سوچ بچار کے باوجود اس رات کی نیند وسن پورے والے خاندان کے کسی فرد سے بھی نہ چھین سکا۔ صبح ہو گئی اور وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر فرخندہ کے گھر کی طرف چل نکلا۔ وہ اس جوش و خروش اور اہتمام کے ساتھ صبح صبح گھر سے نکلا تھا گویا انہیں کوئی بہت بڑی خوش خبری سنانے جا رہا ہو۔

۱۷

راستے میں خالد نے سوچا کہ فرخندہ کی داستان عشق اگر گھر میں سب کے سامنے بیان کرنے کی بجائے صرف اس کے بڑے بھائی اکبر ہی کو سنائی جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ یوں بھی خالد کو کچھ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اتنی بڑی راز کی بات ان لوگوں کی موجودگی میں بیان نہیں کر سکے گا۔ اس نے تو گویا سونے کی ڈلی نگل لی تھی اور اب گھبراہٹ کے عالم میں کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو چپکے سے سونے کی ڈلی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔

اس نے تانگہ پھر کافی ہاؤس کی طرف موڑ لیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ جیب میں نگاہ ڈال کر فرخندہ کا خط اور تصویر دیکھ کر اپنی تسلی کر لیتا تھا۔ جس طرح لڑائی پر جانے سے پہلے سپاہی اپنا پستول کھول کر دیکھتا ہے کہ گولیاں بھری ہوئی ہیں۔ ابھی دفتروں کے لگنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ خالد نے کوئی آدھ گھنٹہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر گذار دیا۔ پھر باہر مال روڈ پر نکل آیا اور فٹ پاتھ پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بات شروع کرنے کے لیے موزوں اور اثر کر جانے والے فقرے بھی سوچے جا رہا تھا۔ میں کہوں گا۔ بھائی صاحب ہم ایک ہی خاندان کے ------ نہیں نہیں بھائی صاحب بڑا اجنبی سا لگتا ہے۔ میں اسے بھائی جان کہوں گا۔ اس طرح اکبر کو شروع ہی سے احساس ہو جائے گا کہ وہ اپنے خالہ زاد سے ہم کلام ہے۔ ہاں تو جملہ کچھ اس طرح کا ہونا چاہیئے۔

"بھائی جان! ہم ایک ہی خون کے چھینٹے ہیں۔ ہماری عزت اور آبرو اکٹھی ہے۔ اپنے خاندان کے ناموس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے------"

اسی قسم کے دو چار جملوں کے بعد میں حرف مطلب زبان پر لے آؤں گا اور بڑی ہوشیاری اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اسے بتا دوں گا کہ فرخندہ کیا گل کھلا رہی ہے۔ پھر اسے خیال ہوا کہ کہیں اس قسم کی تمہید میں موضوع کی شدت کم نہ ہو جائے۔ تو کیا اسے جاتے ہی صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ فرخندہ نے ہمارے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے؟ کہیں اکبر کو یہ طرز گفتگو ناگوار نہ گزرے ------ لاکھ بار گزرے مجھے تو اعلان حق کرنا ہے۔

میں کسی سے کیوں ڈروں؟ اور پھر ثبوت میری جیب میں ہے۔ ٹھیک ہے مجھے چھوٹتے ہی سارا قصہ الف سے یے تک بیان کر دینا چاہیئے۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد خالد سیدھا اکبر کے دفتر جا پہنچا۔ اکبر کو دفتر پہنچے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی اور وہ ضروری کاغذات کو ایک بڑے ٹرے میں سے چھانٹ چھانٹ کر دوسری ٹرے میں رکھ رہا تھا۔ خالد نے چق اٹھا کر سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آؤ آؤ------ کیسے آنا ہوا صبح صبح؟"

"بس یونہی ملنے چلا آیا ہوں۔"

"بہت خوب------ چائے منگواؤں یا شربت؟"

"جی نہیں شکریہ۔ میں پی کر آ رہا ہوں۔"

اکبر کو معلوم تھا کہ خالد کے رشتے کی بات ہو رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا شاید یہ اسی موضوع پر بات کرنے اور اسے اپنا ہم خیال بنانے آیا ہے۔ میں تو اس کی ایک بھی نہ سنوں گا۔ آخر اس نے مجھے اتنا گھٹیا کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنی بہن کی شادی کے متعلق اس کی زبان سے باتیں سنوں گا۔ ذرا یہ بات تو شروع کرے۔ ایسا منہ توڑ جواب دوں گا کہ اسے یہاں سے بھاگتے ہی بنے گی۔ اصل میں اکبر بھی خالد کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس نے اپنی والدہ سے اس رشتے کی مخالفت بھی کی تھی۔ خالد آیا تو بڑے ٹھسے سے تھا۔ لیکن اکبر کے سامنے آتے ہی اس کی ساری قوت ارادی جواب دے گئی۔ بات اتنی بڑی تھی کہ خالد سے چھپ بھی نہیں رہی تھی اور زبان سے ادا بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ یہ قصہ کسی دوسرے روز پر اٹھا کر رکھ لیا جائے۔ نہیں نہیں کیا خبر کل کیا ہو جائے۔ ابھی لوہا گرم ہے۔ اسے ضرب لگا دینی چاہیئے۔ لیکن دفتر میں بات کرنی مناسب نہیں۔ غیر شعوری طور پر خالد زیادہ سے زیادہ دیر کر رہا تھا تاکہ اس دوران میں اس کے اندر اتنا بڑا راز اگلنے کی جرأت پیدا ہو جائے۔ اس نے ٹائی کی گرہ ہاتھ سے ڈھیلی کر کے کہا۔

"بھائی جان! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ لیکن دفتر میں نہیں کرنا چاہتا۔"

اکبر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ خالد کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے مگر اوپر سے بناوٹی دانت کھول کر مسکرا کر کہا۔

"ارے بھئی ایسی کونسی بات ہے جو بیان نہیں ہو سکتی؟ یہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

خالد مسکرایا اور نظریں جھکا کر بولا۔

"جی یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو گھڑی دو گھڑی کے لیے میرے ساتھ باہر آجائیے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

خالد ایک دم بڑا باادب اور نیاز مند سا بن گیا۔ اکبر مجبور ہو کر اٹھا اور خالد کو لے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ دفتر کے عقب میں ایک چھوٹا سا گھاس کا قطعہ تھا جس میں ایک طرف لکڑی کا بنچ پڑا تھا۔ دونوں اس بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان پر ایک درخت کا سایہ تھا۔ دھوپ میں وہ گرمیوں والی حدت اور تیزی نہیں رہی تھی۔ موسم روز بروز خوشگوار ہوتا جا رہا تھا اور موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ دن کو کمروں میں اگرچہ بجلی کے پنکھے ہلکی رفتار سے چلا کرتے مگر رات کو خنکی ہو جاتی اور لوگ چھتوں کے نیچے سویا کرتے۔ خالد اسے نیچے تو لے آیا تھا۔ اب اس میں بات شروع کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اکبر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور ایک بازو بنچ کے پیچھے ڈال دیا۔

"اب کہو کیا بات ہے؟"

وہ چاہتا تھا خالد جلدی سے اپنے دل کا مدعا بیان کرے اور وہ دبے لفظوں میں یہ کہہ کر کہ وہ اس معاملے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا واپس اپنے کمرے میں آجائے۔ خالد نے کالر کے پیچھے انگلی ڈال کر گردن کے گرد گھمائی۔ ذرا کھنکارا اور بڑی پھیکی اور بے اثر آواز میں بولا۔

"بھائی جان یہ تو آپ معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک ہی خون کے چھینٹے ہیں۔ ایک ہی خاندان کے چراغ ہیں۔ اگر میری عزت پر حرف آتا ہے تو اس میں آپ کی بھی بدنامی ہے۔ اور اگر آپ خدا نخواستہ بدنام ہوتے ہیں تو میری نیک نامی پر بھی حرف آتا ہے۔ گویا کہ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی عزت اور ناموس کا تحفظ کریں اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں جس سے ہمارے خاندان کا وقار خطرے میں پڑ جائے۔"

اکبر اس تمہید سے بور ہونے لگا۔ اس نے بات کاٹ دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر بھائی تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

بات کے کٹ جانے سے خالد کی روانی رک گئی اور وہ رٹے ہوئے سارے جملے بھول گیا۔ اس کی گفتگو بے ربط اور بے ہنگم ہو گئی اس گھبراہٹ میں اس کے منہ سے فرخندہ کا نام نکل گیا۔

"فرخندہ میری عزیزہ ہے۔ جتنا آپ کو اس کے مستقبل کا خیال ہے اتنا ہی مجھے ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ پھر وہی بات کہ خون ایک ہی ہے۔ عزت ایک ہے-----"

اپنی بہن کے نام سے اکبر کا منہ لال ہو گیا۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے ترش روئی سے کہا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب کچھ نہیں۔ مطلب کیا ہو سکتا ہے بھائی جان۔"

"آخر کچھ نہ کچھ تو کہنے آئے ہو گے۔"

"جی ہاں----۔ ضرور ضرور، لیکن سوچتا ہوں کیسے کہوں؟ زبان زیب نہیں دیتی۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے۔ بات زبان پر آ کر رک جاتی ہے۔"

اکبر نے جھنجلا کر کہا۔

"خالد صاحب! آپ کو شاید علم نہ ہو مجھے دفتر میں واپس جا کر کام بھی کرنا ہے اور یہاں آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

خالد نے چپکے سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور فرخندہ کا مسعود کے نام لکھا ہوا محبت نامہ نکال کر اکبر کے حوالے کر دیا۔ اکبر نے لفافہ تھام کر پوچھا۔

"یہ کس کا خط ہے؟"

"آپ خود ہی پڑھ لیجیے۔ سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔"

اکبر نے لفافے میں سے نیلے رنگ کا خط نکالا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ وہ خط پڑھتا جاتا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ پہلے وہ سرخ ہوا۔ پھر زرد۔ پھر سفید اور آخر میں سانولا ہو گیا۔ جیسے دھواں کھائی ہوئی لکڑی کا رنگ ہوا کرتا ہے۔ اس کے خط پڑھنے میں خالد وقفے وقفے کے بعد برابر بولے جا رہا تھا۔ وہ اپنی طرف سے اکبر کو تسلی بھی دے رہا تھا اور اس معاملے کی سنگینی اور نوعیت کی شدت بھی جتائے جا رہا تھا۔

"میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جس شخص نے مجھے یہ خط لا کر دیا اسے بالکل

خبر نہیں کہ فرخندہ کون ہے۔ بس یہ تو میں نے اپنے اثر ورسوخ سے حاصل کر لیا۔ کتنی شرم کی بات ہے بھائی جان۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ یہ واقعہ تو اس بیسویں صدی میں اس سپوتنک دور میں کسی بھائی کی بہن کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس میں زیادہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تاہم عزت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔۔۔۔"

اکبر نے خط پڑھتے پڑھتے آہستہ سے کہا۔

"ذرا خاموش رہو۔"

خالد خاموش ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ وہ پوری طرح سے اپنی صفائی بھی کر دینا چاہتا تھا۔

"ایسی صورت میں تو ہمارے ہاں کسی لڑکی کے لیے بر تلاش کرنا اچھا خاصہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں فرخندہ کو بے قصور سمجھتا ہوں۔ لڑکیاں بھولی ہوتی ہیں۔ اسے تو مرد ورغلا دیتے ہیں۔ اور اس کے ماتھے پر ساری زندگی کے لیے کلنک کا ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ میری نظروں میں تو اب بھی فرخندہ کی بڑی عزت ہے۔۔۔۔"

اکبر خط ختم کر چکا تو عینک کے موٹے شیشوں کے عقب میں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل کر سفیدی مائل ہو گئی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں خط کا کاغذ کانپ رہا تھا۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی بہن اور اس کے عاشق کی مختلف تصویریں گھوم رہی تھیں۔ اس نے خط لفافے میں ڈالا اور سر جھکائے بڑی بے جان آواز میں بولا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟"

خالد نے اکبر کو شکست خوردگی اور ہزیمت کے عالم میں دیکھا تو اسے بڑی تسکین سی ہوئی اس نے بڑا نمایاں کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ شیخ فقیر دین کے کنبے کی عزت اس کی مٹھی میں تھی۔ اب تو وہ لوگ اس کے اشاروں پر چلیں گے۔ اس نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا۔

"ایم اے کا طالب علم ہے۔ میں اس کی صورت سے واقف ہوں۔ اگرچہ کبھی سلام دعا نہیں ہوئی۔ بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ کئی لڑکیوں کو خراب کر چکا ہے پورا نوسر باز ہے۔ شرافت قریب سے بھی نہیں گذری۔ باپ کی دولت اجاڑ رہا ہے۔ دو کوڑی کا بھی آدمی

نہیں ہے بھائی جان۔"

اکبر کمزور اعصاب کا آدمی تھا۔ اس کی زندگی بڑی ہموار رفتار سے گذری تھی اور اس میں کبھی ایسے نشیب و فراز نہیں آئے تھے۔ وہ اپنی بہن کا محبت نامہ پڑھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے ہتھیلیوں میں آیا ہوا پسینہ پونچھا اور پوچھنے لگا۔

"تمہیں یہ خط کہاں سے مل گیا؟"

خالد کو اپنی اہمیت جتانے کا بڑا نادر موقع دستیاب ہو گیا تھا۔

"بس ایک رازدار دوست کے ذریعے سے منگوا لیا۔ یوں کہہ لیجئے کہ اڑوا لیا گیا۔ فکر نہ کریں میرے دوست کو معلوم ہی نہیں کہ فرخندہ سے میرا بھی کچھ رشتہ ہے۔ بات اصل میں یوں شروع ہوتی ہے کہ میں نے دو تین بار فرخندہ کو اس لڑکے کے ساتھ مال پر گھومتے دیکھا تھا۔ لیکن میں کسی ثبوت کی تلاش میں تھا۔ مجھے شک تھا کہ وہ لڑکی فرخندہ نہیں کوئی اور ہے۔ میں نے ایک دوست کو جو اس لڑکے کا قریبی یار ہے اس کام پر لگا دیا کہ وہ کس طرح اس سے خط حاصل کرے۔ خیر چھوڑیئے۔ یہ بڑی افسوس ناک باتیں ہیں انہیں دہرانے سے کیا فائدہ۔ مجھے خود بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میرا سر تو فرطِ ندامت سے جھک گیا ہے۔ میں تو رات بھر جاگتا رہا ہوں۔"

پھر اس نے جان بوجھ کر یہ فقرہ کہہ دیا۔

"اور تو اور مجھے یہاں تک پتہ چلا ہے کہ فرخندہ کی کچھ تصویریں بھی اس حرامزادے کے پاس ہیں؟"

"کیسی تصویریں؟"

"بس وہی جو فرخندہ نے اس بدکردار کو اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے دی ہیں۔"

اکبر نے عینک اتار لی اور رومال سے اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔ عینک اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔

"بڑی بدنامی کی بات ہوئی ہے اس سے تو یہ لڑکی مر جاتی تو اچھا تھا۔ ہم لوگ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اباجی کو اس کی خبر ہو گی تو وہ تو شرم سے ڈوب مریں گے۔ انہوں نے تو آج تک گھر میں کسی لڑکے کی ایسی بات نہیں دیکھی۔"

پھر وہ خالد کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں بے کسی کی جھلک تھی جس نے خالد کو بڑا مزہ دیا۔

"کیا کسی طریقے سے فرخندہ کے سارے خط اور تصویریں اس بدمعاش سے نکلوائی نہیں جاسکتیں؟"

خالد نے ایسا سنجیدہ منہ بنا لیا جیسے کسی بڑے پیچیدہ اور ناممکن کام کے بارے میں غور وفکر کر رہا ہو۔ پھر دانتوں سے انگلی کا ناخن کاٹ کر کہنے لگا۔

"ہے تو یہ بڑی مشکل بات لیکن میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ میں خود نہیں چاہتا کہ اس کمینے کے پاس یہ چیزیں رہیں۔ مگر ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

اکبر نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ جہاں تک میری اطلاع کا تعلق ہے فرخندہ نے مسعود کو ایک دو خط ہی لکھے ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"میرے سراغرساں دوست نے بتایا تھا۔"

دراصل خالد مزید خط حاصل کرنے کی جھک جھک سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا اگر ان لوگوں نے شادی میں کہیں یہ شرط لگا دی کہ مسعود سے فرخندہ کے سارے خطوط اور تصویریں واپس لی جائیں تو اس کے لئے بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ وہ اپنے سراغرساں دوست کی مدد سے مسعود سے دو ایک خط اور تصویریں تو نکلوا سکتا ہے مگر سارے کے سارے خط حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔

"بہرحال میں پوری کوشش کروں گا کہ اس کے پاس فرخندہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک بھی پرزہ باقی نہ رہے۔ آخر کو یہ میری بھی عزت کا معاملہ ہے۔ آپ نہ بھی کہتے جب بھی مجھے یہ فرض ادا کرنا ہی تھا۔ آپ خود ہی سوچئے اس طرح صرف خاندان کی نیک نامی ہی کو بٹہ نہیں لگے گا بلکہ لڑکی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ آج کل تو لوگ اچھی بھلی لڑکیوں میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں-----"

خالد ساتھ ساتھ اکبر پر یہ بات بھی کھولے جارہا تھا کہ اب فرخندہ کا سب سے زیادہ حق

دار وہی ہے اور صرف وہی اس کی کمزوریوں پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ وہ خط ابھی تک اکبر کے ہاتھ میں تھا۔ خالد خط واپس بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کی تو زبردست خواہش تھی کہ اکبر یہ خط گھر لے جا کر سب کو دکھائے تاکہ وہاں شور مچ جائے اور خالد کی اہمیت کا نقارہ بج اٹھے اور وہ فرخندہ کو زیادہ سے زیادہ اپنے قابو میں کر سکے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ اکبر نے خط جیب میں رکھ کر کہا۔

"یہ خط تم میرے پاس ہی رہنے دو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ مگر اتنا خیال رکھئے کہ قبلہ خالو جان اور خالہ جان کو ایک دم نہ دکھائیے گا اس طرح انہیں بہت صدمہ ہوگا۔"

خالد نے تصویر کی ایک جھلک بھی اکبر کو نہیں دکھائی تھی۔ وہ دونوں ثبوت ان لوگوں کو دے کر خود بے ہتھیار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی گولی ٹھیک نشانے پر لگی تھی۔ دوسرا فائر اس نے کسی اہم ترین موقع کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد خالد نے بڑی منافقانہ نیازمندی کے ساتھ جھک کر اکبر سے ہاتھ ملایا اور دفتر سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

اکبر سارا وقت دفتر میں بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا گہرے فکر اور تشویش میں ڈوبا رہا۔ کئی بار اس نے دفتر کی فائلوں میں غلط کاغذ ٹانک دیئے۔ چھٹی کے بعد گھر آیا تو اس نے اپنی بیوی غذرا سے زیادہ گفتگو نہ کی۔ غذرا بجلی کے چولہے پر کیتلی رکھے ابلتی ہوئی گھی شکر ملی سوجی میں پستہ کتر کتر کر ڈال رہی تھی۔ بلو کرسی پر کھڑا کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر خوشی سے شور مچا رہا تھا۔ اکبر نے بلو کو پیار کیا اور کپڑے بدل کر نیچے والدہ کے پاس آگیا فرخندہ غسل خانے میں سر دھو رہی تھی۔ وہ سر نیچے ڈالے ہوئے تھی۔ بال صابن کی جھاگ میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے انہیں خوب زور لگا لگا کر مل رہی تھی۔ اکبر نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا کہ گویا وہ سر دھو کر اسی بدمعاش سے ملاقات کو جانے والی ہو۔

اکبر والدہ کو شیخ صاحب کی کوٹھڑی میں بلا کر لے گیا اور سارا ماجرا ان کے گوش گزار کر دیا۔ والدہ تو اکبر کا منہ ہی تکتی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے سر جھکا لیا اور دو تین بار کچھ اس طرح سر کو نفی میں جنبش دی جیسے انہیں یقین ہی نہ آرہا ہو۔ اکبر نے فرخندہ کا خط بھی انہیں دکھا دیا۔

"لیکن امی جو کچھ ہونا تھا ہوگیا ہے۔ اب ہمیں بڑے تحمل سے کام لینا ہوگا۔ لڑکی جوان اور منہ زور ہے۔ ہوسکتا ہے اگر ہم نے اس سے سختی کی تو معاملہ زیادہ نازک صورت اختیار کر جائے اور ہمیں ہاتھ کی پھینکی ہوئی آنکھوں سے اٹھانی پڑے۔ آپ اباجی سے بات کریں گی کیا؟"

والدہ نے فکر مند لہجے میں کہا:

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

دیکھ لیجئے۔۔۔۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ بات اگرچہ بڑی پریشان کن ہے لیکن ان کے کانوں سے ضرور نکل جانی چاہیئے۔ آخر جوان لڑکی کا معاملہ ہے کل کلاں اگر شادی میں کوئی اڑچن پڑ گئی تو انہیں دہرا صدمہ ہوگا۔"

"مگر بیٹا وہ تو فرخندہ کو جان سے مار ڈالیں گے۔"

"میں انہیں سمجھا بجھا لوں گا۔ مارپیٹ سے کام لیا گیا تو بات اس گھر سے نکل کر ہمسایوں اور پھر عذرا کی زبانی میرے سسرال اور سب رشتہ داروں میں پھیل جائے گی ہمیں توضبط سے کام لینا ہوگا۔

اکبر کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے پلو سے آنکھیں پوچھ کر کہا:

"اس لڑکی کو ہو کیا گیا؟"

اکبر نے تشفی آمیز انداز میں کہا:

"ہوسکتا ہے وہ اس بد کردار کی باتوں میں آگئی ہو۔ آج کل تو اس قسم کی غلطی کسی بھی لڑکی سے ہوسکتی ہے۔ بہرحال ان باتوں کو تو چھوڑیئے۔ جب تک اباجی دکان سے واپس نہ آجائیں آپ فرخندہ سے بھی کوئی ذکر نہ کریں۔ میں کسی بہانے عذرا کو آج شام اس کے میکے پہنچائے دیتا ہوں۔ اگر اس کے کان میں کہیں سے اس واقعے کی بھنک بھی پڑ گئی تو سارے رشتہ داوں میں بدنامی ہوجائے گی۔ شام کو اباجی کے سامنے فرخندہ کو بلالیں گے اور ساری بات کھول کر رکھ دیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا"

والدہ نے آہ بھر کہ کہا اور چپکے سے اٹھ کر باہر آگئیں۔ فرخندہ غسل خانے کے باہر

کھڑی تولیہ پیچھے ڈالے لمبے لمبے نیم سنہری گیلے بالوں کو جھٹک رہی تھی۔ پانی کی ننھی ننھی بوندوں کی پھوار سی غسل خانے کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ اس نے امی سے کہا۔

"امی میری تیل کی شیشی کہاں چلی گئی؟ ساری الماریاں دیکھ لی ہیں کہیں مل ہی نہیں رہی؟"

اس کی والدہ نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔

"کہیں نہ کہیں پڑی ہوگی"

اور باورچی خانے میں آکر چولہے کے آگے بیٹھ گئیں اور کیتلی میں کچا دودھ ڈال کر اسے آگ پر رکھ دیا۔ انہیں فرخندہ سے بڑا پیار تھا۔ انہیں اس کی غیر ذمہ داری کی حرکت سے صدمہ پہنچا تھا۔ ان کے وقار کو ٹھیس لگی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ہر معاملے میں فرخندہ کی طرف داری کی تھی اور اس کے باپ کی جھڑکیاں سن سن کر بھی اسے اچھے سے اچھا کھلایا پلایا اور اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا پہنایا تھا۔ جب اس کے باپ کو اپنی بیٹی کی کرتوت کا علم ہوگا تو ان کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ وہ تو اب ساری عمر اپنے خاوند کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتیں تھیں۔ آنگن سے فرخندہ کے بال جھٹکنے کی آواز آرہی تھی۔ بلقیس پانی کی بالٹی پاس رکھے بیٹھک کے ساتھ والے کمرے کا فرش دھو رہی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ کم از کم ان کی بڑی بیٹی بلقیس نے انہیں اس طرح کا صدمہ نہیں پہنچایا۔ وہ بے چاری بے گھر ہو کر یہاں پڑی ہے اور بے کسی اور شرمندگی کے دن بسر کر رہی ہے۔ مگر اس نے آج تک سوائے اپنے خاوند کے چاہے وہ کتنا ہی بُرا ہے اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ لڑکیاں بدبخت چاہے ہوں مگر بدنام نہ ہوں۔ شیشے میں آیا ہوا بال نکل سکتا ہے لیکن کنواری لڑکی کے دامن پر لگے ہوئے داغ کو بحر روم کے سمندر کا پانی بھی نہیں دھو سکتا۔

شام ہی شام اکبر اپنی بیوی اور بچے کو اس کے میکے چھوڑ آیا۔ رات کے کھانے کے بعد دوسری منزل والے اکبر کے کمرے میں پنچایت لگی۔ اس میں اکبر، شیخ فقیر دین، والدہ اکبر کے علاوہ بلقیس بھی موجود تھی۔ فرخندہ کے باپ کو جب اپنی بیٹی کا کچا چٹھا معلوم ہوا تو اسے چکر آگیا۔ پیٹ میں یکلخت درد ہونے لگا اور وہ لوٹا لے کر ادھر چلا گیا۔ واپس آیا تو چہرہ ڈبلا اور پریشان تھا۔ بیوی نے انہیں آہستہ سے کہا:

"اب غم نہ لگایئے۔ بات ابھی زیادہ نہیں پھیلی۔ اسے یہیں پر ختم کیا جاسکتا ہے۔"

شیخ صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سر پکڑ لیا۔

"یہ بدبخت یہ گل بھی کھلائے گی مجھے معلوم نہ تھا۔ کیا اسے میرا بڑھاپا خراب کرنا تھا۔ یہ سب تیری بے پرواہیوں کا نتیجہ ہے۔ میں تو کولہو کا بیل بنا سارا دن دکان پر جتا ہوتا ہوں۔ گھر کی خبر گیری کا ذمہ تجھ پر تھا۔ اب میں کس منہ سے باہر نکلوں گا۔ کیا خبر کس کس کو اس کا علم ہو گیا ہے؟ میں تو کہیں ڈوب مروں گا۔"

اکبر بولا۔

"اگرچہ بات شدید بدنامی کی ہے مگر آپ کو اب اس طرح نہیں سوچنا چاہیئے۔ ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا۔"

شیخ صاحب چیخے۔

"کیسے کہتے ہو کچھ نہیں بگڑا۔ میری تو بنی بنائی عزت پر پانی پھر گیا ہے۔ غضب خدا کا میری بیٹی اپنی فوٹو غیر مرد کو دے۔ اسے خط لکھے۔ میں نے اگر زہر نہ کھایا تو کسی طرف منہ اٹھا کر نکل جاؤں گا۔ میں تو کہتا ہوں ذرا فرخندہ کو بلاؤ۔ میں اس سے پوچھوں تو اس نے میرے کس گناہ کی مجھے سزا دی ہے۔ مجھ سے کس جنم کی برائی کا بدلہ لیا ہے۔"

اکبر اور والدۂ اکبر یہ نہیں چاہتے تھے کہ فرخندہ وہاں آئے بلقیس بھی ان سے متفق تھی لیکن شیخ صاحب نے وہیں سے چیخ کر فرخندہ کو بلا لیا۔ فرخندہ کو پتہ چل چکا تھا۔ کہ خالد نے مسعود سے اس کا کوئی خط حاصل کر کے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں سہمی بیٹھی تھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور بدن میں کاٹو تو لہو نہیں تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی الماری میں سے مسعود کے سارے خط نکال کر کمرے میں بچھی ہوئی دری کے نیچے پھیلا دیے تھے۔ اسے مسعود کی بے وفائی پر رونا آ رہا تھا۔ کہ اس نے خط خالد کے حوالے کیوں کر دیا؟ کیا اسے فرخندہ کی بدنامی کی ذرا پرواہ نہیں تھی۔ خالد تو بدفطرت تھا ہی۔ وہ ایسے موقع کی تلاش میں تھا مگر مسعود کو ایسا کبھی کرنا چاہیئے تھا۔ وہ تو فرخندہ سے محبت کرتا تھا۔ فرخندہ نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھی۔ جب اس نے اپنے باپ کی آواز سنی تو اس کی جان ہی نکل گئی اس کا جی چاہا کہ کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لے۔ وہ اپنے باپ کو اپنی شکل نہیں دکھا سکتی تھی۔

جب دوسری بار شیخ صاحب نے آواز دی تو فرخندہ ایک ٹھنڈی پھیکی لاش کی طرح

اٹھی اور اکبر کے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر نگاہیں زمین پر گاڑے کھڑی ہو گئی۔

شیخ صاحب نے قہر آلود نظروں سے فرخندہ کو دیکھا اور کڑک کر بولے۔

"یہ شرم پہلے کہاں چلی گئی تھی؟ تجھے تو میں پیدا ہوتے ہی مار ڈالتا تو اچھا تھا۔ کم بخت تو نے تو مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ تم نے اس بدمعاش کو خط کیوں لکھا؟ اسے تصویر کیوں دی؟ کتنی تصویریں اس کے پاس ہیں؟ بول۔۔۔!"

فرخندہ کے بدن میں لہو نام کو نہ رہا تھا۔ آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

شیخ صاحب کی آواز گونجی۔

"بولتی کیوں نہیں بدبخت؟"

فرخندہ کو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کر گرنے والی ہے۔ اس نے دروازے کی کنڈی کو تھام لیا۔ بدن سوکھی ٹہنی کی طرح ہوا میں جھولنے لگا۔ شیخ صاحب اچانک طیش کھا کر اٹھے اور انہوں نے فرخندہ کے سر پر تڑا تڑ جوتے برسانے شروع کر دیئے۔ بلقیس اور اکبر نے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور بڑی مشکل سے انہیں سنبھال کر چارپائی پر لے آئے۔

"خدا کے لئے اباجی بس کریں۔ محلے داروں نے سن لیا تو جگ ہنسائی ہو گی۔"

شیخ صاحب رو پڑے اور ناک صاف کر کے بولے۔

"کیا اب جگ ہنسائی نہیں ہو رہی؟ ابھی کیا کسر باقی رہ گئی ہے؟ مجھے تو کہیں سے تم لوگ سنکھیا لا دو میں اب زندہ رہ کیا کروں گا۔ میرا جیتے جی منہ کالا ہو گیا ہے؟"

بیوی سر جھکائے چپکے چپکے رو رہی تھی اور اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اکبر نے بلقیس کو اشارہ کیا۔ وہ فرخندہ کو وہاں سے نکال کر باہر لے گئی۔ جب شیخ صاحب کی حالت ذرا سنبھلی تو اکبر نے کہا۔

"اباجی ہمیں ٹھنڈے دل سے کام لینا ہو گا۔ اب مارپیٹ سے کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ بدنامی کے دھبے کو دھو ڈالا جائے اور جس سانپ نے سر اٹھایا ہے اسے یہیں کچل دیا جائے کیوں امی؟"

"سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فوراً بیاہ کر دیا جائے۔"

"اس سے بیاہ اب کون کرے گا۔ ہر شخص کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن اس پر اس کے کرتوت کھل جائیں گے اور یہ بھی بلقیس کی طرح گھر میں آن بیٹھے

گی۔ میری مصیبتوں کی ابتدا ہو گئی ہے۔ یہ اولاد اب مجھے قبر میں اتار کر ہی دم لے گی۔"

اکبر نے دو تین بار جلدی جلدی منہ کے اندر بناوٹی دانت کی پلیٹ اتار کر پھر سے لگائی اور عینک کے موٹے شیشے کے پیچھے آنکھیں جھپکا کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے اگر ہم خالد کا رشتہ منظور کر لیں تو یہ بات یہیں ختم کی جا سکتی ہے"

والدہ نے فکر مند ہو کر کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میری بہن اور اس کی بیٹیاں خاموش بیٹھی رہیں گی؟ وہ تو فرخندہ کا جینا حرام کر دیں گی اور غیروں سے بدتر سلوک کریں گی۔"

شیخ صاحب نے تائید میں کہا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ فرخندہ کی امی جو کیچڑ ہم پر اچھال دیا گیا ہے اب کبھی نہ اترے گا۔ اب تو اس لڑکی کا گلا ہی گھونٹنا پڑے گا۔ ہائے اس عمر میں یہ صدمہ بھی اٹھانا تھا۔"

اکبر بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر بولا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے خالد یہاں شادی کرنے کا بے حد آرزو مند ہے۔ اس نے یہ خط بھی اسی غرض سے لکھوایا ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی بے راہ روی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر ان لوگوں نے شادی کا پیغام بھی بھجوا رکھا ہے۔ ہم بڑی آسانی سے حامی بھر سکتے ہیں۔ اس طرح ہماری بات بھی رہ جائے گی اور آنے والی مصیبت سے بھی نجات مل جائے گی۔"

شیخ صاحب بولے۔

"اس کا کیا یقین ہے کہ خالد اپنی ماں بہنوں سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔"

"مجھے پورا بھروسہ ہے کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرے گا۔ ایک تو اسے منع کر دیا جائے گا۔ دوسرے فرخندہ جب اس کی بیوی بن جائے گی تو وہ قدرتی طور پر اسے دوسروں کے سامنے ذلیل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کل ہی خالہ کے گھر جا کر بات پکی کر دی جائے کیا خیال ہے امی؟"

والدہ فرخندہ نے بھاری آواز میں کہا۔

"اپنے باپ سے پوچھ لو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں"

شیخ صاحب نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اس کے ابھی دو کلمے پڑھا کر یہاں سے نکال کر باہر کرو۔ میں تو اس کی شکل تک نہیں دیکھ سکتا۔ بس یہی مناسب ہے۔ فرخندہ کی ماں۔ تم پہلے یہ کام کرو کہ اس بدبخت کو گھر میں بند کر دو۔ کل سے یہ بالکل باہر نہ نکلنے پائے۔ نہ یہ کسی سہیلی کے ہاں جائے اور نہ کوئی سہیلی اسے ملنے آئے پھر سمن آباد والوں کے ہاں جا کر بات پکی کر لو۔ لیکن اکبر----- بات طے کرنے سے پہلے تو خالد سے مل کر اپنی تسلی کر لو کہ وہ بعد میں ہماری عزت سے کھیلنے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔ تم یہ خط تو ابھی جلا دو۔"

"فکر نہ کریں میں صبح ہی اس سے مل لوں گا۔"

اس کے بعد اس نے جیب سے خط نکال کر لفافے سمیت اسے دیا سلائی سے آگ لگا دی۔ شعلہ بلند ہوا تو اس کی روشنی میں ہر شخص کا پژمردہ چہرہ زیادہ افسردہ اور پریشان دکھائی دینے لگا۔ جب خط جل کر راکھ بن گیا اور بدنامی کا شعلہ ایک بار بلند ہو کر ان لوگوں کے خیال میں بجھ گیا تو وہ آہیں بھرتے، جھکی ہوئی کمریں، بوجھل قدم، پھیکے بے چین چہرے اور الجھے ہوئے خیالات لے کر اٹھے اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر لیٹ گئے اور سونے کی کوشش میں آہیں بھرنے اور اضطراب سے بار بار پہلو بدلنے لگے۔ اپنے کمرے میں بتی گل کر کے فرخندہ پلنگ پر اوندھی پڑی ہچکیاں لے لے کر روئے جا رہی تھی اسے اتنی بے عزتی، ہزیمت اور ذلالت زندگی میں کبھی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ یہ خیال بچھو بن کر اس پر ڈنک چلا رہا تھا کہ وہ گھر بھر کی پریشانی اور ذلت کا باعث بنی ہے اور اس جوان عمر میں اسے سب کے سامنے مارا گیا ہے۔ اسے مسعود اور خالد ایک ہی محاذ پر کھڑے مشترک دشمن کی شکل میں اس پر گولیاں برساتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے منہ میں کپڑا لے کر دانتوں سے کاٹ رہی تھی اور دائیں بائیں تکیے پر سر مار رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا۔ گویا وہ گلی میں سب کے سامنے ننگی کر دی گئی ہو اور لوگوں نے پتھر اٹھا اٹھا کر اس پر مارے ہوں۔

۱۸

اس رات وسن پورے والے مکان میں جس کی پیشانی پر ہذا من فضل ربی لکھا تھا کوئی بھی سکھ کی نیند نہ سو سکا۔ شیخ صاحب نصف شب تک تو اپنی بدنامی اور جگ ہنسائی کے خوف سے جاگتے رہے۔ اور باقی رات انہوں نے اس تشویش میں گذار دی کہ شادی پر کتنا خرچ اٹھے گا۔ ایک دفعہ وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور تجوری میں سے کاپی نکال کر انہوں نے بتی جلائی اور اس پر لکڑیوں، چاول، مسالے، براتیوں، زیورات اور شادی کے دیگر اخراجات کا حساب لکھنا شروع کر دیا۔ نہیں نہیں یہ شادی سیدھے سادے طریقے سے ہونی چاہیئے۔ بس دو کلمے پڑھا کر تینوں کپڑوں میں رخصت کر دینا چاہیئے۔ ایسی نافرمانبردار لڑکی پر تو میں ایک پائی بھی خرچ نہیں کروں گا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ لڑکے والے کیا کہیں گے۔ اس طرح تو ان لوگوں کو خواہ مخواہ کا شک ہو گا۔ کہ جانے کیا بات تھی لڑکی کو دو کپڑوں میں گھر سے نکال دیا۔ بتی بجھا کر وہ پھر لیٹ گئے۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ آنکھیں درد کرنے لگیں تھیں۔ جسم ٹوٹ رہا تھا لیکن دماغ بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے بیاہ میں خرچ ہونے والی ایک ایک پائی کا حساب لگا رہا تھا۔ اکبر یہ سوچتا رہا کہ صبح خالد کے ساتھ اسے نیچا ہو کر بات کرنی ہو گی۔ وہ کس انداز میں خالد سے گفتگو کرے۔ کہ اس ذلت کا احساس کم سے کم ہو۔ فرخندہ کی والدہ کو اس خیال نے جگائے رکھا کہ جس بہن کو اس نے ٹال دیا تھا۔ اب کس طرح اس کے گھر اپنی طرف سے بات پکی کرنے جائیں گی۔ بلقیس کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی پریشانیوں کے احساس نے سونے نہ دیا۔ اس کو اپنی دکھوں بھری زندگی کے تلخ تجربات نے نرم دل اور دردمند بنا دیا تھا۔ وہ کسی کی تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس دردانگیز واقعہ نے اسے اپنی ساری مصیبتیں یاد دلا دی تھیں۔ اسے اپنی شادی کی شروع شروع کی رنگین اور پرسکون زندگی کا خیال آیا۔ وہ کتنی شادکام اور خوش رہا کرتی تھی۔ ہر دن خواب تھا اور ہر رات ایک رنگین خیال بن کر گزر جایا کرتی تھی۔ پھر جیسے کس نے خوشبوؤں اور پھولوں سے بھرے ہوئے مرغ زار میں آگ لگا دی خاوند نے شراب پی کر اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ بلقیس کو اپنے شرابی اور ظالم خاوند کا خیال ستانے لگا۔ جانے وہ کہاں ہوں گے؟ کس حال میں ہوں گے؟ انہیں کوئی کھانا پکا کر بھی دیتا ہو گا یا نہیں؟ شراب کے نشے میں سو جاتے ہوں گے تو ان کے جوتے اتار کر کون پلنگ پر سلاتا ہو گا؟ بھلا کسی کو کیا پڑی ہے کہ ان کی خبر گیری کرے۔ انہوں نے کیوں اسے گھر سے نکال باہر کیا۔ مجھے وہیں پڑی رہنے دیتے۔ چاہے مجھے لاکھ مارتے پیٹتے۔ چاہے ہزار بار رنڈیوں سے عشق کرتے۔ ان کے بغیر میرا اور کون ہے؟

فرخندہ کافی رات گئے تک بے چین و بے قرار رہی اور بستر پر پہلو بدلتی اور بار بار اٹھ کر صراحی سے پانی پیتی رہی۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن کوئی نہ کوئی ڈراؤنا خواب اسے چونکا دیتا اور وہ دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتی۔ صبح سوائے اسلم کے جس کو کسی بات کا علم نہ ہونے دیا گیا تھا۔ اس گھر کے ہر آدمی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہروں پر تھکن اور پژمردگی کے آثار تھے۔ ایسے چہرے عام طور پر ان لوگوں کے ہوتے ہیں جنہیں ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ساری رات کسی صندوق پر بیٹھ کر بسر کرنی پڑتی ہے۔ فرخندہ اپنے کمرے سے بالکل باہر نہ نکلی۔ وہ کسی کو اپنی شکل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ خاص طور پر بھائی جان اکبر اور اپنے والد کی نگاہوں سے تو وہ ہمیشہ کے لیئے روپوش ہو جانا چاہتی تھی۔ بلقیس اس کا ناشتہ اوپر کمرے میں ہی لے آئی۔ اس نے بڑی منت سماجت سے فرخندہ کا منہ ہاتھ دھلایا اور پاس بیٹھ کر ایک پیالی چائے اور آدھا پراٹھا کھلایا۔ اس کے بعد وہ وہیں اون اور سلائیاں لے کر بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتوں میں اس کا دھیان کسی دوسری طرف لگانے کی کوشش کرتی رہی۔

اکبر صبح دفتر جا کر اس ادھیڑ بن میں پڑا رہا کہ خالد کو کس طرح وہاں بلوائے۔ کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک اس کا فون آ گیا۔ اکبر نے اسے دفتر آ کر مل جانے کو کہا۔ خالد نے جواب دیا۔

"میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

خالد نے ذرا بھی دیر نہ کی اور فوراً تانگہ پکڑ کر اکبر کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے اکبر اسے ساتھ لے کر مال روڈ پر ایک ریستوران میں آ گیا اور چائے منگوا کر اس سے گفتگو شروع کر دی۔ اس نے خالد کو بتایا کہ حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے اور فرخندہ کو اس کی خالہ کے

ہاں بیاہ دیا جائے۔

"گویا آج سے کچھ عرصہ پہلے خالہ جان جو رشتہ لے کر ہمارے ہاں آئی تھیں ہمیں وہ رشتہ منظور ہے۔ اس کی تصدیق امی اور بلقیس آج کل میں تمہارے ہاں جا کر کر دیں گی۔ لیکن میں ایک بات کی تم سے ضمانت لینا چاہتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ تم ایسا عقل مند آدمی اسے سے انحراف نہیں کرے گا۔"

خالد فتح مندی کی خوشی میں جھوم رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر مگر سر غرور سے اٹھا کر پوچھا۔

"کس بات کی ضمانت؟ آپ فرمائیں تو؟"

"صرف اس بات کی کہ تم اس خط والے قصے کو اپنے تک ہی محدود رکھو گے اور کبھی اپنے گھر کے کسی فرد سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔"

"میں آپ کو مردوں کا قول دیتا ہوں کہ آج کے بعد آپ کبھی کسی کی زبان سے اس قصے کی بازگشت نہیں سنیں گے۔ بھائی جان میرا دل تو رازوں کا کنواں ہے۔ اس میں جب کوئی بھید گرا دیا جاتا ہے تو پھر ساری عمر باہر نہیں نکل سکتا۔ آپ بے فکر رہیے۔ مجھے آپ لوگوں کے ناموس کا اپنے سے بڑھ کر خیال ہے۔ یہی احساس تھا جس نے مجھے ہزار جتن سے یہ خط نکلوانے پر مجبور کر دیا۔ بھلا میں اپنے خاندان کی بدنامی گوارا کر سکتا ہوں۔"

اکبر کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے پرچ میں رکھی ہوئی خالی پیالی کو گھمائے جا رہا تھا۔ وہ خالد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب اس کے ساتھ اپنی بہن کا رشتہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ صرف اس لئے کہ ان کا خاندان بدنامی کے کلنک سے محفوظ رہ سکے۔ خالد تو اپنی جیت کے نشے میں چور تھا اور اس کا چیچک زدہ بدصورت چہرہ خوشی سے نہال ہوا جا رہا تھا۔ آنکھیں اس سانپ کی طرح چمکنے لگی تھیں جس نے اپنے شکار کو کنڈلوں میں پھنسا لیا ہو اور اب اسے کھا جانے کی تیاریاں کر رہا ہو۔ وہ بڑا باادب ہو کر باتیں کر رہا تھا۔ مگر دل میں اکبر اور اس کے سارے کنبے والوں کو اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھ رہا تھا۔ اس کی تشبیہ تو ہم بلا جھجک اس چوہے سے دے سکتے ہیں جس نے اپنی مکاری سے شیر کو رسیوں میں جکڑ لیا ہو اور اب اس کے چاروں طرف اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہا ہو اور سینہ تان تان کر دکھا رہا ہو۔

دو ایک دن بعد فرخندہ کی امی اور بلقیس سمن آباد خالد کے گھر پہنچ گئیں۔ انہوں نے خالد کی والدہ سے کہہ دیا کہ لڑکی کے باپ نے حامی بھر دی ہے اور اب آپ کسی روز ہمارے

ہاں تشریف لا کر دودھ پی جائیں۔ فرخندہ کی والدہ نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

"بہن میں اس لئے خود حاضر ہوئی ہوں کہ لڑکی والی ہوں اور پھر تم پہلے ہی دو ایک بار تکلیف کر چکی ہو۔"

خالد کی امی مسکرا کر بولیں۔

"تمہارا اپنا گھر ہے بہن۔ اور پھر فرخندہ تو میری اپنی بچی ہے۔ لیکن میں منہ میٹھا کرائے بغیر نہ جانے دوں گی۔"

اگلے روز خالد کے گھر سے عورتوں کا پورا ٹولہ وسن پورے آن حاضر ہوا اور دودھ پی کر بات پکی کر کے چلا گیا۔ اتوار کو خالد اور فرخندہ کی منگنی کر دی گئی۔ خالد کی ماں نے سونے کی انگوٹھی رومال اور تاری والا دوپٹہ دیا۔ لڑکی والوں کی طرف سے بھی انگوٹھی رومال اور گرم سوٹ کا ٹکڑا پیش کیا گیا۔ فرخندہ کے تابوت میں آخری میخ بھی ٹھونک دی گئی تھی۔ اسے گھر کی چار دیواری میں بند کر کے رکھ دیا گیا۔ وہ ان دنوں میں ڈھل کر کمزور ہو گئی۔ جسم دبلا ہو گیا اور منہ چھوٹا سا نکل آیا۔ گھر میں سوائے بلقیس اور اسلم کے کوئی بھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کرتا۔ صرف ایک ماسٹر جی ہی تھے جو ہر حالت میں اس کے غم خوار تھے اور اس کی ہر طرح دلجوئی کرتے۔ انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ان کا دل فرخندہ کی حالت زار دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا تھا مگر وہ اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود مجبور اور بے بس تھے۔ اس گھر میں ان کی حیثیت محض ایک پڑھانے والے استاد کی تھی جو ان لوگوں کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا مجاز نہیں تھا۔ اس گھر سے باہر ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی ان کے اپنے گھر میں ان کے ساتھ نوکروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ سوسائٹی میں انہیں ایک ادھیڑ عمر کا احمق بچہ تصور کیا جاتا تھا۔ جسے اپنے برے بھلے کی پہچان ہی نہ ہو۔ لوگ ان کی باتیں دل پر جبر کر کے سنتے اور ان کی پیٹھ مڑتے ہی آوازیں کستے تھے۔ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ محلے والوں نے کسی بات میں کبھی ان سے مشورہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جاتا تو بس اتنا کہ محلے میں کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو ماسٹر جی سے اس کا اشتہار لکھوا لیا جاتا۔ سوسائٹی نے تو انہیں بے کار شے سمجھ کر رد کر رکھا تھا۔ جس طرح کرم خوردہ کتاب اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں پرانے جوتوں کے ساتھ رکھ دی جاتی ہے وہ سوائے فرخندہ کے ساتھ غم کھانے اور اس کی ہر آہ کے ساتھ آہ بھرنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے

تھے۔ مصیبت زدہ کی دلجوئی کرنے میں بھی تو اپنی طرف سے تھوڑی بہت مدد کی پیش کش کرنی پڑتی ہے۔ چاہے وہ محض حوصلہ دلانے کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ہمارے ماسٹر جی تو یہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جیسے جیسے فرخندہ لاغر ہوئی جا رہی تھی۔ ماسٹر جی بھی ڈھلتے چلے جا رہے تھے وہ دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو گئے اور ان کے ہاتھ کی رگیں باہر کو ابل آئیں۔ چہرے کی لکیریں گہری ہو کر زخموں کا نشان دکھائی دینے لگیں۔ ایک دن فرخندہ ان کے سامنے بہت روئی۔ گھر میں سوائے بلقیس کے اور کوئی نہیں تھا۔ باقی سب لوگ خالد کے ہاں سمن آباد مٹھائی کا تھال لے کر نکاح کی تاریخ لینے گئے تھے۔ کیونکہ شیخ صاحب کا اصرار تھا کہ اس کام سے جتنی جلدی ہو جائے نپٹ لیا جائے ماسٹر جی سے سبق لیتے اس کا دل اپنے دکھوں اور آنے والی زندگی کا تصور کر کے بھر آیا اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو کتاب پر گرنے لگے۔ اس نے بازوؤں میں منہ دے لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماسٹر جی پریشان ہو کر خود بھی آب دیدہ ہو گئے۔ انہوں نے پہلے رومال سے عینک اتار کر اپنی آنکھیں پونچھیں اور دوبارہ عینک لگا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔

"میں تمہارا دل کیسے بہلاؤں۔ میں تمہیں کیوں کر تسلی دوں۔ تمہیں کس طرح کہوں کہ فرخندہ روؤ نہیں۔ رونے سے جی تو ہلکا ہو جاتا ہے مگر غم کا پتھر روح کے گہرے پانی میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں تمہارے آنسو کس برتے پر پونچھوں؟ اور پھر میں جو تمہارے ساتھ ہی رونے لگا ہوں تو اپنے آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ غم دراصل تمہارا غم ہے یا میرا۔ یہ زخم اصلیت میں تیرے دل پر لگا ہے یا اس نے میرے جگر کے ٹکڑے کر دیئے ہیں؟ کیا خبر چوٹ کہاں لگی ہے اور درد کہاں ہو رہا ہے؟ کسے ہو رہا ہے؟ لیکن تم روؤ نہیں فرخندہ! کیونکہ میری بوڑھی آنکھیں تمہاری اشک باری کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ تمہارے تو صرف آنسو ہی نکلیں گے لیکن میری تو جان بھی نکل جائے گی۔ میں اس طرح نہیں مرنا چاہتا۔ میں تمہیں روتا دیکھ کر نہیں مرنا چاہتا۔ کسی کے ایک بچہ ہو تو وہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ اور میرے تو ایک بھی نہیں۔ میں تو اگر ساری کائنات بھی تم پر قربان کر دوں تو میری محبت کا حق ادا نہ ہو گا۔ کیونکہ میں ایک کروڑ باپوں کی ایک کروڑ بیٹیوں سے بھی بڑھ کر تم سے پیار کرتا ہوں۔ پھر میرے پاس تو تم پر یا اپنے اس پیار پر لٹوانے کے

لئے سوائے ان بوڑھی آنکھوں کے پھیکے بے جان آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہیں۔ کاش میری اتنی حیثیت ہوتی کہ میں تم ایسی لڑکی کے لائق باپ بن سکتا"۔

فرخندہ کو ماسٹر جی کی باتوں سے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے دوپٹے سے آنسو خشک کئے اور ہونٹوں کو دانتوں تلے داب کر کتاب پر نظریں جھکا دیں۔ لیکن وہ بدستور سسکیاں لے رہی تھی۔ کیونکہ خالد سے اس کے بیاہ کی تاریخ مقرر ہو رہی تھی اور مسعود اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہا تھا۔ ماسٹر جی نے فرخندہ کو آنسو روکے دبی دبی سسکیاں لیتے دیکھا تو انہیں یوں لگا گویا ان کا اپنا دم گھٹا جا رہا ہے اور ان کی دکھیا روح کمزور ناتواں جسم کی قید سے باہر نکلنے کو تڑپ رہی ہے۔ ان کی دھندلائی ہوئی غمگین آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جنم جنم سے روتی آئی ہیں۔ جس طرح سمندر کنارے کا وہ پتھر جو لہروں کی مسلسل مار سہہ کر چھلنی ہو گیا ہوتا ہے۔ وہ فرخندہ کی انگلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے کتاب کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور کانپ رہی تھیں۔

"مجھے بتاؤ فرخندہ! میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ کیا میں اس قابل ہوں فرخندہ! کہ تمہارے لئے کچھ کر سکوں؟ کیا اب بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ کیا ابھی دن کی روشنی کچھ باقی ہے؟ تم مجھے جس طرح کہو گی میں اسی طرح کروں گا۔ کیا میں تمہارے ابا جی سے بات کروں کہ تم اس رشتے کو ناپسند کرتی ہو؟"

فرخندہ نے تڑپ کر ماسٹر جی کی طرف دیکھا اور بڑی حسرت سے سر ہلا کر بولی۔ "نہیں نہیں --- خدا کے لئے ایسا نہ کریں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ میں خالد سے بیاہ کرنا نہیں چاہتی۔ میرے ساتھ وہ آپ کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ یہ شادی صرف اسی صورت میں رک سکتی ہے کہ میں زہر کھا لوں"۔

"ایسا نہ سوچو فرخندہ --- تم زہر کھا کر مر گئیں تو تمہارے ماں باپ کی زیادہ بدنامی ہو گی۔ پھر انہیں زندگی میں ہزار بار مرنا اور لاکھوں بار ذلیل ہونا پڑے گا"۔

فرخندہ کو بجلی ایسی تیزی سے ایک خیال آیا وہ جلدی سے اٹھ کر میز پر گئی۔ کاپی کھول کر پنسل سے ایک خط لکھا۔ اسے لفافے میں بند کیا اور ماسٹر جی کو دیتے ہوئے بولی۔

"میرا صرف اتنا کام کر دیجئے۔ کہ یہ خط صبح سویرے مسعود کو پہنچا دیجئے"۔

ماسٹر جی نے پوچھا۔

"کیا تمہیں اب بھی اس سے کوئی امید ہے؟"

فرخندہ نے آنکھیں بند کرلیں۔

"اسی امید پر تو زندہ ہوں"۔

ماسٹر جی کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ انہوں نے آگے کو جھک کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کا رنگ پیلا ہو کر بھوسلا پڑ گیا اور خالی سینے کے اندر سانس یوں کھڑکھڑانے لگا جیسے کنوئیں کے اندر پھینکا ہوا ڈول کناروں سے بج کر کھڑکھڑاتا ہے۔ فرخندہ وہاں سے جا چکی تھی۔ ماسٹر جی نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ ایک پل کے لئے بالکل بے حس و حرکت سے ہو کر بیٹھے رہے اور گل دان میں پڑے پھولوں کو پتھر کی مورتی کی آنکھوں سے تکتے رہے۔ یہ پھول آج سے ہفتہ بھر پہلے ماسٹر جی فرخندہ کے لئے لائے تھے اور اب وہ مرجھا کر اپنے ڈنٹھلوں پر جھک آئے تھے۔ ماسٹر جی اٹھ کر چلنے لگے تو وہ لڑکھڑا سے گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ کسی دوسرے کی ٹانگوں پر کھڑے ہیں۔ اور ان کی اپنی ٹانگیں جواب دے گئی ہیں۔

ساری رات انہوں نے جاگ کر گزار دی۔ نیند کانٹا بن کر رات بھر ان کی آنکھوں میں چبھتی رہی۔ اس حالت میں انہوں نے اپنی روگی بیوی کی بھی تیمارداری کی۔ کبھی اس کا سر دباتے، کبھی پاؤں، تین بار اسے پانی پلایا۔ ایک بار چائے کیتلی میں گرم کرکے دی۔ اب ان کی بیوی کو ایک نیا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ خون میں تیزابی مادے کے پیدا ہو جانے سے اس کی گردن اور انگلیوں کی جڑوں میں چنبل نکل آئی تھی آدھی رات کو ماسٹر جی نے اس کی گردن اور ہاتھوں پر مرہم لگا کر کپڑا لپیٹ دیا۔ اس مرہم میں سے گندھک کی بو اٹھ رہی تھی۔ جس نے کوٹھڑی کی فضا کو بوجھل بنا دیا تھا۔ کوٹھڑی کے اندھیرے میں ان کی بیوی اپنی کھاٹ پر پڑی ناخنوں سے گردن اور ہاتھ کھجلاتی اور کراہتی رہی اور وہ آنکھیں کھولے ہاتھ کی انگلیوں پر کچھ گنتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔۔۔۔ انہوں نے زندگی بھر کبھی کسی بات پر سوچ بچار نہیں کی تھی مگر اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی سوچ کی ایک ایسی الجھی ہوئی ڈوری ہے جس کا سرا کبھی نہیں مل سکتا۔

دو بار انہوں نے اپنی نحیف سی آواز سنی۔ جیسے وہ فرخندہ کو پکار رہے ہوں۔ وہ چونک پڑے انہوں نے آنکھیں ادھر ادھر گھما کر تاریکی میں دیکھا۔ ایک دفعہ انہیں فرخندہ کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے لیٹے ہی لیٹے گردن اٹھا کر اپنے دائیں بائیں

دیکھا کچھ بھی نہیں۔ کہیں بھی کچھ نہیں۔۔۔۔ بیوی نے گردن کے خارش زدہ چمڑے میں ناخون چبھوتے ہوئے پوچھا۔

"تم کیوں جاگ رہے ہو؟"

"سر میں درد ہے شاید"۔

"ہاتھ سے سر دباؤ اور سو جاؤ۔ بار بار چارپائی چرچرا کر میری نیند حرام نہ کرو"۔

ماسٹر جی لاش کی مانند بے حس ہو کر پڑ گئے۔ لیکن کوئی شے بار بار ان کے سینے سے ٹکرا رہی تھی اور انہیں سونے نہیں دے رہی تھی۔ پھر انہیں یوں لگا جیسے کسی بچے کا ننھا سا ہاتھ ان کی انگلی پکڑ کر انہیں چارپائی سے اٹھا دروازے کی طرف لئے جا رہا ہے۔ رات خنک تھی اور گلی میں سناٹا طاری تھا۔ صرف نکڑ والا حلوائی کڑاہی کی کھرچن کھرچ رہا تھا۔ ماسٹر جی نے ایک بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس طرح ان کی آنکھیں بند ہو گئیں مگر پاؤں کا انگوٹھا اضطراب کے عالم میں چادر کے اندر ہی اندر چلتا رہا۔

سویرے انہوں نے سکول سے چھٹی کرلی اور فرخندہ کا خط لیکر مسعود کے کالج کی طرف چل پڑے۔ ابھی کالج لگا نہیں تھا لڑکے لڑکیاں آ رہی تھیں۔ لڑکے لان میں یہاں وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اور لڑکیاں اپنے کامن روم میں جمع ہو رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ مسعود ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ والے گھاس کے قطعے میں ایک ٹوٹے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے جیب سے سگریٹ نکال لیا اور اسے جلا کر چپکے چپکے پیتے رہے۔ انھیں ایک دم کھانسی آ گئی اور وہ دیر تک کھانستے رہے کھانسنے سے ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ انھوں نے جیب سے میلا نمدا بنا رومال نکال کر عینک کے پیچھے سے آنکھیں پونچھیں اور ویران آنکھیں کھولے گیٹ کی طرف تکنے لگے۔ انھیں مسعود گیٹ میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ماسٹر جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسعود نے بھی ماسٹر جی کو دیکھ لیا تھا اور دل میں سوچنے لگا تھا کہ یہ بیمار سا بڈھا کیا اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں مجھے اس میلے کچیلے بے وضع بوڑھے کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر کیا خیال کرتی ہوں گی۔ میرے تو نوکر کے کپڑے اس کھوسٹ کے کپڑوں سے زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ میں آج اسے کہہ دوں گا کہ وہ آئندہ یہاں نہ آیا کرے۔ ظاہر ہے فرخندہ کا خط لایا ہوگا۔ مجھے اب فرخندہ سے کیا مطلب۔۔۔۔

اس کی محبت تو اب میرے لیے بوجھ بننے لگی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کا جال پھیلا رہی ہے۔ بھلا میں اپنے جال میں پھنسائی ہوئی چڑیا کے دام میں الجھ سکتا ہوں وہ زمانہ ٹھیک تھا۔ تیسرے چوتھے روز کی ملاقات۔ ہوٹل کا کیبن۔ سینما کا بکس۔ محبت کا جوش۔ جسمانی لذت کا خمار اور دو تین روز کے لیے پھر چھٹی۔ مگر یہ لڑکی تو میرے لیے وبال جان بنتی جا رہی ہے۔

ماسٹر جی نے مسعود کو قریب آتے دیکھ کر سلام کیا جس کا جواب مسعود نے یونہی سا سر ہلا کر دیا اور ذرا ترش روئی سے بولا۔

"کوئی خط لائے ہو کیا؟"

"جی ہاں"

اور ماسٹر جی نے ایسی گرم جوشی اور بھولے پن سے لفافہ نکال کر مسعود کو دیا۔ جس طرح کوئی کم سن لڑکا اپنے ساتھی کو کھیل میں جیتی ہوئی گولیاں نکال کر دکھاتا ہے۔ مسعود ایک طرف درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کالج کے لڑکے اور خاص طور پر لڑکیاں اسے ایک پھٹے حالوں گندے مندے بڈھے کے ساتھ رازداری کی باتیں کرتے دیکھیں۔ ماسٹر جی بھی اس کے ساتھ ہی درخت کی آڑ میں ہو گئے۔ انھیں اس بات کا خیال بھی نہ ہوا کہ مسعود کو ان کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی بُو ناگوار محسوس ہو رہی ہے۔ مسعود منہ دوسرے طرف کر کے فرخندہ کا خط پڑھنے لگا۔ ماسٹر جی کو اب مسعود کے چمکیلے اور دبا دبا کر پیچھے کو بنائے ہوئے بال، نسواری رنگ کی گرم قمیض، خوب رگڑ رگڑ کر مونڈھے ہوئے گال اور کپڑوں سے آتی عطر کی لطیف خوشبو بُری لگ رہی تھی کیوں کہ فرخندہ کا حال اس سے بالکل برعکس تھا۔ اس شخص کی محبت نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی اسے گھر بھر میں سب کے سامنے ذلیل کر دیا تھا۔ اور اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ یہ اسی طرح بن ٹھن کر گھر سے نکلا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ مسعود نے خط پڑھ کر لفافے میں دوبارہ بند کیا اور اپنے ہاتھ سے ماسٹر جی کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"اس پاگل لڑکی سے کہنا کہ میں مجبور ہوں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اب جو کچھ ہو گیا ہے اسے ہنسی خوشی برداشت کر لے۔ ماں باپ کی عزت سے کھیلنا اچھی بات نہیں ہوتی۔"

مسعود آگے بڑھنے لگا تو ماسٹر جی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مسعود کو یوں لگا جیسے کسی غلیظ نقاہت کے مارے ریچھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ کراہیت سے اس پر سنسنی سی طاری ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دل میں کہنے لگا۔ اب غسل خانے میں جا کر تین بار صابن

سے ہاتھ صاف کرنے ہوں گے۔ ماسٹر جی لجاجت سے بولے۔

"بیٹا تمھیں اس کو ضرور تسلی دینی چاہیے۔ اس کی حالت بڑی خراب ہے۔ رو رو کر اس نے اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔ تمھاری وجہ سے گھر میں اس کو مارا پیٹا بھی گیا ہے۔ مگر وہ پریم پجارن ابھی تک تمھارے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ کل مجھے تمھارا خط دے کر کہنے لگی۔ میں تو اسی کی امید پر زندہ ہوں، بے چاری نے کتنی بے بسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔"

مسعود جیسے جیسے سن رہا تھا کہ ایک لڑکی اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی ہے اور گلے میں پھندا ڈال کر خود کشی کے منصوبے بنا رہی ہے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر خوش تو ہو سکتا تھا مگر یہ کبھی نہیں سننا چاہتا تھا کہ وہی لڑکی بوریا بستر باندھ کر اس کے گھر ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈالنے آ رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔

"اسے کہو میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

ماسٹر جی نے کہا۔

"لیکن بیٹا تم نے تو اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ وعدہ کیا تھا کوئی اشٹام لکھ کر نہیں دیدیا تھا زندگی میں انسان وعدہ کرتا ہے تو کچھ مجبوریاں اسے وعدہ توڑنے پر مجبور بھی کر دیتی ہیں۔ ایسی کونسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مجھ سے شادی نہیں ہو سکی تو کسی اور مرد سے کر لے۔ آخر اسے مرد ہی سے شادی کرنا ہے ناں۔ میں نہیں تو کوئی اور سہی۔"

ماسٹر جی کا جی چاہا کہ وہ مسعود کو چیخ چیخ کر کہیں کہ تو جھوٹا ہے۔ مکار ہے۔ بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلا کر ان کی زندگیاں تباہ کرتا ہے۔ پہلے انھیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے سبز باغ دکھاتا ہے اور پھر انھیں بے شرمی، بے عصمتی اور بدکاری کے گھناؤنے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن یہ سارے جملے ایک ایک کر کے ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ پانی کے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ پھٹتے بھی چلے گئے۔

انھوں نے ایک بار پھر بڑی عاجزی سے سر ایک طرف جھکا کر کہا۔

"اگر تم اسے تسلی کے دو بول لکھ دو تو اس کا جی سنبھل جائے گا۔ مجھے ڈر ہے بیٹا کہیں بد نصیب دکھیاری زہر نہ کھا لے۔ تمھارا اس میں کوئی ہرج نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا غم بہل جائے گا۔"

"مگر میں اسے کیا لکھوں کہ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ یا جیسے کہ اس نے خط میں لکھا ہے اس کے ساتھ یہاں سے بھاگ جاؤں؟ میرے ماں باپ کی عزت بنی ہوئی ہے۔ میرا اپنا ایک مستقبل ہے۔ شاندار مستقبل۔ صرف ایک ضدی لڑکی کے لیے میں یہ سب کچھ قربان نہیں کر سکتا۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔"

ماسٹرجی نے مسعود کا دامن تھام لیا۔

"میں یہ بات نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فرخندہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ تم نے ذرا تسلی کا لفظ لکھ دیا تو وہ خوشی سے ناچنے لگے گی۔ وہ تم سے پیار جو کرتی ہے۔ تم اسے بہلانے کے لیے جھوٹ موٹ ہی لکھ دو کہ تم نے اس کی بات مان لی ہے۔"

مسعود نے ماسٹرجی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اسے ماسٹرجی کی باتوں سے زیادہ اس بات نے تکلیف دی کہ انھوں نے اس کی گرم قمیض کو کیوں پکڑا۔ ایسا کرنے سے اس کی قمیض ایک طرف سے پتلون میں سے تھوڑی سی باہر نکل آئی تھی اور اس کے گھیرے کی ساری ترتیب اور سلیقہ غارت ہو گیا تھا۔

"تم ہاتھ قابو میں رکھ کر بات نہیں کر سکتے؟"

ماسٹرجی نے دونوں ہاتھ اپنے اندر کو دھنسے ہوئے سینے پر جوڑ لیے۔

"تم اس محبت کی ماری کا حال کیا جانو۔ تم نے محبت نہیں کی ناں تمھیں اگر ویسی ہی محبت ہوتی تو آج تمھارا حال اس سے بہتر نہ ہوتا۔ میں تو اسی غم نصیب کی زبان منہ میں رکھ کر بول رہا ہوں۔ اسی کے دل کا درد اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بیان کر رہا ہوں۔ الفاظ اس کے ہیں، آواز میری ہے۔ درد اس کا ہے، دل میرا ہے۔ میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں۔ مجھے تو اس کی خوشی، اس کا سکھ چاہیے۔ آخر میں اس کا استاد جو ہوا۔"

مسعود نے باہر نکلی قمیض کے دامن کو پتلون کے اندر کیا۔ چمڑے کی چمکیلے بکسوئے والی رنگ دار پیٹی کو کس کر پھر سے باندھا اور گردن اٹھا کر بولا۔

"تو پھر اسے جا کر کہہ دو کہ جہاں ماں باپ چاہتے ہیں وہاں شادی کر لے۔"

اتنا کہہ کر وہ چلنے کے لیے گھوما۔ پھر رکا۔

"اور ہاں ----- اس کے بعد تم خط لے کر یہاں مت آنا"

مسعود چلا گیا اور ماسٹر جی اُسے گھاس کا پلاٹ عبور کر کے، برآمدے سے گزر کر نیم تاریک غلام گردش میں گم ہوتے دیکھتے رہ گئے۔ مسعود نے کتابیں ایک دوست کو پکڑائیں۔

غسل خانے میں جا کر صابن سے اچھی طرح ہاتھ صاف کیے۔ آئینے میں جھک کر اپنا چہرہ دیکھا۔ پتلون کی پچھلی جیب سے کنگھی نکال کر بالوں کو کنپٹیوں پر اچھی طرح سے جمایا اور اپنے عکس پر بڑی مغرور نگاہ ڈال کر باہر آ گیا۔ اس نے فرخندہ کو یوں الگ کر کے پھینک دیا تھا۔ جس طرح کوئی کنگھی میں سے سر کے اکھڑے ہوئے بال نکال کر پھینکتا ہے۔ ماسٹرجی کتنی ہی دیر گھاس پر کھڑے رہے۔ پھر وہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ کالج لگ گیا لڑکے لڑکیاں کلاسوں میں چلی گئیں۔ ماسٹرجی بنچ پر کندھے جھکائے بیٹھے رہے۔ دھوپ کالج کی عمارت سے اتر کر گھاس پر آ گئی تھی۔ ماسٹرجی کے اوپر بڑ کا درخت تھا جس میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ ماسٹرجی کو ان کی آوازوں کا ہلکا سا احساس بھی نہیں تھا۔ ایک پرندے کی بیٹ پتوں میں سے ہوتی ان کے کندھے پر آن پڑی۔ ماسٹرجی کو تب بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ بت بنے بیٹھے رہے جس طرح ایسے ہی ایک پیڑ کے تلے آج سے ہزاروں سال پہلے ہندوستان کا ایک دکھی دل شہزادہ بدن پر راکھ ملے بیٹھا تھا۔ اس کا دل بھی لوگوں کی بے انصافیوں، سنگدلی اور دکھوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ وہ لاکھوں لوگوں کے مصائب کے ہجوم میں اپنی مکتی، اپنی نجات کا متلاشی تھا اور یہ میلا کچیلا سا منحنی و نحیف سا شکستہ دل بوڑھا صرف ایک انسان کی نجات، ایک زندہ روح کی مکتی کے لیے لاکھوں غموں، لاکھوں مصیبتوں، لاکھوں دکھوں اور پریشانیوں کو اپنائے ہوئے تھا۔ شاید اسی میں اس کی اپنی مکتی، اپنی نجات بھی تھی۔ کافی دیر بعد جب کالج کا گھنٹہ بجا تو ہمارے ماسٹرجی بنچ پر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے، گیٹ میں گزر کر سڑک پر آ گئے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ کالج کے لان میں اب کوئی نہیں تھا۔ لیکن حقیقت میں ایک لڑکا لان کی عقبی جھاڑیوں میں کب سے چھپا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب ماسٹرجی وہاں سے چلے گئے تو خالد جھاڑیوں سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ حسد و رقابت اور غصے کے مارے اس کا سینہ جل رہا تھا۔ اور چہرے پر چیچک کے داغ زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر ایسی آواز پیدا کی جو سانپ کی پھنکار سے ملتی جلتی تھی۔ گھاس پر پڑی ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنی کو اس نے ٹھوکر ماری اور کافی ہاؤس کی جانب چلا گیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد مسعود ثریا نامی لڑکی کے ساتھ ایک ہوٹل کی گیلری میں بیٹھا تھا۔ وہ کرسی پر اس کی طرف جھکا ہوا تھا اور آنکھوں میں مصنوعی محبت کی مستی پیدا کر کے اس سے اپنی وفاداری کی قسمیں کھا رہا تھا۔ اور اگلے روز سینما کی دعوت دے رہا تھا۔

شام کو ماسٹرجی فرخندہ کو پڑھانے چلے تو ان کی جیب میں صرف چار آنے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی سے چھ آنے مزید لیے اور دلّی دروازے سے تین گلاب جامن لفافے میں ڈلوالیے۔ ان کا جی بڑا بوجھل اور افسردہ تھا۔ ان کی داہنی آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی تھی۔ کوتوالی کے سامنے والے بس سٹاپ سے انھوں نے وسن پورے والی بس پکڑلی اور چوک ناخدا میں جا کر اتر گئے۔ گلیوں، گلیوں ہوتے وہ فرخندہ کے گھر والی گلی میں پہنچ گئے۔ گلاب جامنوں کا لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ اسلم نے دروازہ کھولا اور ماسٹرجی کو سلام کیے بغیر واپس ہو گیا۔ ماسٹرجی کو معمول کی اس تبدیلی پر کچھ حیرت سی ہوئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر انھوں نے دروازہ بند کیا اور چھوٹی سی گلی میں سے ہو کر عقبی آنگن میں آگئے۔ وہ شیخ صاحب کے کمرے کے آگے سے ہو کر نشست گاہ کی طرف مڑنے ہی والے تھے کہ اندر سے اکبر کی آواز آئی۔

"ماسٹرجی! ذرا اندر تشریف لائیے گا؟"

ماسٹرجی منہ اٹھا کر نشست گاہ میں داخل ہونے کی بجائے۔ جالی دار دروازہ کھول کر شیخ صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اندر تو پورا کنبے کا کنبہ جمع تھا۔ اکبر، شیخ فقیردین، والدہ فرخندہ، بلقیس اور اسلم ----- یہ سب لوگ پلنگ اور کرسیوں پر بیٹھے تیز تیز مشتبہ نگاہوں سے ماسٹرجی کو تک رہے تھا۔ ماسٹرجی نے شیخ صاحب کو سلام کیا اور کھڑے ہو رہے۔ ان کے چہرے پر اس وقت ان کی مخصوص احمقانہ مسکراہٹ بڑی نمایاں تھی۔ یہ مسکراہٹ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تمسخر انگیز محسوس ہوئی شیخ صاحب نے اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ اسلم کرسی چھوڑ کر پیچھے کھڑا ہو گیا شیخ صاحب بولے۔

"بیٹھئے ماسٹرجی!"

شیخ صاحب کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں تیزی سے ادھر ادھر تک رہی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ کی مٹھی کو کبھی کھول رہے تھے۔ کبھی بند کر رہے تھے۔ ماسٹرجی خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ جو کچھ ہونے والا تھا۔ وہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ شیخ صاحب نے اکبر کی طرف اور اکبر نے اپنی اماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے ایک گہرا سانس بھر کر سر جھکا لیا۔ شیخ صاحب نے صبح کا اخبار تہہ کر کے سرہانے کی طرف رکھا۔ گھٹنا کھجلایا اور ماسٹرجی کی آنکھوں میں گھور کر بولے۔

"ماسٹر صاحب! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ میں آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ کم از کم آپ کی عمر میں پہنچ کر آدمی کو شریف بن جانا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ آپ نے میری توقعات کو ٹھیس پہنچائی آپ وہ آدمی نہ نکلے جس کا مجھے یقین تھا کہ آپ ہیں۔"

ماسٹرجی احمقوں کی طرح آنکھیں کھولے ایک ایک کا منہ تکنے لگے پہلے تو انھیں پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ پھر اچانک انھیں خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں کو یہ تو معلوم نہیں ہو گیا کہ وہ فرخندہ کے رقعے لے جاتے ہیں۔ اس خیال کی تصدیق کے لیے انھوں نے بیوقوفوں کی طرح پوچھ لیا۔

"کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

اکبر نے اس پر ذرا ترش ہو کر کہا۔

"غلطی؟ ماسٹرجی آپ نے تو ہماری بنی بنائی عزت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی جو کسر آپ کی شاگرد نے چھوڑ دی تھی اسے آپ پورا کرنے لگے تھے"۔ ماسٹرجی کے ہونٹوں کو مہر سی لگ گئی۔ وہ چپ ہو گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باری باری سبھوں کا منہ تکنے لگے۔ شیخ صاحب نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"فرخندہ نے آپ کو جو رقعہ دیا تھا وہ مجھے دے دیجئے"۔

ماسٹرجی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ان سے کوئی فرخندہ کا خط نہیں طلب کر رہا بلکہ اس کی محبت' اس کا پیار اور اس کا تصور واپس مانگ رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنا ہاتھ نہ روک سکے جس نے قمیض کی جیب میں سے فرخندہ کا لفافے میں بند خط نکال کر شیخ صاحب کے حوالے کر دیا۔ شیخ صاحب کا منہ غصے میں ہلکا سبز ہو گیا تھا اور میلے گندے ہونٹ کانٹا لگی مچھلی کی مانند تلملا رہے تھے۔ خط لے کر انہوں نے اکبر کو دیا۔ اکبر نے اسے کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ خط مختصر تھا جس میں فرخندہ نے اپنی زبردستی کی شادی کا رونا رو کر مسعود کو اپنی پرانی محبت کا واسطہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر اسے فرخندہ سے محبت ہے تو وہ اسے وہاں سے نکال کر لے جائے۔

خط پڑھنے کے بعد کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ خط واقعی بڑی سنگین نوعیت کا تھا۔ سوائے ماسٹرجی کے ہر ایک کا چہرہ لٹک گیا۔ اکبر نے نفرت سے ماسٹرجی کی طرف دیکھا اور خط واپس اپنے والد یعنی شیخ فقیردین کو دے دیا۔ شیخ صاحب نے ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا اور

ماسٹر جی کی طرف گہری نگاہوں سے گھور کر بولے۔

"اگر کل کلاں میری بیٹی خدانخواستہ گھر سے نکل جائے تو بتایئے میری اس ہمہ گیر ذلت کا باعث آپ نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟ آپ کو ذرا خیال نہ آیا کہ آپ ایک شریف آدمی، خاندان والے آدمی کی عزت سے کھیل رہے ہیں؟"

ماسٹر جی خاموش رہے۔ اب اکبر کی باری تھی۔

"صورت سے تو آپ بڑے مسکین معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے منہ میں ایک دانت بھی نہیں۔ آپ کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ اس طرح کا گھناؤنا جرم بھی کر سکتے ہیں"۔

فرخندہ کی والدہ نے حیرت اور تاسف سے سر ہلا کر کہا۔

"مجھے ان باتوں کی خبر ہوتی تو میں انہیں کبھی فرخندہ کے پاس اکیلا نہ بیٹھنے دیتی۔ لیکن میری قسمت ------ اب تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا کیا دھرا انہیں صاحب کا ہے۔ خدا جانے کب سے یہ فرخندہ کے رقعے لے جا رہے ہیں؟"

شیخ صاحب نے گرج کر کہا۔

"تم یہاں بیٹھی کیا کرتی تھیں؟ تمہارا فرض تھا کہ اپنی نگرانی میں تعلیم دلواتیں"۔

بیگم نے کہا۔

"مگر ماسٹر جی تو فرخندہ کے باپ کی جگہ تھے"۔

اکبر ناک پر عینک ٹھیک سے جما کر بولا۔

"خدا کی پناہ! کیسا زمانہ آگیا ہے"۔

شیخ صاحب کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"یہ قیامت کے آثار ہیں۔ قیامت میں اب کیا کسر رہ گئی ہے؟ کچھ بھی نہیں"۔

پھر انہوں نے قہر آلود نگاہ ماسٹر جی پر ڈالی اور تلخی سے کہنے لگے۔

"ماسٹر جی! دل تو یہ چاہتا ہے کہ آپ کو ایسی سزا دوں جسے آپ عمر بھر یاد رکھیں۔ لیکن آپ کی عمر کا لحاظ کرتا ہوں۔ آپ نے میرے خاندان کے ناموس کی جس طرح مٹی پلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ برائے مہربانی آپ ابھی یہاں سے تشریف لے جایئے اور پھر کبھی اس گلی کا رخ نہ کیجئے گا۔ جتنے دن آپ نے ٹیوشن پڑھائی

ہے اس کی ایک پائی بھی آپ کو نہیں دوں گا"۔

فرخندہ کی ماں نے کہا۔

"ہم ایسے گئے گزرے نہیں جو کسی کا حق مار کر کھا جائیں۔ ان کے پیسے ان کے منہ پر پھینک دیں"۔

اکبر نے بھی اپنی امی کے خیال کی تائید کی۔ ہر چند کہ شیخ صاحب کی مرضی بالکل نہیں تھی لیکن جب انہوں نے گھر کے تمام افراد کو ایک طرف پایا تو بولے۔

"بہت اچھا۔ یہ رقم تم اپنی جیب سے ادا کرنا۔ میں ایک دھیلا بھی نہیں دوں گا۔ میری کمائی محنت کی کمائی ہے"۔

اکبر نے ماسٹر جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کل آپ کے پیسے آپ کو سکول پہنچا دیئے جائیں گے۔ اب آپ تشریف لے جایئے"۔

ماسٹر جی بالکل سن ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ فرخندہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس گھر کا ہر فرد انہیں کھا جانے والی حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہی آنکھیں جو دو دھاری ننگی تلواریں بن کر بدن میں چاروں طرف سے پیوست ہو رہی تھیں کل تک انہیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر احترام سے بچھ جایا کرتی تھیں۔ یہی ہونٹ جو انہیں نفرت سے دھتکار رہے ہیں کل بڑے چاؤ سے پوچھا کرتے تھے۔ ماسٹر جی! آپ نے چائے پی لی کیا؟ ماسٹر جی آپ کے لئے شربت بنایا جائے؟ یہی ہاتھ جو انہیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہے تھے کل تک انہیں گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر محبت سے تالیاں بجایا کرتے تھے یہ ایک ہی پل میں اتنا بڑا انقلاب آگیا؟ یہ آن کی آن میں اتنی بڑی عمارت زمین پر گر پڑی؟ دل بدل گئے۔ آنکھیں پھر گئیں۔ پھولوں کی خوشبو باد سموم بن گئی۔ کل کا سونا آج کی مٹی بن گیا۔ جسے موتیوں کا ہار سمجھ کر اٹھایا تھا۔ اسے زہر بھرا سانپ سمجھ کر جھٹک دیا۔ کتنا ناپائیدار ہے۔ ناقابل یقین ہے۔ انسان کی محبت کا جذبہ! کیا یہ کچا دھاگا اس لائق ہے کہ زندگی کے غموں، دکھوں اور خوشیوں کا بوجھ اس کے حوالے کیا جا سکے؟

"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ سنا نہیں آپ نے؟"

سن لیا ہے۔ سن لیا ہے۔ ہم چلے جائیں گے۔ ہم بن بلائے مہمان بن کر گھر میں آگئے تھے۔ ہمیں اٹھا کر گلی میں پٹخ دو۔ ہم چلے جائیں گے۔ ہمارا سر لہو لہان ہو جائے گا۔

ہمارے بال خون میں منجمد ہو جائیں گے۔ ہمارا خون آلود چہرہ خاک میں اٹا ہو گا۔ کوئی محبت سے اٹھا کر اسے اپنے زانو پر نہ رکھے۔ ہم چلے جائیں گے۔ ہم پھر کبھی اس گلی کا رخ نہیں کریں گے۔ ہم پھر کبھی اس دروازے پر آکر دستک نہیں دیں گے۔ ہمیں پھر کبھی اس آنگن کی بیری کی چھاؤں نصیب نہیں ہو گی۔ پھر کبھی کسی کے کھائے ہوئے بیروں کی گٹھلیاں جمع نہیں کریں گے۔ پھر کبھی کوئی ہمیں چائے کی ایک پیالی کا نہیں پوچھے گا۔ کوئی ہمارا سر نہیں دابے گا۔ کوئی کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر ہماری راہ نہیں دیکھے گا۔ جب آدھی رات کو بارش کا طوفان آئے گا اور سردی میں گیلی بارش والی سنسان گلیاں ٹھٹھر رہی ہوں گی تو کسی گھر کا دروازہ ہمارے لئے نہیں کھلے گا۔ کوئی مہربان گرم ہاتھوں سے ہمیں اپنی طرف نہیں بلائے گا۔ کوئی ہمارے گیلے کپڑوں' کانپتے ہوئے بوڑھے جسم پر ترس نہیں کھائے گا۔ ہم نیند کی صلیب اٹھائے اندھیری راتوں کو تمہاری گلیوں میں لڑکھڑاتے ہوئے گزرا کریں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ ہم پچھلی رات کی ہوا بن کر تمہارے مکانوں کی دہلیزوں پر آ آ کر بوسے دیا کریں گے اور صبح تمہارے جوتوں کے نشان انہیں مٹا دیا کریں گے۔ ہم اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے تمہارے مکانوں کی دیواروں سے لگ کر راتوں کو رویا کریں گے۔ اور تم تک ہماری سسکیوں کی آہٹ تک نہیں پہنچنے پائے گی ہم بے زبان سفید پھول بن کر چپکے سے تمہارے جوڑے سے لپٹ جایا کریں گے۔ ہم شبنم بن کر رات بھر تمہاری گلیوں' مکانوں' منڈیروں اور آنگن کے بیل بوٹوں پر گرا کریں گے اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ لوٹ جایا کریں گے۔ ہم راتوں کا اندھیرا بن کر تمہاری بند کھڑکی کے کواڑوں سے چمٹ جائیں گے۔ اور تمہارے کبھی درشن نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ ہم نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ہم تمہاری گلی ہی نہیں تمہارا شہر بھی چھوڑ جائیں گے۔ اور جب ہم اس دنیا میں نہ رہیں تو ہماری قبر پر پھول نہ چڑھانا۔ وہاں کوئی دیا روشن نہ کرنا۔ کیونکہ ہم وہ لوگ نہیں تھے جن کی شہرت کا نقارہ بجتا ہو۔ ہمیں تو زندہ رہنے کا ڈھنگ بھی نہ آیا۔ ہم نے تو زندگی یوں بسر کر دی جس طرح کوئی اپنے پیارے گھر سے ہزاروں میل دور اجنبی شہر میں فٹ پاتھ پر لیٹ کر رات بسر کرتا ہے۔ ہمیں دھکے دے کر گھر سے باہر کیوں نکالتے ہو۔ ہم تو پہلے ہی راندۂ درگاہ ہیں۔ ہم پر اپنے مکان کے کواڑ بند نہ کرو کیونکہ ہمارے لئے تو کبھی کسی گھر کا دروازہ نہیں کھلا۔ اچھا! اب رخصت!

ماسٹر جی کرسی پر سے اٹھے۔ انہیں پھر وہی چکر آگیا اور طوفانی دریا کا گرداب انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر نیچے ہی نیچے کھینچنے لگا۔ انہوں نے دروازے کے کواڑ کو پکڑ لیا اور سنبھل گئے۔ وہ باہر گلی میں آگئے۔ اس طرح کہ گلاب جامنوں کا لفافہ ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ سینے سے لگا تھا۔ سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ بائیں رخسار پر عاجزانہ مسکراہٹ کی لکیر پتلے چہرے کو اور بھی المناک بنا رہی تھی۔ وہ گلی والے بکائن کے درختوں کے نیچے سے گزرے۔ الوداع! پیارے دوستو! پیارے درختو! درختوں کی پیاری ٹہنیوں اور ٹہنیوں پر بیٹھ کر شور مچانے والی پیاری پیاری چڑیو! کچا دھاگا ٹوٹ رہا ہے۔ منہ دیکھے کا پیار ختم ہو رہا ہے۔ لو ہم خشک پتے کی طرح تمہاری ڈال سے ٹوٹ کر جدائی کے پہلے جھونکے کے ساتھ جاتے ہیں۔ اب کبھی دوبارا درشن نہ ہوں گے۔ الوداع! مکانوں کی جالی دار کھڑکیو! جب ہوا میں تمہارے ریشمی پردے لہرائیں گے تو ہم انہیں نہ دیکھ سکیں گے۔ رخصت ان کھڑکیوں پر جھکے ہوئے چھجو! سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں جب بارش کی بوندیں تم پر گریں گی تو ہم تمہارا سنگیت نہ سن سکیں گے۔ جب ساون کی جھڑیاں لگیں اور کوئلیں بولتی پھریں۔ جب ٹھنڈی ہوائیں چلیں اور تمہارے ریشمی پردے لہرائیں۔ جب سردیوں کی دھندلی صبحوں کو کانپتے نیلے ہونٹوں والی لڑکیاں تمہاری گلی میں گزریں تو ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ خدا حافظ! پیاری گلیو! پیاری کھڑکیو! پیارے درختو! پیاری چڑیو! پیارے بھائیو! پیاری بہنو!!

(19)

ماسٹرجی گلی میں سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ وہ قدم قدم چل رہے تھے۔ انہوں نے اپنا منہ اٹھا رکھا تھا۔ عینک کے پیچھے آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ ہر چیز کو یوں دیکھ رہے تھے جس طرح پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہوئے مجرم جیل کی دیوار کو اور دیوار کے اوپر سے نظر آنے والے درختوں کی شاخوں کو دیکھتا ہے۔ دونوں ہاتھ بے جان ہو کر لٹک رہے تھے اور انگوٹھے سے انگلیوں پر ساتھ ہی ساتھ کچھ گنتے بھی جا رہے تھے۔ سورج داہنی جانب مکانوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور داہنی طرف والے مکانوں کے روشندان، کھڑکیاں اور ممٹیاں سرخ ہو گئی تھیں۔

جب وہ گندے نالے کے پل پر سے گزرنے لگے تو انہیں خالد نظر آیا وہ سائیکل پر بیٹھا بڑی تیزی سے فرخندہ کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ماسٹرجی نے انہیں دیکھا اور دماغ پر زور دے کر سوچنے لگے کہ اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟ پھر وہ انگلیوں پر حساب جوڑنے لگے۔ دس' گیارہ' بارہ' پندرہ' سترہ' بیس _____ ٹھیک ہے۔ یہ تو خالد ہے۔ ساری آگ اسی کی لگائی ہوئی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ آگ نے سب کچھ جلا ڈالا ہے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہا۔ خالد نے بھی ماسٹرجی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کی صورت پر برستی ہوئی ناکامی اور بے ربط چال اور آنکھوں کی وحشت سے سمجھ گیا کہ اس کی سکیم کامیاب ہو گئی ہے اور اس کی شب و روز کی محنت پھل لے آئی ہے۔

ماسٹرجی ایک موریا پل سے نکل کر دلی دروازے جانے کی بجائے سٹیشن کی طرف مڑ گئے۔ اس سڑک پر ٹریفک کا شور تھا اور گرد و غبار اڑ رہا تھا دو موریا پل کے سامنے میوہ منڈی کے باہر ایک ٹرک ریڑوں اور تانگوں میں پھنسا پڑا تھا۔ ریلوے لائن کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ماسٹرجی یہاں ایک پل کے لئے رک گئے۔ انہوں نے ناک کے بانسے پر عینک ٹھیک سے جمائی اور ٹرک کے کلینر کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے جو پھلوں کے ٹوکروں کے اوپر کھڑا چیخ چیخ کر ڈرائیور کو کبھی آگے بڑھنے کبھی پیچھے ہٹنے کی ہدایات دے رہا تھا۔

پہلے تو وہ سٹیشن کے باہر والے گول باغ میں جا کر بیٹھ گئے اور سگریٹ جلا کر پھٹی پھٹی

وحشت زدہ آنکھوں سے سٹیشن کی عمارت اور لوگوں کو تکتے رہے۔ پھر جب شام ہو گئی اور چاروں طرف بتیاں روشن ہو گئیں تو انہوں نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا اور اندر جا کر مختلف پلیٹ فارموں پر چل پھر کر شنٹ کرتے انجنوں اور کسی نہ کسی شہر کو جانے کے لئے تیار کھڑی ریل گاڑیوں کا تماشہ کرنے لگے۔ وہ ہر ڈبے کے قریب سے گزر کر اندر جھانک کر دیکھ لیتے۔ گویا کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی تلاش میں ہوں۔ ایک جگہ کچھ نوجوان مشین میں اکنی ڈال کر قسمت کا حال معلوم کر رہے تھے۔ ماسٹرجی بھی ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور انہیں مشین کے سوراخ میں اکنی ڈال کر ہتھی گھماتے اور پھر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کے مستقبل کا حال پڑھتے دیکھتے رہے۔

چار نمبر پلیٹ فارم پر ایک ریل گاڑی کراچی جانے کو تیار کھڑی تھی۔ ماسٹرجی نے دو چکر لگا کر گاڑی کو دیکھا۔ ایک آدمی پھولوں کے ہاروں سے لدا اپنے رشتہ دار مرد عورتوں کے گھیرے میں کھڑا مسکرا رہا تھا اور بار بار ہاتھ ملاتے ہوئے لال لال گالوں والے بچوں کو پیار کر رہا تھا۔ ماسٹرجی بھی ان لوگوں میں جا شامل ہوئے اور دوسرے مردوں کے ساتھ وہ بھی مسکرا مسکرا کر رخصت ہونے والے کی طرف دیکھنے لگے۔ انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے جھنڈی ہلا دی اور گاڑی چل پڑی۔ ہاروں میں لدا پھدا آدمی ڈبے کے پائدان پر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ہلانے لگا۔ سب لوگ اسے ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرنے لگے۔ عورتوں نے نقاب اٹھا دیئے اور چھوٹے چھوٹے خوشبو دار رومال ہلانے لگیں۔ ماسٹرجی بھی ان کی اس گھڑی بھر کی افسردگی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے دو ایک بار ہاتھ ہلا دیا۔ گاڑی چلی گئی۔ لوگ آہستہ آہستہ واپس ہونے لگے۔ پلیٹ فارم بالکل خالی اور ویران رہ گیا۔ ماسٹرجی چائے والے کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر میلی کچیلی چائے کا کوپ پینے لگے۔ چائے پیتے ہوئے انہیں فرخندہ کے ہاں پی جانے والی شام کی چائے کا خیال آ گیا۔ ان کے ادھڑے ہوئے ویران چہرے پر یادوں کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ کوپ والا ہاتھ کپکپایا اور ان کے منہ سے اپنے آپ ایک سرد آہ نکل گئی۔ اب انہوں نے صاف صاف دیکھا کہ انہیں فرخندہ کے گھر سے بڑی ذلت کے ساتھ دھکے مار کر باہر نکالا جا رہا ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ وہ فرخندہ کا خط جیب سے نکال کر اس کے باپ کو دے رہے ہیں۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا؟ وہ خط پھاڑ ڈالنا چاہیے تھا۔ انہیں خط منہ میں ڈال کر نگل جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارا ہے۔ فرخندہ کو وہ ساری زندگی اب منہ

نہیں دکھا سکتے۔ ان کا چہرہ سکڑ کر عقب میں چلا گیا اور نچلا ہونٹ یوں لٹک گیا۔ جیسے وہ بے حس ہو گیا ہو۔ جب وہ چائے کا کوپ خالی کر کے چلنے لگے تو انہیں پھر چکر آ گیا۔ ہر چیز ایک بار تیزی سے گھوم کر پھر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور پلیٹ فارم ماسٹر جی کو ساتھ لے کر زمین میں دھسنے لگا۔ انہوں نے جلدی سے کاؤنٹر کو تھام لیا اور پاس ہی بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔

جب ان کے چکر کچھ کم ہوئے تو وہ آہستہ سے اٹھے اور گیٹ کی طرف چل دیئے۔ سٹیشن کے باہر بڑی رونق تھی۔ ماسٹر جی کو چلتے میں اپنے بدن میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ ان کا دماغ خالی غبارے کی طرح ہوا میں اڑا جا رہا تھا اور پاؤں منوں بوجھل ہو کر اٹھ رہے تھے۔ اس تضاد نے ان کی چال کو بے ربط کر دیا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہیں یاد آیا کہ جب وہ وسن پورے والے گھر کی گلی میں سے باہر نکل رہے تھے تو انہوں نے ایک جگہ کسی چیز سے ٹھوکر کھائی تھی اور گلاب جامنوں کا لفافہ ان کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ کیا وہ لفافہ ابھی تک گلی میں پڑا ہو گا؟ اس گم شدہ لفافے کے ساتھ انہیں ایک ایک کر کے دن بھر کی ساری بد نصیبیاں اور ذلتیں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے سر کے خشک بالوں پر ہاتھ پھیرا اور منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہاں سوائے دھوئیں اور گرد و غبار کے انہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔

یہاں سے وہ پیدل ہی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئے۔ لکشمی کے چوک میں وہ ایک طرف کھڑے ہو کر ہوٹلوں کی روشنیاں اور ان لوگوں کو دیکھنے لگے جو یہاں وہاں ٹولیاں بنا کر کھڑے تھے۔ اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ سفید کپڑے پہنے ایک چھوٹی سی بچی اپنی برقعہ پوش ماں کی انگلی تھامے ان کے قریب سے گزر گئی۔ ماسٹر جی ٹکٹکی باندھے ان ماں بیٹیوں کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ لوگوں کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئیں۔ اب وہ پھر آگے چل پڑے۔ بڑے ڈاک خانے کے سامنے مال روڈ والے جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے یہاں کتنی ہی دیر تک یونہی کھڑے رہے اور آتی جاتی موٹروں کو تکتے رہے وہ ہر موٹر کو انگلی کے نشان پر انگوٹھے کی نوک رکھ کر گن لیتے۔ پچیس کے بعد گنتی گڈمڈ ہو گئی۔ انہوں نے جھنجھلا کر ہاتھ جھٹک دیا اور دوسرا ہاتھ سر پر پھیر کر ایک گہری آہ بھری اور مال روڈ پر کارپوریشن ہال کی جانب آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ عجائب گھر کے چوک میں رکھی ہوئی پرانی توپ کے پاس جا کر اس کا مشاہدہ کیا۔ اس کے ٹھنڈے دہانے کو ہاتھ سے چھوا اور اس کے پاس ہی چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر پینے

لگے۔ انہیں خیال آیا کہ یونیورسٹی کی عمارت کے عقب میں وہ کالج ہے جہاں وہ آج صبح مسعود کے نام فرخندہ کا خط لے کر آئے تھے۔ اس نے خط واپس کر دیا تھا اور انہیں ترش روئی سے کہا تھا کہ وہ آئندہ کبھی فرخندہ کا خط لے کر وہاں نہ آئیں۔ ماسٹر جی نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ بلکہ وہ ہاتھ باندھ کر گڑگڑائے تھے کہ وہ فرخندہ کا دل نہ توڑے۔ اسے ہمدردی کے دو لفظ لکھ دے۔ لیکن مسعود ان کا ہاتھ جھٹک کر چل دیا تھا۔ پھر وہ شام کو فرخندہ کو اس کا خط واپس کرنے اور اسے پڑھانے وسن پورے گئے تھے۔ وہ ابھی بیٹھک میں نہیں پہنچے تھے کہ پہلے والے کمرے سے فرخندہ کے باپ نے انہیں بلا لیا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا ماسٹر جی کو ایک بار پھر چکر سا آ گیا۔ انہوں نے سگریٹ پھینک کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ ایک دو منزلہ بس ان کے قریب سے گزر گئی۔

ماسٹر جی نے ٹخنوں پر گری ہوئی بوسیدہ جرابوں کو کھینچ کھینچ کر اوپر کیا ایک بوٹ کا تسمہ کہیں راستے میں ہی کھل گیا تھا۔ انہوں نے تسمہ دوبارہ کسا جیب سے رومال نکال کر جوتوں پر جمی ہوئی گرد جھاڑی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے اور پھر آگے چل پڑے۔

کافی رات گئے جب وہ شہر بھر کی آوارہ گردی کے بعد اپنے مکان کی گلی میں داخل ہوئے تو وہ تھک کر چور ہو رہے تھے۔ اور ان کے جوتوں اور سر کے سفید و بھوسلے بالوں پر سڑکوں کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ ان کی روگی چڑچڑی بیوی منزل کی کوٹھڑی میں کھاٹ پر پڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ جب اس نے سیڑھیوں میں اپنے خاوند کے بوجھل قدموں کی آواز سنی تو ہائے وائے کرنے لگی۔ وہ درد سے یوں کراہنے لگی گویا اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہو۔ اپنے خاوند کو سامنے دیکھ کر اس نے ذبح ہوتے بکرے کی طرح ایک گہری کربناک آواز حلق سے نکالی اور ماسٹر جی کے گلے پڑ گئی اسے کوسنے لگی۔ گالیاں دینے لگی۔ اس پر شرمناک الزام لگانے لگی۔

"میں نے تو اس گھر میں آ کر اپنی زندگی ہی برباد کر لی۔ تمہاری جگہ کسی دو پیسے کے مزدور سے بیاہ کیا ہوتا تو آج مزے میں ہوتی۔ تم تو میری گود بھی ہری نہ کر سکے۔ تم اور کیا سکھ دو گے۔ کوئی مرے یا جیئے تمہیں کیا۔ ہائے کیا بدھو آدمی پلے پڑ گیا۔ بولو۔ اتنی رات گئے کس ماں کے پاس سے ہو کر آ رہے ہو؟ اسی وسن پورے والی حرامزادی کے گھر بیٹھے تھے؟ میں ابھی اس کتیا کے پاس جاتی ہوں۔ اس کے باپ کی داڑھی نوچ لوں گی۔ غضب ہے لوگو!......

بیوی مرنے کو کھاٹ پر پڑی ہے اور میاں اپنی بیٹی ایسی لونڈیاں سے گلچھرے اڑا رہا ہے۔ میں تو تمہاری بے حیائی کا محلے بھر میں ڈھنڈورا پیٹ دوں گی"۔

ماسٹرجی آگے بڑھ کر بیوی کے پاؤں دابنے لگے۔ اس نے ماسٹرجی کو لات مار دی۔ وہ فرش پر گر پڑے ان کی عینک ناک سے پھسل کر زمین پر گر پڑی۔ انہوں نے عینک اٹھا کر دوبارہ لگالی۔ اور زمین پر پڑے پڑے بیوی کو دکھ بھری' ملال انگیز عاجزانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ بیوی برابر بولے جا رہی تھی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر جھاگ اڑ رہا تھا۔ چہرہ بگڑ کر مکروہ ہو گیا تھا۔ اور کرخت آواز دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس اندھے گدھ کی طرح جیسے باہر نکلنے کو راستہ نہ مل رہا ہو۔

گھنٹہ دو گھنٹے بیوی کو دابنے۔ ماتھے پر بام کی مالش کرنے۔ خارش زدہ ہاتھ پاؤں پر گندھکی مرہم لگا کر کپڑا باندھنے اور صبح کا بچا ہوا دودھ گرم کرکے پلانے کے بعد جب وہ سو گئی تو ماسٹرجی نے اٹھ کر دوپہر کی سوکھی ہوئی روٹیاں چنگیر میں ڈال کر ہاتھوں سے دبا دبا کر سیدھی کیں۔ صبح کی نمکین چائے کو گرم کیا اور اس میں روٹی کے ٹکڑے بھگو بھگو کر کھانے لگے۔ روٹی کھا کر وہ دبے پاؤں نیچے آ گئے۔ چارپائی کے نیچے سے اپنا ٹین کا صندوق باہر کھینچا۔ اسے کھول کر اپنے کپڑے پرے ہٹائے اور دیکھا کہ نیچے فرخندہ کے کھائے ہوئے بیروں کی گٹھلیاں اور اس کے گلدان کے پھولوں کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں ویسے کی ویسے پڑی ہیں۔ انہوں نے ہاتھ لگا لگا کر ایک ایک پنکھڑی' ایک ایک گٹھلی کو چھُوا۔ ایک ایک خوشگوار لمحے کو جُھک کر آنکھوں سے لگایا خشک پنکھڑیاں ان کے ہاتھ لگانے سے ٹوٹ ٹوٹ گئیں۔ ایک گٹھلی کو انہوں نے منہ کے پاس لے جا کر سونگھا۔ اس میں ایسی بو آ رہی تھی جیسی کسی دودھ پیتے بچے کے منہ سے آیا کرتی ہے۔ ماسٹرجی کو یوں لگا گویا وہ اپنے مردہ بچے کو قبرستان میں دفنانے کے بعد گھر آ کر اس کی جمع کی ہوئی چیزیں دیکھ رہے ہوں۔

وہ گٹھلیوں کو گننے لگے۔ ایک - دو - تین - چار - پانچ - پوری گیارہ تھیں۔ اور پھولوں کی سوکھی ہوئی پنکھڑیاں تو کتنی ہی تھیں۔ وہ بچہ کہاں گیا جو ان سے کھیلا کرتا تھا؟ وہ ننھے ننھے ہاتھ کہاں چلے گئے جو اپنی نازک ہتھیلیوں میں ان گٹھلیوں کو لے کر باپ کی طرف بڑھایا کرتے تھے؟ وہ معصوم قلقاریاں' وہ بات بات پر روٹھنا' وہ بات بات پر خوش ہونا وہ باپ کو آتا دیکھ کر بھاگ کر گلے سے لپٹ جانا' وہ معصوم شرارت کے ساتھ کواڑ کی اوٹ میں چھپ جانا

اور پھر خود ہی منہ باہر نکال نکال کر جھانکنا اور وہ غباروں کو دیکھ کر مسرت سے تالیاں بجانا ------ یہ سب کچھ کہاں چلا گیا؟ اتنی جاندار اتنی پائیدار' اتنی ہمہ گیر' اتنی دل کی گہرائیوں میں اتر کر نقش ہو جانے والی حقیقت پلک جھپکنے میں نیست و نابود ہو گئی؟ مٹی میں مل گئی؟ ماسٹرجی سچ مچ وہ باپ بن گئے جس کا کم سن بچہ تازہ تازہ مرا ہو۔ ان کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنا شروع ہو گئے۔ انہوں نے آستین سے آنسو پونچھے۔ صندوق بند کرکے چارپائی کے نیچے رکھا اور بتی بجھا دی۔ وہ اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھتے جا رہے تھے اور روتے جا رہے تھے۔ وہ رات بھر جاگتے رہے اور چپکے چپکے روتے رہے۔ وہ کھل کر رو بھی تو نہیں سکتے تھے۔ دن چڑھا تو ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور نحیف و لاغر بدن درد کر رہا تھا۔ انہوں نے سرہانے کے نیچے سے عینک نکال کر لگائی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ آگ جلائی۔ بیوی کے لئے پانی گرم کیا۔ گڑوی لے کر بازار سے دودھ لائے۔ دودھ کو ابالا۔ نمکین چائے بنائی۔ نانبائی کے ہاں سے جا کر دو کُلچے لائے۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو بیوی کو آہستہ سے ہلا کر جگایا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اسے چائے پلائی۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر مرہم لگا کر کپڑا باندھا۔ ماتھے پر بام ملی۔ معدے کی دو گولیاں کھلائیں۔" پھر خود چائے میں قلچہ ڈبو کر کھایا۔

سارا دن وہ سکول میں ذہنی طور پر غیر حاضر سے رہے۔ لڑکوں کو سبق دیتے ہوئے وہ کھو جاتے اور بھول جاتے کہ کیا کہہ رہے تھے۔ دوپہر کو انہوں نے تندور پر جا کر کھانا کھایا۔ ایک لڑکے کے ہاتھ بیوی کو بھی بھجوایا اور سکول کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ چھٹی کے بعد وہ گھر آ گئے بیوی کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا اور وہ چارپائی پر ایک طرف کو جھکی بری طرح کھانس رہی تھی۔ اس کا دم اکھڑا اکھڑا جا رہا تھا۔ اور وہ یوں ہانپ رہی تھی جیسے کئی میل کی دوڑ لگا کر آ رہی ہو۔ ماسٹرجی جاتے ہی اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ حکیم کے پاس بھاگ کر دوا لے آئے۔ دوا پلائی۔ کندھے اور پٹھے دبائے ذرا آفاقہ ہوا تو نیچے آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ جوں جوں دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ان کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جب وہ گھر سے فرخندہ کو پڑھانے نکلا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ اس گھر میں کبھی نہ جا سکیں گے۔ ان پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ جس سورج کی انہوں نے صبح سے شام تک پرستش کی تھی وہ پھر کبھی طلوع نہ ہونے کے لئے غروب ہو چکا تھا۔

جب وہ اذیت بخش گھڑی آئی تو ماسٹرجی بے تاب ہو کر اٹھے اور گلی میں نکل آئے۔ انہوں نے وسن پورے کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ روزانہ جایا کرتے تھے۔ لیکن اک موریا پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے ان کے قدم بوجھل ہونا شروع ہو گئے۔ دل حلق کے پاس آ کر دھڑکنے لگا۔ اور دماغ چکر کھانے لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ کئی سالوں کے بعد فرخندہ کے گھر جا رہے ہوں۔ انہوں نے انگلیوں پر گننا شروع کر دیا۔ کتنے دن ہوئے ہیں فرخندہ سے ملے؟ ایک' دو' تین' چار' پانچ---- وہ تو ابھی کل اس کے ہاں گئے تھے۔ نہیں' نہیں فرخندہ سے ملاقات ہوئے' اسے دیکھے تو ایک ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ایک ہزار سمندر راستے حائل ہو گئے ہیں۔ انہیں واپس پلٹ جانا چاہیے۔ شیخ صاحب دکان سے اور اکبر دفتر سے واپس آ رہے ہوں گے۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو بری بات ہو گی۔

لوٹ چلو۔ لوٹ چلو----!

نہیں نہیں۔ نہیں نہیں----!

ماسٹرجی کے دل میں دونوں ہی قوتیں پورے عروج پر ایک دوسری سے برسرپیکار تھیں اور ماسٹرجی چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ وسن پورے کے چوک میں پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے دھڑ دھڑ کرتے دل پر کانپتا ہوا سوکھا سا ہاتھ رکھ کر فرخندہ کی گلی کا موڑ کاٹا اور ان کے قدم ایک دم رک گئے جیسے زمین میں گڑ گئے ہوں۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہل سکے۔ وہ سامنے فرخندہ کا گھر تھا۔ بکائن کے دونوں پیڑ اسی طرح گلی میں مکان کے باہر کھڑے تھے۔ بچے اسی طرح اس کی چھاؤں میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور مرغیاں سامنے والی خالی جگہ کے کوڑے کرکٹ میں پنجے چلا رہی تھیں دھوپ ترچھی ہو کر ادھر ادھر والے مکانوں کی منڈیروں پر پڑ رہی تھی۔ دوسری منزل میں فرخندہ کے کمرے کا پردہ کھڑکی میں سے تھوڑا سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہو گی؟ شاید کونے میں بیٹھی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے رو رہی ہو۔ یا شاید اسے دلہن بنایا جا رہا ہو۔ اب تو اس کا بہت جلد بیاہ کر دیا جائے گا۔ ایک آدمی ماسٹرجی کو گھورتا ہوا گزر گیا۔ نہیں نہیں یہ پاگل پن ہے۔ دیوانگی ہے۔ مجھے فرخندہ کی عزت کے لئے واپس چلے جانا چاہیے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن فرخندہ کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔ ایک بار صرف ایک بار پھر سے درشن کر لوں۔ ہاتھ جوڑ کر صرف ایک سجدہ کر لوں۔ گلاب کا صرف ایک پھول اس کے گھر کی دہلیز پر رکھ لوں اسے ملے تو

ہزار سال ہو گئے ہیں۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار---- پانچ---- پانچ ہزار سال---- لیکن یہ میرا سر کیوں چکرانے لگا۔ کہیں پھر وہی چکروں کا دورہ تو نہیں پڑ رہا؟ ماسٹرجی ذرا سے لڑکھڑائے۔ انہوں نے مکان کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ آنکھوں تلے ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ نظروں میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ انہوں نے سر کو دو ایک بار جھٹکا۔ گلی سے باہر نکل کر کونے والے پنواڑی سے پانی مانگا۔ مگر اس کے پاس پانی نہیں تھا۔ ماسٹرجی آگے چل پڑے۔ گندے نالے کے پل کے پاس جا کر انہوں نے گوجروں کے پمپ سے پانی نکال کر پیا۔ ذرا طبیعت سنبھلی۔ اب انہوں نے سوچا کہ وہاں آ کر وہ کتنی بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ وہ گلیوں گلیوں ہو کر مصری شاہ کے علاقے سے باہر نکل آئے۔

وہ رات بھی انہوں نے جاگ کر گزار دی۔

بیاہ کا دن یوں تو فروری کی آخری تاریخوں میں مقرر ہوا تھا۔ لیکن حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے شیخ صاحب نے اپنی بیوی اور اکبر سے مشورہ کیا کہ لڑکی ان کی بنی بنائی عزت کے درپے ہے۔ اسے جتنی جلدی ممکن ہو سکے گھر سے رخصت کر دیا جائے۔ چنانچہ لڑکے والوں کو یہ کہلوا کر تاریخ بدلوا دی گئی کہ فروری کے مہینے میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شیخ صاحب کو بہاولپور جانا پڑ گیا ہے۔ اب کی دسمبر کی چار تاریخ مقرر ہوئی۔ شیخ صاحب کا خیال تھا کہ بیاہ خاموشی سے کیا جائے۔ مگر بیوی نے اس کی مخالفت کی۔

"لوگوں کو خواہ مخواہ باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ ہمیں ہر رسم پوری طرح ادا کرنی چاہیے"۔

بڈھے نے فکر مند ہو کر کہا۔

"عزت کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے محنت سے کمائے ہوئے پیسے کی بھی تو فکر ہے اب یہ تمہارا ذمہ ہے کہ ایک پائی بھی فالتو خرچ نہ ہو۔ پلاؤ کی دو دیگیں کافی رہیں گی۔ زردہ پکوانے کی کیا ضرورت ہے۔ ساتھ دہی رکھ دیں گے۔ اور پھر شوربہ بھی تو ہو گا۔ فرخندہ کی امی ہمیں چادر دیکھ کر پاؤں پسارنے چاہیں"۔

تیل مہندی والی رات کو شیخ صاحب کے گھر نشست گاہ والے کمرے میں فرخندہ کی سہیلیاں اور ہمسائے کی عورتیں اکٹھی ہو گئیں اور ڈھولک بجاتی رہیں۔ انجم کو فرخندہ کے سارے دکھ درد کا حال معلوم تھا۔ وہ فرخندہ کے پاس بیٹھی فرخندہ سے بھی زیادہ پریشان اور

افسردہ خاطر دکھائی دے رہی تھی۔ فرخندہ بالکل خاموش تھی اور کسی سے کوئی بات نہ کر رہی تھی۔ بھابھی عذرا کو کچھ شبہ سا ہو گیا تھا کہ شادی لڑکی کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس نے بھاوج ہونے کا فرض ادا کرتے ہوئے اپنی ماں بہنوں کو بتا دیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ ہو سکتا ہے اس شادی کا نتیجہ کچھ اچھا نہ نکلے۔ عذرا کی ماں اور بہنیں بھی وہاں موجود تھیں اور بڑی معنی خیز نگاہوں سے فرخندہ کو دیکھ دیکھ کر ایک دوسری کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ ہمسائے کی دو ایک لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں ڈھولک گھٹنوں میں دبائے منہ کھولے، گردنیں ایک طرف ڈھلکائے بیاہ شادیوں کے گیت گا رہی تھیں۔

ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے
بابل اساں اڈ جاناں
ساڈی لمی اڈاری وے
بابل کس دیس جاناں

ماسٹر جی نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ جب رات گہری ہو جاتی اور سردی کی وجہ سے گلی کوچے سنسان ہو کر لوگوں سے خالی ہو جاتے تو وہ اپنا نمدا سا پرانا لمبا کوٹ نحیف بدن کے گرد لپیٹ کر فرخندہ والی گلی کے نکڑ پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔ فرخندہ والے کمرے کی کھڑکیوں اور روشندانوں میں سے باہر کو آتی ہوئی روشنی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہتے۔ پھر چپکے سے سر جھکائے اس کی گلی میں مکان کے نیچے سے گزر کر ساتھ والی گلی میں گھوم جاتے اور مکانوں کے پچھواڑے والے میدان میں آ کر گندے نالے کا لکڑی کا پل عبور کر کے سڑک پر آ جاتے۔ فرخندہ کے مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے انہیں یہ بھی خوف رہتا کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے اور یہ حسرت بھی ہوتی کاش فرخندہ کی وہ ایک جھلک ہی دیکھ لیں۔ کبھی کبھی جب مکان کی روشنیاں گل ہو چکی ہوتیں تو وہ بکائن کے درختوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے ہاتھ سے مکان کی دیوار کو چھوتے۔ پھر ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتے اور پلکوں تک آئے ہوئے آنسوؤں کو میلے کچیلے رومال سے پونچھتے واپس چلے جاتے۔

ایک رات جب وہ آئے تو انہوں نے دیکھا کہ فرخندہ کے مکان کے باہر گلی کے بیچ میں درخت کی ٹہنی سے لٹکا ہوا بڑا سا بلب روشن تھا اور کالی دیگیں مکان کے ساتھ لگی تھیں۔ دو آدمی چارپائی پر بیٹھے پیاز کتر رہے تھے ساتھ ہی کرسیاں بچھی تھیں۔ اکبر ایک کرسی پر بیٹھا

لمبے سے پرچے پر کچھ لکھ رہا تھا اور اسلم بجلی کے مستری کی مدد سے درخت کے ساتھ لاؤڈ سپیکر نصب کروا رہا تھا۔ مکان کے اندر سے عورتوں بچوں کی آوازوں کے ساتھ ڈھولک کے بجنے اور گیت گانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ماسٹر جی وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ فرخندہ کی شادی ہو رہی ہے۔ صبح اس کی برات آ رہی ہے۔ ساتھ والے مکان کا ایک دروازہ باہر کو کھلا تھا اور اندر سے گوشت کاٹنے کی صدا آ رہی تھی۔

ماسٹر جی کو اپنے آپ پر اس مرحوم باپ کی روح کا گمان ہوا جو عالم بالا سے اپنی بیٹی کے بیاہ کی تقریب دیکھنے اس دنیا میں آئی ہو۔ تو گویا کل فرخندہ وداع ہو جائے گی۔ خالد اسے بیاہ کر لے جائے گا۔ کمینگی، بد خصلتی اور جعل سازی کا جن اس نازک سی ننھی پری کو سب کے سامنے اٹھا کر لے جائے گا۔ انہیں اپنے کھوکھلے سینے کی ہڈیوں میں درد کی گہری لہریں ابھرتی ڈوبتی محسوس ہونے لگیں۔ انہوں نے لمبے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال لیا۔ اور سینہ دبانے لگے۔ پھر انہیں چکر آنے لگے۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر اندھیرے میں ایک بند دکان کے پھٹے پر بیٹھ گئے اور وحشت زدہ ویران آنکھوں سے فرخندہ کے مکان کی روشنی کو تکنے لگے۔ انہیں عورتوں کے ڈھولک پر گیت گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ ان کی انگلیاں کوٹ کی تھیلہ نما جیبوں کے اندر اضطراب کے عالم میں ہلنے لگیں۔ جوتے کے اندر داہنے پاؤں کا انگوٹھا اپنے آپ ہی حرکت کرنے لگا۔ ماسٹر جی کے لئے وہاں ایک پل بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ وہ فوراً پھٹے پر سے اٹھے اور واپس سڑک پر آ گئے۔

رات گئے تک وہ ریلوے سٹیشن کے ویران ٹھٹھرے ہوئے پلیٹ فارموں پر چکر کاٹتے رہے۔ اوس میں بھیگی ہوئی یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ رات ہڈیوں کو جما دینے والی سردی میں کانپ رہی تھی۔ تھرڈ کلاس کی ایک خالی بوگی پلیٹ فارم نمبر 3 پر کھڑی تھی۔ ماسٹر جی ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا کر پینے لگے ریلوے یارڈ کی طرف انجن بھاپ کے مرغولے چھوڑتا شنٹ کر رہا تھا اور سردیوں کی رات کی سنسان فضا میں اس کی چھک چھک کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔

وسن پورے والے مکان میں دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی ڈرپوک اور پریشان انجم نے آہستہ سے کہا۔

"اب صبر سے کام لو فرخی ------ جو ہونا تھا ہو گیا۔ تمہیں تو اب یہ سب کچھ برداشت

کرنا ہی ہوگا۔ کم از کم ایسی حالت نہ بناؤ کہ کسی کو شک پڑ جائے۔ دیکھو بھابی عذرا اور اس کی ماں بہنیں کس طرح تمہیں گھور رہی ہیں"۔

فرخندہ نے سر کو جھکائے جھکائے بیزاری سے کہا۔

"مجھے کسی سے کیا ہے؟ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھ سے کوئی ذرا سی بات بھی کرتا ہے تو میرے زخم ہرے ہو جاتے ہیں"۔

انجم صرف عذرا کے گھر والوں کو دکھانے کے لئے کہ وہ کوئی غمگین بات نہیں کر رہی ذرا سا مسکرا دی اور بولی۔

"کم از کم مجھے تو ایسا نہ کہو۔ میں تو تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں"۔

فرخندہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف سر جھکائے رکھا اور اپنی ہتھیلی پر انگوٹھا رگڑ رگڑ کر ابٹن کا میل اتارنے لگی۔ گانے والیوں نے اب دوسرا گیت شروع کر رکھا تھا۔

محلاں بیٹھ میرا باپ کھڑا رو رو نیر بہائے
نہ رو بابل میرا دھیاں دے دکھ برے

دلہن کا اصلی باپ یعنی شیخ فقیر دین اپنے کمرے میں پلنگ پر تجوری کے پاس بیٹھا رونے کی بجائے زرد لمبے کاغذوں والی بہی سامنے رکھے شادی کے خرچ کا حساب جوڑ رہا تھا۔ اسے ڈھولک پر گائے جانے والا گیت بالکل سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر کوئی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی تو ساتھ والے مکان کے دیوان خانے میں گوشت کے کٹنے کی اور کھاتے پر پنسل کے گھسیٹنے کی ------- اس کے سوا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ستر روپے ایک دیگ پر اٹھ گئے۔ تو پانچوں دیگوں پر کل تین سو پچاس ہو گئے۔ باقی شوربے کی دو دیگیں۔ زردے کی دیگ (خدا سمجھے اس بیوی سے یہ تو میرا دیوالیہ نکال کر رہے گی) پھر دہی۔ پستہ۔ بادام۔ لکڑیاں۔ گرم مسالے۔ تھوم۔ پیاز۔ دریاں۔ کرسیاں۔ کرائے کے برتن۔ ماشکی۔ بھنگی۔ ہمسائے۔ رشتہ داروں کے گھر جانے والی روٹی۔ بجلی کا خرچ۔ لڑکی کے زیورات۔ جوڑے۔ یا اللہ میں تو مر جاؤں گا۔ کیا اسی روز کے لئے میں نے کما کما کر اپنی کمر دہری کی تھی؟

نہ رو بابل میرا دھیاں دے دکھ برے

جاڑے کی ٹھٹھرتی ہوئی رات برف کی چادر بن کر آسمان پر تنی ہوئی تھی۔ اس گیت کی دردناک آواز چلتے ہوئے تیروں کی طرح لاہور ریلوے سٹیشن کی طرف اڑی جا رہی

تھی۔ لیکن شنٹ کرتے انجنوں اور ایک دوسری سے ٹکراتی مال گاڑیوں کی بوگیوں کے شور میں گم ہو جاتی تھی۔ پلیٹ فارم نمبر تین پر کھڑی تھرڈ کلاس کی خالی بوگی میں ہمارے ماسٹر جی کو یہ آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ انہیں بہت سردی لگ رہی تھی۔ پرانی برانڈی کے بوسیدہ کوٹ میں گچھا سا ہو کر بیٹھے تھے۔ ڈبے میں اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی سگریٹ کا سرا چمکتا تو ماسٹر جی کی عینک میں اس کا عکس پڑ جاتا۔

اگر ماسٹر جی اس وقت روشنی میں نکل آتے تو ہمیں ان کا چہرہ اس لاش کی طرح نیلا اور ستا ہوا دکھائی دیتا جو دو روز کے بعد دریا میں سے نکالی گئی ہو۔ لیکن ماسٹر جی میں زندگی کے آثار باقی تھے۔ ابھی انہیں زندہ رہ کر اس غم کی لاش کو کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرنا تھا۔ ابھی اس چراغ سحری کو بجھتے بجھتے کئی آندھیوں کے تھپیڑے کھانے تھے۔ یارڈ میں ایک انجن نے تیز سیٹی بجائی۔ ماسٹر جی کانپ سے گئے انہیں یوں لگا گویا سارا شہر چیخ پڑا ہو۔ ان کا چہرہ ایک طرف کو جھک گیا۔ جبڑے کی ہڈی اوور کوٹ کے کھردرے کالر سے لگ گئی۔ نچلا ہونٹ لٹک گیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے بڑھی ہوئی داڑھی کے سفید و سیاہ بالوں میں بہ نکلے۔ ریلوے کے ایک ملازم نے لیمپ کھڑکی سے اندر کر کے ماسٹر جی کے چہرے پر روشنی ڈالی۔

"کون ہو بھئی؟"

ماسٹر جی نے آنکھیں کھول دیں۔ سر اٹھا کر دیکھا۔

"میاں جی گھر جا کر سوئیں۔ یہ جگہ سونے کی نہیں، یہ ڈبہ شاہدرے جا رہا ہے"۔

پھر اس نے پلیٹ فارم پر آگے کو دیکھ کر لیمپ لہرایا اور منہ سے "ہاؤ" ایسی زوردار آواز نکالی۔ ایک انجن ہلکے سے دھچکے کے ساتھ ان بوگیوں سے آن لگا۔ ماسٹر جی چپکے سے اٹھے اور خالی ڈبے سے باہر نکل آئے۔ سٹیشن سے باہر آ کر وہ دونوں ہاتھ اوور کوٹ کی پھٹی ہوئی تھیلہ سی جیبوں میں گھسائے۔ کندھے جھکائے۔ سر نیہوڑائے یوں سمٹے سمٹائے سے اپنے گھر کی طرف چلنے لگے جیسے کسی جنازے کے ساتھ چلے جا رہے ہوں کافی دیر تک وہ سردی میں سنسان سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا کہ وہ گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔

"جس حرامزادی کے ہاں اتنا وقت گزارا ہے اب رات بھی وہیں جا کر بسر کرو۔ میں

سؤر کی بچی ہوں اگر تمہیں گھر میں داخل ہونے دوں"۔

تنگ سی گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہاں شہر کی کھلی سڑکوں کی نسبت سردی کم تھی۔ ماسٹر جی نے زبان سے کچھ نہ کہا اور مکان کی سیڑھی پر دروازے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ تھکاوٹ سے ان کا بدن چور ہو رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور ہر سانس کے ساتھ سینے میں ایک ہلکی سی ٹیس اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد بیوی نے دروازہ کھول دیا۔ اوپر جا کر اس نے باقاعدہ بین کرنے شروع کر دیئے۔ کوئی ایسی بددعا اور گالی نہ تھی جو اس نے ماسٹر جی کو نہ دی ہو۔ ماسٹر جی حسب عادت خاموشی سے سر جھکائے چارپائی پر بیٹھے رہے۔ بیوی ان کی اس بے نیازی سے اور چڑ گئی۔ اس نے غصے میں پیتل کا گلاس اٹھا کر ماسٹر جی کو دے مارا۔ گلاس ماسٹر جی کی آنکھ کے اوپر کنپٹی اور ماتھے کے درمیان لگا۔ اور ایک دم خون جاری ہو گیا۔ ماسٹر جی کی عینک اچھل کر پرے جا گری اور درد کے مارے ان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے آنکھ پر ہاتھ رکھ دیا تو خون انگلیوں سے بہہ کر اور کوٹ پر ٹپکنے لگا۔ جیب سے گندا سا رومال نکال کر وہ خون پونچھنے لگے۔ جھک کر عینک تلاش کی مگر کہیں دکھائی نہ دی۔ خون دیکھ کر بیوی کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے چارپائی کے نیچے پڑی عینک اٹھا کر ماسٹر جی کی آنکھوں پر لگائی اور ان کے ہاتھ سے رومال لے کر ان کا سر اپنے پیٹ سے لگا لیا اور زخم میں سے بہتا ہوا خون پونچھنے لگی۔ ماسٹر جی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

بیوی نے رومال ٹھنڈے پانی میں بھگو کر زخم پر رکھ دیا اور ایک ہاتھ ماسٹر جی کے گلے میں ڈال کر رونے لگ پڑی۔ ماسٹر جی کا سر بیوی کے پیٹ سے لگا تھا ان کی آنکھیں گرم ہو کر دہکنے لگیں اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے دیر تک روتے رہے۔

اگلے دن فرخندہ بیاہ دی گئی۔ سمن آباد سے برات باجوں گاجوں کے ساتھ دن کو ایک بجے آئی اور شام کو چھ بجے دلہن اور اس کے جہیز کو لے کر واپس چلی گئی۔ دسمبر کی سنہری دھوپ دس پورے کے مکانوں پر خوب چمک رہی تھی کہ خالد خوب بنا ٹھنا گلے میں پھولوں کے علاوہ سنہری تاروں والا بڑا سا ہار پہنے برات لے کر گلی میں داخل ہوا۔ وہ پھولوں سے مڑھی ہوئی موٹر میں اپنے کنبے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھا بڑے فخر سے گردن نکال کر باہر دیکھ رہا تھا اور اپنا آپ پوری طرح ارد گرد کے مکانوں کی کھڑکیوں اور منڈیروں پر جھکی ہوئی عورتوں کو دکھلا رہا تھا۔ اس کے پیچھے موٹر گاڑیوں اور تانگوں کا ایک جلوس تھا جو گلی کے نکڑ پر

آ کر رک گیا تھا۔ رگڑ رگڑ کر حجامت کئے دھلے دھلائے چہروں اور کلف لگے کھڑ کھڑ کرتے کپڑوں میں ملبوس براتی گاڑیوں سے باہر نکل کر انگڑائیاں لینے اور کالر ٹائیاں کھینچ کھینچ کر ٹھیک کرنے لگے۔ ہر براتی کے کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول لگا تھا۔ بہت سوں کے گلے میں پھولوں کے ہار بھی تھے۔ جن کی پتیاں ان کے گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکی والوں کی آؤ بھگت اور نیازمندانہ سلوک کا خوب خوب مزہ لے رہے تھے۔ اور گلی میں اکڑ اکڑ کر چل پھر رہے تھے۔ ہر آدمی نے پیٹ بھر کر پلاؤ کھانے کے لالچ میں صبح کا ناشتہ بڑا ہلکا کیا تھا۔ اور اب خوب بھوک لگ رہی تھی کیونکہ برات پہلے ہی دیر سے پہنچی تھی اور ابھی نکاح کی رسم ادا ہونی تھی جو براتیوں کے لئے دردِ سر سے کم نہیں ہوتی۔ خالد کے تو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

وہ دولہا والی گاڑی سے باہر نکلا تو شیخ فقیر دین، اکبر اور اسلم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خالد کی مرغ ایسی گردن تن گئی۔ اور چیچک رو چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں عطر میں بسا ہوا ریشمی رومال تھا۔ کلائی پر سنہری گھڑی بندھی تھی۔ نیا جوتا چلنے میں آواز دے رہا تھا۔ بال تازہ تازہ کٹے تھے۔ جس کی وجہ سے گردن مزید پتلی ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چوہیا ایسی آنکھوں میں فتح مندی اور غرور کے ساتھ ساتھ ہی کمینگی کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا اور اس کے خوب رگڑ کر مانجھے ہوئے دانت ایسے بے جان اور پھیکے لگ رہے تھے گویا مردے کے منہ میں کافور بھرا ہوا ہو۔ وہ اپنے رشتہ داروں، بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ نشست گاہ میں جا کر قالین پر بیٹھ گیا یہ قالین اکبر نے اپنے سسرال سے منگوایا تھا۔ کبھی اسی کمرے میں فرخندہ نے اسے دھتکارا تھا آج وہ کمرے میں فرخندہ کا مالک بن کر بیٹھا تھا۔ وہ ٹانگیں جوڑ کر تکئیے پر کہنی رکھ کر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اپنے نئے گرم سوٹ کے بٹن سہلانے لگا۔ چھت کے اوپر عورتوں کے ادھر ادھر آنے جانے سے قدموں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ خالد نے سوچا کہ اوپر فرخندہ خوشبوؤں، ریشمی کپڑوں اور زیوروں میں لدی پھندی بیٹھی ہو گی۔ اس خیال کے ساتھ اس کا ذہن اسے انتہائی فحش قسم کے عریاں مناظر دکھلانے لگا۔

اوپر فرخندہ اپنی رشتہ دار عورتوں اور سہیلیوں کے درمیان بے جان بت بنی بیٹھی تھی۔ ایک ایسا بت جسے کسی تہوار کے موقعہ پر عطریات، پھولوں، زیورات اور قیمتی گوٹہ لگے سرخ کپڑوں سے لاد دیا گیا ہو۔ جس کے ارد گرد لوگ خوشی سے رقص کر رہے ہوں لیکن جسے

ان کا احساس تک نہ ہو۔ اگر فرخندہ کی سرمہ لگی آنکھوں سے آنسو نہ بہہ رہے ہوتے تو کسی کو اس کی زندگی کا ثبوت نہیں مل سکتا تھا۔ مگر ایسے موقعہ پر تو ہر دلہن کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔

"اری کل جب سسرال سے آئے گی تو چہرہ پھول کی طرح کھل رہا ہوگا"۔

اس پر سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انجم نے فرخندہ کا بازو آہستہ سے دبایا۔ جیسے اسے کہہ رہی ہو کہ وہ ان لڑکیوں کی بات کا برا نہ مانے۔ انہیں بھلا کیا خبر فرخندہ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

براتیوں کے لئے گلی والے دو ایک مکانوں کے دیوان خانے کھلوائے گئے تھے۔ جہاں وہ بیٹھے بیزاری سے جمائیاں لے رہے تھے اور بار بار دبی زبان میں دریافت کر لیتے۔

"نکاح میں کتنی دیر ہے"؟

نکاح کی رسم ادا ہو گئی تو روٹی کھول دی گئی۔ پلاؤ' زردے' فرنی' شوربے کے بھرے ہوئے طشت کے طشت ہاتھوں ہاتھ بیاہ والے گھر سے نکلنے شروع ہو گئے۔ چاروں طرف ایک شور مچ گیا۔ کوئی پانی کے لئے چلانے لگا۔ کوئی خالی طشت مانگنے لگا۔ کسی نے فالتو دستر خوان کے لئے آواز لگائی۔ براتی بھوکے جانوروں کی طرح مرغن اور خوشبودار کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ جیسے ہی قاب ان کے آگے رکھا جاتا وہ شوربے کا پیالہ اس میں انڈیلتے اور بڑے بڑے نوالے اٹھا کر منہ میں ڈالنا شروع کر دیتے۔ ان لوگوں نے دیکھتے ہی دیکھتے قاب چٹ کر دیئے اور "چاول دیجئے"۔ "چاول دیجئے" کی چیخ و پکار مچا دی۔ بے تکلف لوگ ایک دوسرے کی رکابیوں سے بوٹیاں اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ کچھ لوگوں نے زردہ اور شوربہ بھی مزید منگوا لیا جو ایسے موقعوں پر عام طور پر دوبارہ نہیں دیا جاتا۔

انہوں نے اتنا کھایا کہ ناک تک ڈٹ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر یہ لوگ اپھرے ہوئے بیلوں کی طرح پیٹ پر ہاتھ پھیرتے۔ ڈکاریں بھرتے پسینے میں تربتر سوجے ہوئے چہرے لئے کھڑے دیوار کا سہارا لے کر جوتے پہننے لگے۔ کیونکہ انہوں نے اتنا کھا لیا تھا کہ ان سے جھکا نہیں جاتا تھا۔ گلی میں آ کر انہوں نے حمام کے گرم پانی سے ہاتھ دھوئے۔ خوب زور لگا لگا کر ناکیں صاف کیں۔ تولئے سے منہ سر پونچھے۔ اور کچھ تو بکائن کے پیڑ تلے آرام کرسیوں پر لیٹ کر دانتوں میں خلال کرنے اور مخمور آنکھیں بند کر کے نیند کے اولیں جھکولے

لینے لگے اور کچھ لوگ بازار میں پنواڑی کی دکان پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے گندا مذاق کرنے اور سونف ڈلوا ڈلوا کر پان کھانے لگے۔ ایسے لوگ جو صرف پیٹ بھر کر پلاؤ کھانے کے لئے اپنے کئی ایک ضروری کام چھوڑ کر آئے تھے' جلدی جلدی تانگوں میں سوار ہو کر رفو چکر ہو گئے۔ ایک آدھ گھنٹہ آرام کرسیوں پر قیلولہ کرنے کے بعد باقی لوگ بھی تتر بتر ہو گئے۔ وہاں اب صرف دولہا کے قریبی دوست اور رشتہ دار ہی رہ گئے۔ جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو دولہا کے ٹھیکیدار باپ نے بڑے ادب سے برات کی رخصتی کی درخواست کی۔ اس سے پہلے اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی نوٹ بک میں جہیز کی ایک ایک شئے نوٹ کر لی تھی۔ دولہا کی کار مکان کے دروازے کے ساتھ لا کر کھڑی کر دی گئی۔ اوپر سر بہ سر ایک ریشمی چادر تان دی گئی۔ دلہن کو اس کے بھائی اور بہن سہارا دے کر نیچے لائے۔ گہنوں اور ریشمی کپڑوں کی یہ گٹھڑی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ دروازے کے پاس دلہا یعنی چیچک رو بدفطرت خالد کھڑا تھا۔ اس جواری کی طرح جو ہارے ہوئے فریق مخالف سے جوئے میں جیتی ہوئی رقم وصول کر رہا ہو۔ جب وہ فرخندہ کے بازو کو ہاتھ سے تھامنے لگا تو وہ اس خیال سے خوفزدہ ہو گیا کہیں فرخندہ اس کا ہاتھ جھٹک نہ دے۔ کیونکہ کمینہ خصلت آدمی کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا۔ اسے کسی وقت بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے بنائے ہوئے محل کے دھڑام سے گر جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ لیکن فرخندہ تو مر چکی تھی۔ وہاں تو اب محض ایک بے جان دلہن کی لاش تھی جسے اس کے بہن بھائی اٹھا کر کار میں سوار کرنے لا رہے تھے۔ اس لاش سے لگ کر گھر کے ہر فرد نے آنسو بہائے۔ شیخ صاحب نے روتے ہوئے ناک سے سوں سوں کرتے بیٹی کی لاش کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے کار میں بٹھلا دیا۔ خالد اپنی چھوٹی سی چھاتی کو پھلا کر کار کی دوسری طرف ہو کر آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس کے ٹھیکیدار باپ نے تانبے کے پیسوں کی دو تین مٹھیاں کار کے اوپر سے ہوا میں اچھال دیں۔ ان میں وہ کھوٹے پیسے بھی تھے جنہیں ٹھیکیدار صاحب اپنی عادت کے مطابق ایک صندوقچی میں کئی سالوں سے جمع کرتے آئے تھے۔ فرخندہ کی برات چلی گئی۔ اپنے ماں باپ بہن بھائیوں اور سہیلیوں کو روتا چھوڑ کر دلہن اپنے نئے گھر کو رخصت ہو گئی۔ جہاں خوشیوں اور قہقہوں کے ایک مختصر سے دور کے بعد آنسوؤں' آہوں اور مصائب کا ایک نیا باب کھلنے والا تھا' جہاں بلائیں لینے والی ساس بعد میں ایک بلا بن کر دلہن کے سر پر سوار ہونے کو موجود

تھی۔ جہاں دلہن کی راہ میں آنکھیں بچھانے والی نندوں نے اسے ایک روز بات بات پر پھٹکارنا تھا۔ کوسنا تھا۔ اس کی کنوار پنے کی زندگی کے عیوب کو کرید کرید کر ڈھونڈنا اور اسے طعنے دینے تھے' آج وہ کہہ رہی تھی۔

"ہائے میں واری جاؤں اپنی گڑیا ایسی بھابی پر ----- بھئی پرے ہٹو ناں ---- بھابی کا دم گھٹا جا رہا ہے"۔

اور کل یہی نندیں کہیں گی۔

"ہم جانتی ہیں تم کیا کیا گل کھلا چکی ہو۔ ہمارے منہ نہ کھلواؤ بھابی۔ اور پھر تم لے کر کیا آئی تھیں؟ یہی دو کرسیاں اور چار انگوٹھیاں۔ اس سے زیادہ تو ہم لے کر گئے تھے ----"

یہ وقت کی شعبدہ بازی ہے۔ گزرتے لمحات کی کرشمہ سازی ہے۔ مہ و سال کی ستم ظریفی ہے۔ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا چکر ہے۔ اسی گردش نے دنیا کی تخلیق کی ہے۔ اسی چکر نے اس دنیا پر انسان کو جنم دیا ہے۔ اسے ایک سماجی جانور بنایا ہے۔ قربتیں بنائی ہیں۔ فاصلے پیدا کئے ہیں۔ محبت تخلیق کی ہے۔ نفرت کو جنم دیا ہے۔ بچپن کو جوانی' جوانی کو بڑھاپے اور بڑھاپے کو موت میں تبدیل کیا ہے۔ یہ اپنے محور کے گرد گھومتا ہوا زمین کا پہیہ دنیا کی ہر شے کو اپنے گرد گھما رہا ہے۔ اسی کے شور' گھڑگھڑاہٹ اور کہرام سے دنیا کے شور و شر کی چنگاریاں پھوٹی ہیں۔ یہ آج ہمارے دل میں جس کے لئے محبت ڈالتا ہے۔ کل اسی کے خلاف زہر بھرنے لگتا ہے۔ یہ آج جس کے قدموں پر ہم سے سجدہ کرواتا ہے۔ کل اسی کو ہلاک کرانے کے لئے ہمارے ہاتھ میں خنجر دے کر اس کی طرف روانہ کرتا ہے۔ جسے ہم پیار سے گلے لگاتے ہیں پھر اسی کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں۔ لیکن جب انسان اس گردش سے' اس چکر سے اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے تو وہ نفرت کرنا' ہلاک کرنا تباہ کرنا بھول جاتا ہے۔ اس کے پاؤں بڑی نرمی سے زمین پر پڑتے ہیں۔ ہاتھ صرف محبت کا سندیسہ دینے کے لئے فضا میں اٹھتے ہیں۔ وہ جس ہوا میں سانس لیتا ہے وہ کستوری بن کر ہرن کے نافے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ ہوا سانس بن کر اس کے اندر داخل ہوتی ہے اور خوشبو بن کر باہر نکلتی ہے۔ اس کی مٹی سونا' اس کا سونا پارس ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو موتی بن کر صدف کے پیٹ میں چھپ جاتا ہے۔ جہاں وہ بولتا ہے وہاں ہر شے ہمہ تن گوش ہوتی ہے جہاں وہ سوتا ہے وہاں ہر چیز جاگ رہی ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنا جھوٹا پانی پھینکتا ہے وہاں جنگلی

گلاب کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔ جہاں سے وہ گزر جاتا ہے وہاں کی ہر شے امر ہو جاتی ہے۔ غیر فانی ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں سوائے پریم' ممتا اور محبت کے اور کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

لیکن ابھی تو فرخندہ کی ڈولی گزر رہی ہے۔ سرکلر روڈ سے ہو کر سمن آباد کی طرف جا رہی ہے۔ گلی میں اوندھی پڑی دیگیں۔ ٹوٹے پھوٹے چولہے' گرے پڑے مسلے ہوئے پھولوں کے ہار اور چینی کی ٹوٹی ہوئی رکابیاں ہیں۔ مکان کے اندر شیخ صاحب اکبر کے ساتھ پلنگ پر بیٹھے کرائے کے برتنوں کی فہرست مکمل کر رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کیا گم ہو گیا؟ کیا شے کھو گئی؟ کیا پا لیا؟ بوڑھا مضمحل دنیادار سر جھکا ہوا ہے۔ ہونٹ ایک طرف کو کھنچ گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے لڑکی وداع ہو گئی ہے۔ اب وہ جانے اس کا خاوند جانے۔ روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے۔ وار چینی مہنگی کرنی پڑے گی۔ چلو یہ بلا تو سر سے ٹل گئی۔ دن بھر کے غل غپاڑے سے اکبر کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ لیکن دماغ پوری طرح ہوشیار ہے۔ مشین کی طرح کھٹ کھٹ باپ کو ایک ایک چیز کا حساب لکھوا رہا ہے۔ کیا مجال جو ذرا سی غلطی کھا جائے۔ بھابی عذرا دوسری بار زردے اور پلاؤ کا پتنوس بھروا کر اپنے میکے بھجوا رہی ہے۔ بچے ہوئے چاولوں کے تھال بھر بھر کر نعمت خانے اور الماریوں میں رکھے جا رہے ہیں۔ سب عورتیں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی ہیں۔ ایک مزدور غسل خانے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر میں بیٹھا گرم پانی سے انہیں صاف کر رہا ہے۔ اسلم بجلی کے مستری کے ساتھ مل کر درختوں کی ٹہنیوں پر ڈالی ہوئی رنگ برنگے قمقموں کی لڑیاں اتروا رہا ہے۔ پھر گہری رات کا سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف ٹھٹھرتی رات کی ویران خاموشی طاری ہو گئی۔ ریلوے یارڈ کی جانب شنٹ کرتے انجنوں کی سسکار زیادہ صاف ہو گئی۔ پکانے والے دیگیں اٹھا لے گئے۔ قناتیں لپیٹ کر آنگن میں ڈال دی گئیں۔ تھکی ماندی عورتیں بے سدھ ہو کر بستروں میں پڑ گئیں۔ شیخ فقیر دین حساب کتاب سے' سوچ بچار سے تھک کر لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ شادباغ کے کھیتوں اور وسن پورے کے مکانوں پر اوس پڑنے لگی۔ گھروں کے کواڑ اندر سے بند کر لئے گئے۔ چوکیداروں کی کمبل میں لپٹی ہوئی آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتیں۔

فرخندہ کے گھر والی گلی میں گہرا کہر زدہ سکوت چھا گیا۔ بکائن کے پیڑ اپنی اوس میں بھیگی ٹہنیاں جھکا کر سو گئے۔ گلی کے کچے فرش پر تاروں کی دھیمی روشنی میں چولہوں کی بکھری ہوئی راکھ برص کے داغ معلوم ہونے لگی۔ ایک کتا اپنی مردہ ٹانگ گھسیٹتا آیا اور نالی میں گری پڑی

ہڈیاں باہر نکال کر چبانے لگا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ گلی کے اندھیرے میں ایک دبلا پتلا جھکا جھکا بھوت نما سایہ اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کتا ہڈی منہ میں دبا کر آگے کو رینگ گیا۔

دبلا پتلا بھوت نما سایہ قدم قدم چلتا بکائن کے درختوں کے پاس آ کر رک گیا۔ یہ ہمارے خستہ حال' شکستہ دل' ماسٹر جی تھے۔ پوری آستینوں والا میلا کچیلا فوجی سویٹر بدن پر تھا۔ گلے میں گندا گلوبند تھا۔ نمدہ بنا بوسیدہ اوورکوٹ کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ چہرہ پریشان تھا۔ سفید بال بکھرے ہوئے' اڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت اور سراسیمگی تھی۔ ان کو دیکھ کر اس بے زبان ہرن کا خیال آتا تھا جسے درندہ صفت گیدڑوں نے ادھیڑ ڈالا ہو اور جوان کے چنگل سے بچ کر دہشت زدہ' لہولہان ویران گلیوں میں پناہ لینے آن نکلا ہو۔ ماسٹر نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بکائن کے تنے پر پھیرا۔ انگلیوں پر ایک سے گیارہ تک گنتی کی۔ سوکھا ساکھا پژمردہ چہرہ اوپر اٹھا کر مکان کی بند کھڑکیوں اور بجھے ہوئے روشندانوں کو دیکھا جس طرح لوگ آخری بار لاش کا منہ دیکھتے ہیں۔ ایک گہرا سانس لیا اور قدم قدم آگے چل پڑے۔ جیسے کسی گلابی رخساروں اور سانولی آنکھوں والے اداس چہرے نے کھڑکی کا پٹ کھول کر آواز دی۔

"ماسٹر جی! یہ کیا ہو گیا آپ کو؟"

ماسٹر جی ٹھٹک گئے۔ ان کی انگلیاں دیوانوں کی طرح سینے پر چلنے لگیں۔ یہ کس کی آواز تھی؟ کہاں کیا ہو گیا؟ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی تو بدنصیبی و بدحالی کی پو پھٹی ہے۔ ابھی تو سورج کے ایک کنارے ہی کو گہن لگا ہے۔ ابھی تو دربدری' بے پروبالی اور دیوانگی کی پوری زندگی باقی پڑی ہے۔ ابھی لوگوں کے آوازے سننے ہیں۔ ابھی بچوں کے پتھر کھانے ہیں۔ ابھی راتیں گندے نالے میں بسر کرنی ہیں۔ ابھی دن خاک اڑاتی طویل سڑکوں پر انگلیوں پر کسی کا نام ورد کرتے گزرنے ہیں۔ ابھی تو کپڑوں کے چیتھڑے اڑنے باقی ہیں۔ ابھی تو پھانسی کے تختے تک کا ایک طویل سفر باقی ہے۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ماسٹر جی نے انگلی فضا میں اٹھا کر اس طرح گھمائی جیسے دائرہ بنا رہے ہوں۔ اترے ہوئے اندر کو دھنسے ہوئے چہرے پر زہر میں بجھے ہوئے عاجزانہ تبسم کی ایک گہری لکیر نمودار ہوئی اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ قدم چلتے' راہ میں پڑی ہوئی چولہے کی اینٹوں کی ٹھوکریں کھاتے گلی میں سے گزرنے لگے۔ کونے میں دبکے ہوئے لنگڑے کتے نے سہمی ہوئی آنکھوں سے ماسٹر جی کی طرف دیکھا

اور پھر ہڈی چبانے میں مصروف ہو گیا۔ ماسٹر جی کا سر ڈھلکا ہوا تھا۔ کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ سردی میں ٹھٹھر رہے تھے اور پھٹا ہوا بوریا نما لمبا کوٹ کندھے پر ڈالے اسے ایک ہاتھ سے تھامے یوں گلی میں سے گزر رہے تھے۔ جس طرح مصلوب ہونے والے لوگ اپنی صلیبیں اٹھائے روم کے بازاروں میں سے گزرا کرتے تھے۔